موجِ کوثر

اکرام

With Author's Compliments

موجِ کوثر

یعنی

ہندوستانی مسلمانوں کی مذہبی اور علمی تاریخ

دورِ جدید

انیسویں صدی عیسوی کے آغاز سے موجودہ زمانے تک

از

شیخ محمد اکرام ایم۔ اے مصنف "آبِ کوثر"

۱۹۴۰ء

اشاعتِ اوّل ایک ہزار

قیمت ۸/

مرکنٹائل پریس لاہور میں شیخ محمود احمد نظامی پرنٹر و پبلشر نے چھپوا کر لاہور سے شائع کیا

فہرستِ مضامین

صحت نامہ "موجِ کوثر"

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۳	۱	سنہ ۱۲۰۵ھ	سنہ ۱۲۰۱ھ
۶	۵	چستیہ	چشتیہ
۶	حاشیہ	حجتہ البالغہ	حجتہ اللہ البالغہ
۹	۳	جوردیں	جوروئیں
۱۰	۱۲	گورنر ممالک شمالی ومغربی کو لیفٹیننٹ	لیفٹیننٹ گورنر ممالک شمالی و مغربی کو
۱۹	۶	ناقونوی	نانونوی
۲۶	۱۳	عقل سمجھ	عام سمجھ
۳۴	۱۴	لمولٰنا گل حسن	مولٰنا گل حسن صاحب نے ان ارشادات کو "تذکرۂ غوثیہ" میں جمع کیا ہے ۔ اور شاہ صاحب کی گوناگوں خوبیوں اور مولٰینا گل حسن
۴۴	۱۹	باندھی	باندھنی
۶۳	۱۲	تو ہم یہی کہیں گے	تو یہی خیال ہوتا ہے
۱۵۱	۱۶	بمقام مکہ معظمہ	میں بمقام مکہ معظمہ
۱۵۵	۹	ادب	آداب
۱۸۶	حاشیہ سطر ۴	کھنے	رکھنے
۲۱۹	۴	لایخلف المعیاد	لایخلف المیعاد

تحریکِ اصلاح

تحریکِ اصلاح

تیرھویں صدی ہجری جس کے پہلے دن یعنی یکم محرم الحرام ۱۲۰۵ھ (مطابق ۲۴ر اکتوبر ۱۷۸۶ء) کو مولانا سید احمد قصبہ رائے بریلی ممالک اودھ میں پیدا ہوئے۔ ہندوستانی مسلمانوں کے لئے اہم کشمکش کا زمانہ تھا۔ اُن کے سیاسی تنزل کی تکمیل اسی صدی میں ہوئی۔ لیکن اُن کے مذہبی احیا اور معاشرتی اصلاح کے آغاز کا زمانہ بھی یہی تھا۔ ہندوستان کا اکثر حصّہ اب ہندوستان کے مسلمانوں کے ہاتھ سے نکل چکا تھا اور کئی معاشرتی اور مذہبی خامیاں جن پر اسلامی حکومت کے زمانے میں پردہ پڑا ہوا تھا۔ اب زیادہ بے نقاب ہوگئیں۔ اس زمانے میں جو کتابیں لکھی گئیں۔ اُن کے مطالعہ سے یہ خیال پیدا ہوتا ہے۔ کہ اگرچہ شاہ ولی اللہ اور دوسرے بزرگوں کی کوششوں سے باعلم طبقوں میں اسلام کی زیادہ صحیح واقفیت ہوتی جا رہی تھی۔ لیکن عوام کی مذہبی حالت نہایت گری ہوئی تھی۔ انہوں نے ہندو مذہب چھوڑ کر اسلام اختیار تو کر لیا تھا۔ لیکن اس سے اُن کی روحانی حالت میں کوئی اہم تبدیلی نہ ہوئی تھی۔ پہلے وہ مندروں اور دھرم سالوں میں بتوں اور مورتیوں کے سامنے ماتھے ٹیکتے تھے۔ تو اب مسلمان پیروں کی قبروں کے سامنے سجدے کرتے اور اپنی مرادیں مانگتے تھے۔ ہندو گروؤں اور برہمنوں کی جگہ مسلمان پیروں نے لے لی تھی۔ جن کے نزدیک انسان کی روحانی تربیت کے لئے احکامِ اسلام کی پابندی۔ نیک اعمال اور سنتِ رسولِ اکرمؐ کی پیروی ضروری نہ تھی۔ بلکہ یہی مدعا مراقبوں، وظیفوں اور مُرشد کی توجہ سے حاصل ہو جاتا تھا۔ تعویذوں اور گنڈوں کا بہت زور تھا۔ بیماریاں دور کرنے یا دوسرے مقاصد کے لئے سب سے زیادہ کوشش تعویذوں کی تلاش میں کی جاتی جنہیں ہندو جوگی اور مسلمان پیر کاغذ پر مختلف لکیریں ڈال کر خوش اعتقادوں کو دیتے اور جو انہیں حصولِ مقصد کے صحیح اسلامی طریقوں سے باز رکھتے۔ جادو جو اسلام نے حرام قرار دیا تھا۔ تصوّف کے ذریعے معمولی ظاہری تبدیلی کے ساتھ اسلام میں داخل ہو گیا تھا۔ معاشرتی رسموں میں بھی مسلمانوں اور ہندوؤں میں کوئی فرق نہ تھا۔

اسلام کی تعلیم یہ تھی کہ خدا کے سوا کسی سے نہ ڈرو۔ لیکن اب بھوت پریت کے ڈر اور دوسرے وہموں سے روحانی زندگی کا سکون تلف ہو رہا تھا۔ ہندوؤں میں نکاح بیوگان پاپ سمجھا جاتا تھا مسلمانوں میں بھی نکاح ثانی بُرا سمجھا جانے لگا۔ بیاہ شادی اور تجہیز و تکفین کے متعلق اسلامی احکام نہایت سادہ معقول اور دینی دو نیاوی بھلائی پر مبنی تھے۔ لیکن مقامی اثرات سے اُنکی جگہ ایسی خلافِ شرع رسموں نے لے لی تھی۔ جن میں فضول خرچی تضیعِ اوقات اور دوسری بیسیوں قباحتیں تھیں*

شاہ عبدالعزیز اور دوسرے بزرگ اس مذہبی زبوں حالی سے واقف تھے۔ لیکن ان کی اصلاحی کوششوں میں ان کی طبعی میانہ روی نمایاں تھی۔ اور اب مرض اس قدر عام اور پُرانا ہو گیا تھا۔ کہ اس کے ازالے کے لئے معمولی عرق سونف اور نمک سلیمانی کافی نہ تھے۔ بلکہ کسی بہت تیز اور کڑوی دوا کی ضرورت تھی۔ یہ معالجہ مولٰنا سید احمد بریلوی نے تجویز کیا۔ ظاہر ہے کہ صدیوں کے مرض مہینوں یا سالوں میں دور نہیں ہو جاتے لیکن اُن کے علاج سے مریض کی حالت بہتر ہو گئی۔ اور دن بدن بہتر ہو رہی ہے*

مولٰنا سید احمد بریلویؒ

مولٰنا سید احمد بریلوی کی ابتدائی زندگی کے زیادہ حالات نہیں ملتے۔ لیکن اتنا معلوم ہے کہ ایامِ طفلی میں تحصیلِ علم سے آپ کو کچھ رغبت نہ تھی۔ اور مکتب میں تین سال گزارنے کے بعد بھی قرآن مجید کی چند سورتوں کے سوا آپ کو کچھ یاد نہ ہوا۔ جب آپ بڑے ہوئے تو چھ ساتھیوں کے ساتھ تلاشِ روزگار میں رائے بریلی سے نکلے اور لکھنؤ چلے گئے۔ وہاں آپ نے کچھ عرصہ ایک امیر کے پاس کام کیا۔ اُس کے بعد آپ کو خود بخود تحصیلِ علم کا شوق پیدا ہوا اور شاہ عبدالعزیزؒ صاحب سے علمِ دین حاصل کرنے کی خاطر دہلی تشریف لائے۔ شاہ صاحب نے آپکو اکبرآبادی مسجد میں اپنے بھائی شاہ عبدالقادر صاحب کے پاس بھیجا۔ وہاں آپ نے کچھ عرصہ صرف و نحو پڑھی۔ قرآن مجید کا اردو ترجمہ بھی مطالعہ کیا۔ لیکن لکھنے پڑھنے میں کچھ نمایاں ترقی نہ کی۔ شاہ عبدالعزیز صاحب سے سلسلۂ نقشبندیہ میں آپ نے ۱۲۲۲ھ یعنی بائیس سال کی عمر میں بیعت کی اور اس کے کچھ عرصہ بعد بریلی واپس چلے گئے۔ وہاں قریباً دو سال قیام کیا۔ ۱۸۱۰ء کے قریب آپ نواب امیر خان کے پاس جو بعد میں والی ٹونک ہوئے سوار بھرتی ہو گئے۔ اور قریباً چھ سات سال فنِ سپاہگری میں بسر کئے*

۱۸۱۶ء کے قریب آپ دوبارہ دہلی تشریف لے گئے۔ یہاں ہدایت وارشاد کا سلسلہ شروع کیا۔ انہی دنوں مولانا عبدالحی نے جو شاہ عبدالعزیز صاحب کے داماد تھے۔ آپ سے بیعت کی اور پھر ان کے بعد مولوی محمد اسمٰعیل جو شاہ صاحب کے بھانجے اور شاہ ولی اللہ کے نواسے تھے۔ سید صاحب کے مرید ہوئے۔ ان دونوں بزرگوں کی بیعت سے سید صاحب کو بڑی تقویت ہوئی؛

کچھ عرصہ بعد آپ انکو ساتھ لے کر وعظ وہدایت کے لئے ہیروبنجات میں تشریف لے گئے۔ مظفر نگر، سہارنپور رامپور، بریلی، شاہجہانپور، بنارس اور لکھنؤ جابجا آپ نے دورہ کیا۔ اور خلائق کو راہ ہدایت پر لائے۔ بریلی میں آپ نے نکاحِ بیوگاں کی سب سے پہلی مثال خود قائم کی۔ اور بڑی مشکل سے اپنے گھر کے لوگوں کو راضی کر کے جو اس امرِ مسنون کو زوالت سمجھتے تھے۔ ایک بیوہ سیدزادی سے شادی کی؛

وعظ وتبلیغ میں مولانا کو وہ ملکہ حاصل نہ تھا۔ جو مولوی محمد اسمٰعیل شہید کو تھا لیکن پھر بھی انکی بات میں بڑی تاثیر تھی۔ انکی اپنی وضع قطع سیدھی سادھی اور ہر قول تکلف اور تصنع سے خالی ہوتا تھا۔ کلام میں سیدھی سادھی مثالیں ہوتی تھیں جنہیں سامعین آسانی سے سمجھ لیتے طبیعت میں خلوص تھا۔ ایثار اور خیرخواہی خلق رگ وپے میں سمائی ہوئی تھی۔ نتیجہ یہ تھا کہ جو لفظ زبان سے نکلتا۔ سامعین کے دلوں میں تیر کی طرح پیوست ہوجاتا؛

انہی دنوں مولانا اسمٰعیل شہید نے آپ کے اقوال و ارشادات کو فارسی میں منضبط کیا اور کتاب کا نام "صراطِ مستقیم" رکھا۔ اس کتاب سے ظاہر ہوتا ہے۔ کہ اس زمانے میں آپ نے طریقت اور شریعت کے باہمی اتصال کی کوشش کی۔ آپ جابجا معرفت الٰہی اور طریق سلوک کے شرعی اسلوب پر زور دیتے تھے۔ بیعت کا طریقہ بھی اپنے پیش روؤں سے مختلف تھا۔ آپ کا دستور تھا کہ پہلے طریقۂ چشتیہ قادریہ۔ نقشبندیہ۔ مجددیہ میں بہ آواز بلند بیعت لے کر پھر طریقۂ محمدیہ میں بیعت لیتے تھے اور عوام اور علماء آپ کے طریق کو طریقۂ محمدیہ ہی کہ کر پکارتے تھے۔ آپ نے اپنے "طریقۂ محمدیہ" کی تشریح نائب والیٔ رامپور کے بھائی سے اس طرح کی۔ کہ تصوف کے چار طریقوں کا تعلق رسولِ کریمؐ سے بطور باطن کے ہے اور "طریقۂ محمدیہ" کا بطور ظاہر کے۔ اس لئے ظاہری اعمال "طریقۂ محمدیہ" یعنی شریعت کے مطابق ہونے چاہئیں؛

صراطِ مستقیم | "صراطِ مستقیم" ایک مقدمہ اور چار ابواب پر مشتمل ہے۔ پہلا اور چوتھا

باب مولٰنا اسمٰعیل نے ترتیب دیا تھا۔ پہلے باب میں طریقِ ولایت اور طریقِ نبوّت کے اختلافات کا ذکر ہے۔ اور چوتھے باب میں طریقِ "سلوکِ راہ نبوّت" یعنی "طریقۂ محمدیہ" کا بیان ہے۔ دوسرا اور تیسرا باب مولٰنا عبدالحی کا لکھا ہوا ہے۔ اور غالباً کتاب کا اہم ترین حصّہ یہی ہے۔ تیسرا باب تصوّف پر ہے۔ جس میں ہندوستان کے مشہور سلسلہ ہائے تصوّف کے اشغال و وظائف کو عام فہم زبان میں جمع کیا ہے۔ اور بتایا ہے۔ کہ چشتیہ۔ قادریہ۔ نقشبندیہ اور مجدّدیہ طریقوں کے بزرگ اپنے مریدوں کو کس طرح تعلیم دیتے تھے اور صفائے قلب اور ترقئ درجات کے لئے انہیں کون سے مراقبے اور عمل سکھاتے تھے۔

اصلاحی نقطۂ نظر سے دوسرا باب کتاب کی جان ہے۔ پہلے حصّے میں ان بدعتوں کا ذکر ہے جو مختلف ذرائع سے مسلمانوں میں داخل ہوگئی تھیں۔ مثلاً وہ بدعتیں جو بہ سبب اختلاطِ ملحدین و مشرکین صوفی شعار متشبہین بہ صوفیۂ کبارؒ عوام اہلِ اسلام میں رائج ہوگئیں۔ یعنی

(۱) شرع کی مخالفت اور کلام ملحدانہ و اشغالِ قبیحۂ شرک آمیز کی اشاعت

(۲) خدا اور رسولؐ کے متعلق کلمات بے ادبانہ کا صدور

(۳) مسئلۂ تقدیر میں غیرضروری قیل وقال اور بحث وجدال کا اظہار

تقدیر کا مسئلہ صرف مسلمانوں ہی میں نہیں بلکہ تمام بڑے مذہبوں میں ایک پیچیدہ معمّا رہا ہے لیکن رسولِؐ اکرم نے جن کے تمام ارشادات عین حکمت ہیں۔ اس مسئلے پر سوچنے اور بحث کرنے کی سخت مخالفت کی تھی۔ اور ارشاد کیا تھا۔ کہ مسلمانوں پر واجب ہے۔ کہ اِس مسئلے میں "ایمانِ اجمال" کو کافی سمجھیں اور اسکی تفصیل و تنقیح کے اتھاہ سمندر میں نہ کھو جائیں۔ ع

کہ کس نکشود و نکشاید بہ حکمت ایں معمّا را

رسولِؐ اکرم نے بے ضرورت بحثوں کی اہمیت کو کبھی نہیں مانا۔ اُن کا فرمان بہت واضح ہے۔ "تفکروا فی خلق اللہ ولا تفکروا فی اللہ"[۱] (یعنی پروردگار کی ذات کے متعلق غور و فکر نہ کرو۔

---

[۱] حجۃ البالغہ

خدا کی مخلوقات پر غور و فکر کرو:-

رسولِ اکرم کا فرمان تھا کہ خدا کی ہستی - خدا کی قدرت یا اسی طرح کے دوسرے پیچیدہ مسائل لاینحل پر غور و فکر کرنے میں کوئی مصلحت نہیں - کیونکہ ان مسائل کی ماہیت ہی ایسی ہے - کہ ان میں منطق اور دلائل کی مدد سے انسان کسی یقینی نتیجے پر نہیں پہنچ سکتا - اِن مسائل میں "ایمان بالغیب" ہی عقل اور سمجھ کا راستہ ہے - ہاں "آیاتِ الٰہی" خدا کی مخلوقات اور ٹھوس باتوں میں غور و خوض اور تلاش و تحقیق کرنی چاہیئے - تاکہ انسان خدا کی پیدا کردہ چیزوں کی خوبیوں سے واقف ہو - اُن سے مستفید ہو - اور ان کے پیدا کرنے والے کا شکریہ ادا کرے -

رسولِ اکرم کا ارشاد انتہائی عقل اور مصلحت پر مبنی ہے لیکن بعض لوگ فطرتاً "شکی" اور کمزور دل ہوتے ہیں - اُن کی طبیعت "علم الاشیا" یعنی ان باتوں میں نہیں لگتی - جن میں تلاش و تحقیق سے نہ صرف وہ خود فائدہ اٹھا سکتے ہیں بلکہ تمام انسان مستفید ہو سکتے ہیں - اُن کا سارا زورِ دماغ اِن خیالی قلابازیوں پر صرف ہوتا ہے - جن سے اول تو کچھ حاصل نہیں ہوتا - اور اگر حاصل ہوتا بھی ہے تو صرف تشکک طبعی بے چینی اور گمراہی ! مسئلہ تقدیر بھی انہی لاحاصل بحثوں میں سے ہے اور مولانا سید احمد صاحب بریلوی نے بھی "صراطِ مستقیم" میں لکھا ہے کہ جو راستہ رسولِ اکرم نے بتایا تھا وہی صحیح الدماغی اور سلامتی کا راستہ ہے -

مذکورہ بالا تین بدعتوں کے علاوہ اور بھی کئی بدعتیں اور قبیح باتیں تھیں - جو تصوف کے ذریعے اسلام میں داخل ہوئیں مثلاً

(۱) مُرشد کی تعظیم میں افراط اور مبالغہ

(۲) قبروں پر جا کر سجدے کرنا اور مُرادیں مانگنا

(۳) اولیاء اللہ کی نذر و نیاز جس میں فضول خرچی کا عیب بھی پایا جاتا ہے

یہ سب قباحتیں دوسرے باب کے پہلے حصے میں بیان کی ہیں - دوسرے حصے میں ان بدعتوں کا بیان ہے - جو اہلِ سنت نے شیعوں سے اخذ کر لی ہیں - مثلاً عزاداری اور تعزیہ سازی یا عقیدۂ تفضیل

حضرت علی - تیسرے حصے میں اُن قبیح رسموں کا بیان ہے - جو عوام کی مخالفت اور طعن و تشنیع کے ڈر سے ہندوستان میں رائج ہو گئی ہیں - اور جن سے دینی اور دنیاوی دونوں طرح کا نقصان ہے مثلاً

(۱) بیاہ شادی اور ختنے کے موقعے پر دھوم دھام اور فضول خرچی جس سے ہزاروں خاندان تباہ ہو چکے ہیں

(۲) تجہیز و تکفین کی رسمیں

(۳) چالیسویں پر روٹی کی تقسیم

(۴) ممانعتِ نکاح بیوگاں - جس سے نہ صرف ان بے چاریوں کی زندگی تباہ ہوتی ہے - بلکہ خرابیٔ اخلاق کا بھی امکان ہے

مولانا سید احمد بریلوی نے ہندوستان کے مسلمانوں کی مذہبی اور معاشرتی خرابیوں کا بالتفصیل مطالعہ کیا ہے - اور نہ صرف انہوں نے مرض کی صحیح تشخیص کی بلکہ علاج بھی صحیح تجویز کر دیا - اور جس طرح ایک طبیب کامل مرض کے مختلف آثار دیکھ کر ہر خرابی کے لئے مختلف نسخہ نہیں تجویز کرتا بلکہ ایک ایسی دوا تجویز کرتا ہے جو مرض کو جڑ سے دور کر دے - اسی طرح مولانا نے بھی قوم کی خرابیوں کے لئے ایک اصولی نسخہ تجویز کیا - چونکہ یہ تمام خرابیاں جو مختلف قسموں کی تھیں اور مختلف رستوں سے داخل ہوئی تھیں - حقیقتاً اس وجہ سے پیدا ہوئیں - کہ مسلمانوں نے رسولِ اکرمؐ کی سنت کو ہاتھ سے چھوڑ دیا تھا - اِس لئے قوم کی نجات اس میں تھی کہ ہر وہ رسم جو سنتِ نبوی اور طریقِ صحابہ کے خلاف ہو یا بعد میں جاری ہوئی ہو - ترک کی جائے - سید صاحب کا ارشاد ہے - " تمامی رسوم ہند و سندھ و فارس و روم را کہ خلاف محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم باشد یا زیادتی از طریقۂ صحابہ شود ترک نماید و انکار و کراہت برآں اظہار کند - "

حج - جہاد - شہادت

جب مولانا سید احمد بریلوی وعظ و ہدایت کے سلسلے میں رام پور تشریف لے گئے تو وہاں کئی ولایتی افغان آئے - اور انہوں نے ایک بڑا درد انگیز قصہ سید صاحب کے رو برو اس طرح بیان کیا - کہ ہم اپنے اثنائے راہِ ملکِ پنجاب میں ایک کوئیں پر پانی پینے کو گئے - ہم نے دیکھا کہ چند سکھنیاں یعنی سکھوں کی عورتیں اس کنوئیں پر پانی بھر رہی تھیں - ہم لوگ دیسی زبان نہیں جانتے تھے - ہم نے اپنے مونہوں

پر ہاتھ رکھکر ان کو اشاروں سے بتایا کہ ہم پیاسے ہیں۔ پانی پلاؤ۔ تب اُن عورتوں نے اِدھر اُدھر دیکھ کر پشتو زبان میں ہم سے کہا کہ ہم مسلمان افغان زادیاں فلانے ملک اور بستی کی رہنے والیاں ہیں اور یہ سکھ لوگ ہم کو زبردستی پکڑ لائے۔ اور سکھنیاں بناکر اپنی جوروئیں کر لیا ہے۔ یہ سُن کر ہم کو بہت رنج ہوا کہ مسلمان عورتیں جبراً اس طرح سے کافر بنائی جاتی ہیں۔ اَے سید صاحب! آپ ولی اللہ ہو۔ کچھ ایسا فکر کرو کہ ان کو اس کفر سے نجات ملے۔ تب سید صاحب نے فرمایا۔ کہ انشاء اللہ تعالیٰ میں عنقریب سکھوں سے جہاد کروں گا۔"

مولانا کو سکھوں سے جہاد کرنے کا خیال غالباً اس دردناک قصے سے پیدا ہوا۔ لیکن جہاد کا کام ایسا نہ تھا کہ جھٹ پٹ انجام کو پہنچ جاتا۔ اس لئے آپ وعظ و ہدایت میں مشغول رہے۔ اور اس کے بعد آپ نے فیصلہ کیا کہ پہلے فریضۂ حج کو ادا کر لیں اور اس کے بعد سکھوں سے جہاد کریں۔ چنانچہ انہوں نے اپنے مریدوں کو اطلاع دی اور یکم شوال ۱۲۳۶ھ ہجری (۱۸۲۰ء) کو بروز عید الفطر بعد ادائے نماز عید چار سو مردوں عورتوں اور بچوں کے ساتھ بارادہ حج آپ بریلی سے کلکتہ روانہ ہوئے۔ راستے میں الہ آباد۔ بنارس۔ پٹنہ۔ بھاگلپور ہوتے ہوئے قیام کیا اور ہزارہا آدمیوں کو ہدایت کی۔ آپ تین مہینے کلکتے میں مقیم رہے اور وہاں اپنا سارا وقت اصلاحِ خلق میں صرف کیا۔ آپ کے ایک سوانح نگار[1] لکھتے ہیں "شہر کلکتہ میں بیعت کرنے والوں کی یہ کثرت تھی کہ ہزارہ پانسو آدمیوں کو ایک جگہ جمع کر کے سات آٹھ پگڑیوں کو اس مجمع میں پھیلا کر ہر ایک بیعت کنندہ کو حکم دیتے تھے کہ ایک کنارہ کسی پگڑی کا منجملہ ان پگڑیوں کے پکڑ لیوے۔ پھر آپ پگڑیوں کا ایک کنارہ اپنے ہاتھ میں تھام کر کلماتِ بیعت کو باآواز بلند تلقین کرتے تھے۔ اور یہ کیفیت دن بھر رہتی تھی۔ آپ کے تشریف لانے سے پہلے ہزارہا بے نکاحی عورتیں وہاں کے گھروں میں تھیں اور ہزارہا مسلمان غیر مختون اس شہر میں موجود تھے۔ شراب تو ایک عام بات تھی۔ . . . . اب آپ کی برکت سے وہی کلکتہ رشکِ ارم ہو گیا۔ ہر ایک بیعت کرنے والے سے نکاح اور ختنے کا حال پوچھا جاتا۔ اگر غیر مختون یا بے نکاحی جورو والا ہوتا تو فوراً یہ سنت ادا کر دی جاتی۔ . . . . مولوی عبدالحی صاحب اور مولوی محمد اسمٰعیل

---

[1] سوانح احمدی مصنفہ مولوی محمد جعفر

صاحب شہید ہر منگل اور جمعہ کو ظہر سے شام تک وعظ فرمایا کرتے تھے۔ اور اُن بزرگوں کے وعظ کی یہ تاثیر ہوتی کہ خلقت مثل پروانہ گرویدہ ہوگئی۔ ہر ایک بیعت کنندہ کے شراب نوشی سے تائب ہونے پر شراب کی دکانیں بند ہوگئیں"۔

کلکتے سے آپ بحری راستے سے جدّہ اور مکّہ معظمہ تشریف لے گئے۔ وہاں سے آپ نے ایک مفصّل خط فارسی میں شاہ عبد العزیز صاحب دہلوی کے نام ارسال کیا۔ جس میں سفر کے حالات لکھے تھے۔ آپ نے ۱۲۳۷ھ میں حج کیا۔ مکّہ معظمہ میں کئی مصری اور بلغاری عالم آپ کی بیعت سے مشرف ہوئے۔ اور مولوی عبد الحی صاحب نے "صراطِ مستقیم" کا عربی ترجمہ کر کے شیخ مصطفےٰ امام حنفی مصلےٰ اور شیخ شمس الدین مصری واعظ بیت الحرام کو دیا۔ حجاز میں آپ کا قیام چودہ مہینے رہا۔ اس کے بعد آپ جدّہ سے جہاز میں بمبئی ہوتے ہوئے کلکتہ پہنچے اور وہاں کچھ دیر قیام کر کے دو سال اور گیارہ مہینے کی غیر حاضری کے بعد وطن تشریف لائے۔ وطن پہنچکر آپ نے سکھوں کے خلاف جہاد کی تیاری شروع کی۔ اور مولٰنا اسمٰعیل شہیدؒ اور مولٰنا عبد الحیؒ کو اطراف ہندوستان میں اس مقصد کے لئے تبلیغ کرنے کو بھیجا۔ اس وقت برطانوی ہندوستان میں ہر جگہ ترغیبِ جہاد کا وعظ ہو رہا تھا۔ گورنر ممالک شمالی و مغربی کو لیفٹیننٹ شیخ غلام علی رئیسِ اعظم الہ آباد نے ازراہِ احتیاط جہاد کی تیاری کی باقاعدہ اطلاع بھی دی۔ جس کے جواب میں صاحب ممدوح نے فرمایا کہ "جبتک انگریزی عملداری میں کسی فتنہ و فساد کا اندیشہ نہ ہو۔ ہم ایسی تیاری کے مانع نہیں"۔

جب آپ کی تیاری مکمل ہوگئی تو عام مسلمانوں کو جہاد کے متعلق ایک اطلاع نامہ بھیجا گیا۔ جس کے مطالعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ جہاد سے مولٰناؒ کا مقصد ملک گیری یا کسی دوسری قوم سے بے انصافی نہ تھا۔ بلکہ اس عام مذہبی آزادی کا حصول تھا۔ جو تمام مہذّب ملکوں میں ہر ایک کو حاصل ہے۔ یہ اطلاع نامہ بہ تفصیلِ ذیل تھا[1]:۔

---

[1] ترغیبِ جہاد کی یہ عبارت اُس انگریزی ترجمے کا ترجمہ ہے۔ جو وہابیوں کے مقدمے میں پیش ہوا تھا۔ اصل عبارت ہمیں مل نہیں سکی۔

"سکھ قوم عرصے سے لاہور اور دوسری جگہوں پر قابض ہے۔ اور اُن کے ظلم کی کوئی حد نہیں رہی انہوں نے ہزاروں مسلمانوں کو بلاقصور شہید کیا ہے۔ اور ہزاروں کو ذلیل کیا ہے۔ مسجدوں میں نماز کے لئے اذان دینے کی اجازت نہیں۔ اور ذبیحہ گاؤ کی قطعی ممانعت ہے۔ جب اُن کا ذلت آمیز ظلم و ستم ناقابل برداشت ہوگیا۔ تو حضرت سید احمد ایداللہ بنصرہ نے خالصاً حفاظتِ دین کے لئے کئی مسلمانوں کو کابل اور پشاور کیطرف لے جاکر مسلمانوں کو خوابِ غفلت سے جگایا۔ اور ان کو جرأت دلاکر آمادۂ عمل کیا۔ الحمدللہ کہ انکی دعوت پر کئی ہزار مسلمان راہِ خدا میں لڑنے کو تیار ہوگئے ہیں۔ اور سکھ کفار کے خلاف ۲۱ دسمبر ۱۸۲۶ء کو جہاد شروع ہوگا"۔

مولوی محمد جعفر تھانیسری جنہیں وہابیوں کے مقدمہ سازش میں حبس دوام بعبور دریائے شور کی سزا ہوئی تھی اپنی کتاب سوانح احمدی میں لکھتے ہیں" جب آپ سکھوں سے جہاد کرنے کو تشریف لے جاتے تھے۔ کسی شخص نے آپ سے دریافت کیا۔ کہ آپ اتنی دور سکھوں پر جہاد کرنے کو کیوں جاتے ہیں۔ انگریز جو اس ملک پر حاکم ہیں۔ وہ دین اسلام سے کیا منکر نہیں ہیں۔ گھر کے گھر میں ان سے جہاد کر کے ملکِ ہندوستان لے لو۔ یہاں لاکھوں آدمی آپ کا شریک اور مددگار ہو جائے گا۔ کیونکہ سینکڑوں کوس سفر کر کے سکھوں کے ملک سے پار ہوکر افغانستان میں جانا اور وہاں برسوں رہکر سکھوں سے لڑنا ایک ایسا امر محال ہے۔ جس کو ہم لوگ نہیں کر سکتے۔ سید صاحبؒ نے جواب دیا۔ کہ کسی کا ملک چھین کر ہم بادشاہت کرنا نہیں چاہتے۔ نہ انگریزوں کا نہ سکھوں کا ملک لینا ہمارا مقصد ہے۔ بلکہ سکھوں سے جہاد کرنے کی صرف یہی وجہ ہے۔ کہ وہ ہمارے برادران اسلام پر ظلم کرتے اور اذان وغیرہ فرائضِ مذہبی ادا کرنے کے مزاحم ہوتے ہیں۔ اگر سکھ اب یا ہمارے غلبے کے بعد ان حرکات مستوجب جہاد سے باز آجائیں گے تو ہم کو اُن سے لڑنے کی ضرورت نہ رہیگی۔ اور سرکارِ انگریزی گو منکرِ اسلام ہے۔ مگر مسلمانوں پر کچھ ظلم اور تعدی نہیں کرتی۔ اور نہ ان کو فرض مذہبی اور عبادت لازمی سے روکتی ہے"۔

مولٰنا ۱۲۴۱ھ (۱۸۲۵ء) کے شروع میں سفرِ جہاد کے لئے روانہ ہوئے۔ اس وقت آپ کے ساتھ پانچ سات ہزار ہندوستانی تھے جنہوں نے جہاد کرنے اور مسلمانانِ پنجاب و سرحد کو مذہبی آزادی دلانے کے لئے اپنی جانیں قربان کرنے کا تہیہ کر لیا تھا۔ آپ مالیر کوٹلہ۔ بہاولپور۔ حیدرآباد سندھ۔ شکارپور۔ درۂ بولن اور

قندھار ہوتے ہوئے کابل پہنچے۔ اور وہاں سے براستہ خیبر پشاور میں داخل ہوئے۔ پھر یہاں سے نوشہرہ تشریف لے گئے۔

جنگ شروع کرنے سے پہلے آپ نے دربارِ لاہور کو ایک تحریری اعلام نامہ حسب قاعدۂ شریعت بھیجا۔ لیکن دربارِ لاہور نے اس کا کوئی جواب نہ دیا۔ اور جرنیل بدھ سنگھ کو ایک بڑا لشکر دے کر مجاہدین کے مقابلے کے لئے بھیجا۔ سب سے پہلا معرکہ ۲۱ دسمبر ۱۸۲۶ء کو نوشہرہ سے سات آٹھ میل کے فاصلے پر بمقام اکوڑہ ہوا۔ اس میں مجاہدین کامیاب رہے۔ اور بدھ سنگھ کو پیچھے ہٹنا پڑا۔ اس کے بعد "شبخونِ حضرو" کا واقعہ پیش آیا۔ جس میں بہت سا مالِ غنیمت مجاہدین کے ہاتھ آیا۔

ان دونوں معرکوں کے کچھ عرصہ بعد ۱۱ جنوری ۱۸۲۷ء کو تمام علماء اور رؤساء ہندوستان نے آپ کے ہاتھ پر بیعتِ امامت کی۔ اور آپ کو باقاعدہ امیر المومنین چنا۔ تاکہ آپ کو انتظامِ جہاد۔ تقسیم غنائم۔ اقامتِ جمعہ اور ترویج شریعت کا پورا اختیار ہو۔ اور آپ کے نام کا خطبہ پڑھا جائے۔ سردار یار محمد خان اور سردار پیر محمد خان حاکمانِ پشاور نے بذریعہ خطوط آپ کی امامت کو دل و جان سے قبول کیا۔ اور ان کی درخواست پر آپ لشکر مجاہدین اور سرداران سمہ کے ساتھ ان کے لشکر کی طرف نوشہرہ تشریف لے گئے۔ اور مقام سیدو پر سکھوں کے ساتھ جنگ کی تیاریاں شروع کیں۔ جس صبح کو جنگ شروع ہونے والی تھی۔ اس سے پہلے شام کو آپ کے کھانے میں زہر ملا دیا گیا۔ چنانچہ جب صبح کو مولوی محمد اسمٰعیل آپ کی خواب گاہ میں تشریف لے گئے۔ تو آپ بے ہوش پڑے تھے اور آپ کے منہ سے خود بخود قے جاری تھی جس سے زہر بتدریج خارج ہو رہا تھا۔ آپ نے اس نازک حالت میں بھی کہا کہ مجھے میدانِ جنگ میں لے چلو۔ چنانچہ چند آدمیوں کی مدد سے آپ سوار ہوئے اور میدانِ جنگ میں تشریف لے گئے۔ اس وقت حاکمانِ پشاور اور سرداران سمہ کا لشکر آپ کے ساتھ تھا۔ لیکن سکھوں کا لشکر بہت بڑا تھا۔ اور ان کے پاس توپیں اور سامان حرب بھی کافی تھا۔ مجاہدین بیشتر بے ہتھیار تھے۔ اور ایک منتظم فوج کے سامنے جم کر لڑنا ان کے لئے ممکن نہ تھا۔ چنانچہ میدانِ جنگ سکھوں کے ہاتھ رہا اور مجاہدین کا لشکر تتر بتر ہو گیا۔[1]

---

[1] اس واقعہ کے بعد حضرت سید صاحب ترغیب جہاد کے لئے سرحدی علاقہ سوات بنیر میں چلے گئے۔ ڈاکٹر جویریہ

اس زمانے میں مجاہدین کی حالت بہت خراب ہو گئی تھی۔ سردی کا موسم تھا۔ برفباری ہو رہی تھی۔ اور ان کے پاس نہ رہنے کو مکان تھے۔ نہ اوڑھنے کو کپڑے۔ اس بے سروسامانی کے علاوہ فاقہ کشی ایک مصیبت تھی۔ مجاہدین کے پاس کھانے کو کوئی چیز نہ تھی۔ کئی کئی دن فاقے کرتے۔ یا درختوں کی پتیاں اُبال کر بھوک کی آگ بجھاتے اور اسی حالت میں مخالفین کا مقابلہ کرتے۔ انہی دنوں ایک اور حادثہ یہ ہوا۔ کہ مولوی محبوب علی جو ہندوستان سے مجاہدین کا ایک قافلہ لے کر آئے تھے۔ راستے میں درّانی افغانوں کے سدِّراہ ہونے سے اس قدر برافروختہ ہوئے کہ یہاں پہنچکر انہوں نے بہت سے لوگوں کو بہکانا شروع کیا اور انہیں واپس ہندوستان لے گئے۔ اُن کے واپس جانے سے جہاد کو بہت نقصان پہنچا۔ ایک تو ہندوستان سے جو قافلے آتے تھے وہ بند ہو گئے۔ دوسرے معاونین جہاد دل برداشتہ ہو گئے اور جو روپیہ وہ امداد کے طور پر بھیجتے تھے۔ وہ بھی آنا بند ہو گیا۔ جب بہت سے خطوط تشریحِ حال کے لئے ہندوستان گئے۔ تو مولوی محمد اسحٰق اور مولوی محمد یعقوب کی سعی سے یہ فتنہ رفع ہوا۔ اور خرچ اور قافلوں کی روانگی دوبارہ شروع ہوئی۔

انہی دنوں مولوی عبدالحی صاحب جنہوں نے سب سے پہلے سید صاحب کے ہاتھ پر بیعت کی تھی۔ ۲۴ر فروری ۱۸۲۸ء کو وفات پا گئے۔ سارے لشکر کو ان کی وفات سے سخت صدمہ پہنچا۔ وہ بڑے با استقلال اور سمجھدار بزرگ تھے۔ اور ان کا صلاح مشورہ سید صاحب کو بہت مفید تھا۔

ان مصائب کے باوجود سکھوں اور ان کے افغان ساتھیوں سے جہاد جاری رہا۔ اور چونکہ مجاہدین جان توڑ کر لڑتے تھے۔ اسلئے انہیں اکثر کامیابی ہوتی۔ بالخصوص ان فوجی دستوں کو جو مولوی محمد اسمٰعیل

(فٹ نوٹ بقیہ صفحہ ۱۲) اپنی کتاب میں جس کی تالیف پر انہیں پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری ملی لکھتے ہیں:-

"سید صاحب سورت بھاگ گئے"

سید صاحب کی تاریخ شہادت بھی ڈاکٹر صاحب نے ۱۸۳۲ء لکھی ہے۔ جو غلط ہے۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ کے حالات کے متعلق ایک منصفانہ اور محققانہ کتاب کی سخت ضرورت ہے لیکن یہ ایسے شخص کی لکھی ہوئی نہ ہو۔ جو رنجیت سنگھ کی درباری زبان فارسی سے نابلد ہو۔

کے زیرِ قیادت غنیم پر شبخون مارتے تھے۔ اِن حالات کو دیکھ کر راجہ رنجیت سنگھ نے حکیم عزیز الدین[1] اور سردار وزیر سنگھ کو سفیر مقرر کیا اور پیامِ صلح دے کر سید صاحب کی طرف بھیجا۔ صلح کی شرط راجہ رنجیت سنگھ نے یہ پیش کی کہ دریائے اباسین سے بائیں طرف کا ملک جو سید صاحب کے قبضے میں ہے۔ اُن کے قبضے میں رہے اور وہ دائیں طرف کا قصد نہ کریں۔ راجہ رنجیت سنگھ کی اس سفارت کا جواب سید صاحب نے مولوی خیر الدین شیرکوٹی اور حاجی بہادر خان کے ہاتھ بھیجا۔ وہ سب سے پہلے جنرل ونٹورا کی ملاقات کو گئے۔ جنرل ونٹورا نے ڈپلومیسی کا جال پھیلایا اور کہا کہ "جس وقت میرا ڈیرہ حضرو میں تھا۔ اس وقت ایک شخص بطور سفیر خلیفہ صاحب (یعنی حضرت مولٰنا سید احمد بریلوی) کی طرف سے میرے پاس آیا اور کہتا تھا۔ کہ اگر راجہ رنجیت سنگھ خلیفہ صاحب کی معرفت مالیہ (مالگزاری) ملک یوسف زئی کی لیا کریں۔ تو سرکارِ خالصہ تکلیف فوج کشی اور زیر باری سے رہائی پائے۔ اور اس ملک کے آدمی تاراجی اور خرابی اور آتش زنی سے مخلصی پائیں۔ سو یہ بات مجھکو بہت پسند آئی"۔

جنرل ونٹورا کی چال بڑی گہری تھی۔ اسکی کوشش یہ تھی کہ سانپ بھی مرجائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے یعنی سید صاحب رنجیت سنگھ کی مخالفت کرنے کی بجائے اس کا خراج وصول کرنے کا کٹھن کام اپنے ہاتھ میں لے لیں۔ لیکن مجاہدین گھر بار اور بیوی بچوں کو چھوڑ کر ہوسِ ملک گیری کے لئے نہ آئے تھے۔ مولوی خیر الدین صاحب نے صاف کہدیا۔ "یہ بات بالکل دروغ ہے . . . . . . خلیفہ صاحب کو اطاعت کفار اور ان کو مالیہ دینے سے کیا کام"۔ اس کے بعد ونٹورا نے "رسمِ ارسالِ ہدایا اور تحائف" شروع کرنے کو کہا۔ مگر مولوی صاحب خالص مجاہد تھے۔ انہوں نے جنرل ونٹورا کو ترش سا جواب دیا۔ اور یہ سفارت رنجیت سنگھ کے پاس جانے کی بجائے ونٹورا سے ملاقات کر کے واپس آگئی[2]۔

جب دربار لاہور حضرت مولٰنا کو اپنا ماتحت عامل بنانے میں کامیاب نہ ہوا۔ تو انہوں نے دوسرے فریق کے ساتھ

---

[1] رنجیت سنگھ کے دربار میں صرف ایک مسلمان نے وقار حاصل کیا۔ یعنی فقیر عزیز الدین نے۔ آپ راجہ کے طبی مشیر اور اسکی اکثر پولیٹکل سفارتوں کے رکن تھے۔

[2] سوانح احمدی صفحہ ۱۱۹۔

سازباز شروع کی۔ سیدو کے معرکے میں سردار یار محمد خان حاکم پشاور سید صاحب کے ساتھ تھا۔ اب راجہ رنجیت سنگھ نے جو اس دوران میں خود پشاور آیا تھا۔ یار محمد خان کے ساتھ تعلقات بحال کر لئے۔ خراج کا وعدہ لے کر اُسے پھر حاکم پشاور مقرر کیا۔ اور اسکے لڑکے کو بطور یرغمال لاہور لے گیا۔ اُس کے بعد سردار یار محمد خان حضرت مولانا کی مخالفت میں جنرل ونٹورا۔ راجہ شیر سنگھ اور جنرل بدھ سنگھ سے پیش پیش تھا۔ اور افغان مسلمان جنہیں سکھوں سے نجات دلانے کے لئے مجاہدین سارے ہندوستان سے کھنچکر آئے تھے۔ راجہ رنجیت سنگھ کی حکمتِ عملی سے مجاہدین کے سب سے بڑے دشمن ہو گئے۔ چنانچہ اسکے بعد جنرل ونٹورا اور دربار لاہور کے دوسرے جنرل تو علیحدہ ہو گئے۔ لیکن سید صاحب کا مقابلہ رنجیت سنگھ کے افغان صوبیداروں سے شروع ہوا جسمیں سید صاحب کامیاب رہے۔ ایک معرکے میں سردار یار محمد خان مارا گیا۔ اور اسکے بھائی سردار سلطان محمد خان نے شکست کھانے کے بعد اپنے وکیل ارباب فیض اللہ خان کی معرفت سید صاحب سے معافی مانگی۔ سید صاحب نے افعال ماضیہ سے اسکے تائب ہونے اور اپنے علاقے میں شرع کے قوانین رائج کرنے کے وعدے پر پشاور کا علاقہ اُسے بخش دیا۔

پشاور ۱۸۳۰ء کے آخر میں فتح ہوا اور شرع کے مقدمات فیصل کرنے کے لئے مولوی سید مظہر علی صاحب عظیم آبادی پشاور شہر کے قاضی مقرر ہوئے۔ اُنہوں نے حسب دلخواہ سید صاحب احکام شریعت نافذ کئے۔ شہر میں بھنگ۔ چرس اور افیون وغیرہ کی دکانیں بند ہو گئیں۔ اور شراب کی بھٹیاں اور شراب فروش ناپید ہو گئے۔ کسبیاں اور فاحشہ عورتیں جو اس شہر میں ہزارہا تھیں۔ اپنے اپنے گھروں میں چھپ گئیں۔ یا شہر چھوڑ کر فرار ہو گئیں۔ اس کے علاوہ سید صاحب نے بیرونجات میں تحصیل عشر اور انتظام ملک کے لئے جابجا تحصیلدار مقرر کر دئے۔ اور ان قبائل کی معاشرتی اصلاح کے لئے بھی احکام جاری کئے۔ اس علاقے میں ایک بُری رسم یہ تھی۔ کہ لوگ اپنی لڑکیوں کی شادی کرتے وقت اُن کے عوض نقد رقمیں وصول کرتے تھے۔ اکثر اوقات منگنی کی رسم ادا ہو جاتی۔ لیکن جب تک دولہا کی طرف سے معقول رقم وصول نہ ہوتی۔ ان کی شادی نہ ہوتی۔ اور چونکہ یہ رقمیں دولہا کی استطاعت سے بڑھ کر ہوتی تھیں۔ اس لئے دولہا کو قرض لینا پڑتا۔ یا اکثر اوقات کنواری لڑکیاں اپنے والدین کے گھروں میں بیٹھی بیٹھی بوڑھی ہو جاتیں۔ چونکہ اس رسم دختر

فروشی سے طرح طرح کی خرابیاں پیدا ہو رہی تھیں - اس لئے سید صاحب نے اس کے خلاف احکام جاری کئے ۔

سید صاحب تو اپنی ان اصلاحی کوششوں میں مصروف تھے - اور ان کے مخالفین لوگوں کو طرح طرح سے بہکا رہے تھے - بعضوں کو دربارِ لاہور کے کارندوں نے زر و مال کا لالچ دیا - بعضوں کو سید صاحب کی اصلاحی کوششوں کے خلاف اُکسایا گیا - پشاور کے علماء نے بھی سید صاحب کے خلاف فتوے دے دیئے ۔

چنانچہ ملک سمہ کے خوانین نے جراب تک سید صاحب کے ساتھ تھے حاکمِ پشاور کے ایما پر فیصلہ کیا کہ جس قدر مجاہدین بغرض تحصیل عشر و انتظام ملک جا بجا تعینات ہیں انہیں ایک ہی رات میں قتل کر دیا جائے - جس رات کو یہ قتل مقرر ہوا تھا اس شام کو حسبِ اشارۂ مقررہ سابق ہر ایک گاؤں میں نقارے بجائے گئے اور اونچے مکانوں پر آگ جلائی گئی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اور رات کو بوقتِ عشا جب یہ گروہ خدا ادائے نماز میں مشغول تھا - اُن کا قتل شروع ہوا - کوئی سجدے میں اور کوئی رکوع میں اور کوئی قیام میں شہید ہوا - کسی گاؤں میں آدھی رات کو اور کسی گاؤں میں قبل از فجر اور بعض گاؤں میں عین نمازِ فجر میں یہ مردانِ خدا جو انتخاب ملک ہندوستان کے تھے - قتل گائے اور بکریوں کے ظالموں کے ہاتھ سے ذبح کئے گئے ۔

سید صاحب پر اس حادثے کا جو اثر ہوا ہوگا - وہ ظاہر ہے - ان کی کوششیں جنہیں جنرل ونٹورا کی فوجیں اور جنرل بدھ سنگھ کی فوجیں ناکام نہ کر سکیں - دربار لاہور کی ڈپلومیسی سے مسلمانوں ہی کے ہاتھوں خاک میں مل گئیں - چنانچہ انہوں نے اس علاقے سے ہجرت کر کے عرب کو جانے کا فیصلہ کیا - اور اپنے ساتھیوں کو اپنے اپنے گھر جانے کی اجازت دے دی - لیکن اکثر مجاہدین نے آپ کو چھوڑنا قبول نہ کیا - آپ چند منزلیں چل کر ملک کاغان میں بمقام راج دواری مقیم تھے - کہ راجہ شیر سنگھ کا لشکر اس طرف آیا اور اسکی مدافعت کے لئے سردار حبیب اللہ خان نے آپ کی مدد چاہی - چنانچہ آپ لشکرِ مجاہدین کے ساتھ بالاکوٹ تشریف لے آئے - بالاکوٹ میں جو لڑائی ہوئی - اس میں سید صاحب

کا لشکر اُن کے کسی ساتھی کی غداری اور نمک حرامی سے چاروں طرف سے محصور ہو گیا۔ راجہ شیر سنگھ کا لشکر
بہت بڑا تھا۔ اُس کی فوج چاروں طرف پہاڑیوں پر چھا گئی۔ مجاہدین بیچ میں محصور تھے۔ اور ان کے لئے
پہاڑی پر چڑھنا بہت مشکل تھا۔ اس جنگ میں مجاہدین کو شکست فاش ہوئی۔ مولوی محمد اسمٰعیل شہید
مولوی خیرالدین اور ارباب بہرام خان سب اس معرکے میں شہید ہوئے۔ سید صاحب کے بعض معتقدین
جو انہیں مہدی موعود سمجھتے تھے۔ یہ خیال کرتے رہے کہ سید صاحب غائب ہو گئے ہیں لیکن زیادہ صحیح
روایت یہی ہے کہ وہ اس جنگ میں ۲۴ ذیقعدہ ۱۲۴۶ھ یعنی ۶ مئی ۱۸۳۱ء کو بالاکوٹ میں شہید ہوئے۔
وَلَا تَقُولُوا لِمَنْ يُقْتَلُ فِي سَبِيلِ اللهِ أَمْوَاتٌ ط بَلْ أَحْيَاءٌ وَّلَكِنْ لَّا تَشْعُرُونَ ۝[1] (اور
جو لوگ اللہ کی راہ میں مارے جائیں۔ اُنہیں مرا ہوا نہ کہو۔ وہ مرے نہیں بلکہ زندہ ہیں۔ مگر تم نہیں سمجھتے)

مولانا سید احمدؒ کی علمی قابلیت کا اندازہ کرنا آسان نہیں "صراطِ مستقیم" کے سوا ان کی کوئی تصنیف نہیں
ملتی۔ اور "صراطِ مستقیم" بھی مولانا عبدالحی اور مولانا اسمٰعیل شہید نے مرتب کی ہے۔ اس کتاب سے ظاہر ہے۔ کہ اگرچہ
مولانا کو علومِ مروجہ کی مشہور کتب سے غیر معمولی واقفیت نہ تھی لیکن ان میں تمام مذہبی مسائل کو سمجھنے کی صلاحیت
بہت تھی۔ اور اکثر اُمور میں انکی رائے عقل۔ قومی مصلحت اور شعائرِ اسلامی سے قریب تر ہوتی۔ اس کے علاوہ
یہ بھی ظاہر ہے کہ بعض وہابیوں کی طرح وہ تصوف کے مخالف نہ تھے۔ بلکہ اس کی اصلاح چاہتے تھے۔ شاہ ولی اللہ
نے بھی یہی طریقہ اختیار کیا تھا۔ اُسے شاہ عبدالعزیزؒ نے جاری کیا۔ اور غالباً انہی کے زیرِ اثر تصوف کو سرے سے
ایک بدعت سمجھنے کی بجائے مولانا نے بھی طریقہ محمدیہ جاری کر کے اس کی اصلاح کی کوشش کی۔ شاہ ولی اللہؒ
اور شاہ عبدالعزیزؒ سمجھتے تھے۔ کہ تصوف میں اگرچہ نقائص پیدا ہو گئے ہیں۔ اور مروجہ تصوف کی بعض باتیں
عقل اور مذہب کی رُو سے قابلِ اعتراض ہیں۔ لیکن بہت سی باعظمت اور بلند پایہ ہستیوں کو تصوف ہی میں
اپنی ذہنی کش مکش کا علاج ملا ہے۔ اور ایک نیک سمجھدار اور غدار سیدہ مرشد کے ہاتھ میں تصوف اصلاحِ باطن
بلکہ خواص کی تنظیم کا ذریعہ بھی ہو سکتا ہے۔ مولانا سید احمد نے یہی کیا۔ طریقہ محمدیہ میں تصوف پر شریعت کی فوقیت نمایاں

[1] سورہ بقر آیت ۱۵۰

کردی اور بیعت کا سلسلہ جاری رکھ کے نہ صرف اپنے مریدوں کی اصلاحِ دینی و دنیاوی کا انتظام کیا۔ بلکہ ایک ایسی جماعت بھی قائم کر دی جو اُنکی بیعت سے جہاد ایسا اہم اور ایثار طلب فرض ادا کرنے کو تیار ہو گئی۔

ڈاکٹر ٹائی ٹس نے ہندوستانی مسلمانوں کے متعلق جو کتاب لکھی ہے۔ اُس میں مولٰنا سید احمد بریلوی اور سر سید احمد خان کو ایک دوسرے کی ضد قرار دیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ سر سید مولانا کے ہمخیال اور ان کے نہایت عقیدتمند مداحوں میں سے تھے۔ اس کا ثبوت اُن مضامین سے مل سکتا ہے۔ جو انہوں نے ڈاکٹر ہنٹر کی کتاب کے خلاف اور وہابی عقائد کے حق میں لکھے تھے۔ اس کے علاوہ سر سید نے اپنی کتاب آثار الصنادید میں مولٰنا سید احمد بریلوی مولانا اسمٰعیل شہیدؒ اور شاہ عبدالعزیزؒ کے متعلق بے حد عقیدت کا اظہار کیا ہے۔ اِن بزرگوں کے حالاتِ زندگی بڑی تفصیل اور بڑے ادب احترام سے لکھے ہیں اور اُن کے مخالفوں پر سختی سے نکتہ چینی کی ہے۔ سر سید اور مولٰنا سید احمد بریلوی کے ذاتی تعلقات کا تو کوئی سُراغ نہیں ملتا۔ لیکن آثار الصنادید سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ سر سید مولٰنا شہیدؒ کے مسجد جامع کے وعظ میں شریک ہوا کرتے تھے اور مولٰنا کی تعلیمات سے خاص طور پر متاثر ہوتے تھے۔ مولٰنا حالی سر سید کی ابتدائی زندگی کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:-

"مولٰنا اسمٰعیل شہیدؒ نے اُن کے خیالات کی اور زیادہ اِصلاح کی۔ اور انہیں کسی قدر تقلید کی بندشوں سے آزاد کیا۔"

یہ صحیح ہے کہ بعد میں سر سید کے خیالات میں بہت سی تبدیلیاں پیدا ہو گئیں۔ لیکن اس کے باوجود سر سید کے دل میں ان بزرگوں کی جو عقیدت تھی وہ برقرار رہی۔

خلفاء

سید صاحب کی اصلاحی کوششوں کی اہمیت اِس لئے بہت زیادہ ہے۔ کہ یہ کوششیں صرف آپکی ذات تک محدود نہ تھیں۔ بلکہ آپ کو نظم و انتظام کا بھی بڑا ملکہ تھا۔ اور آپ ایک ایسا نظام قائم کر گئے۔ جس سے آپ کے مقاصد کی تکمیل آپ کی شہادت کے بعد بھی ہوتی رہی۔ آپ کی ذات ایک سرچشمۂ فیض تھی۔ جس سے ہزاروں ندیاں جاری ہوئیں اور جن سے ملک کی کشتِ ایمان اب بھی سیراب ہو رہی ہے۔ مورخوں نے آپ کے خلفاء کی بڑی طویل فہرست دی ہے۔ مولوی محمد جعفر نے جنہوں نے "بطور تبرک" فقط چند خلفاء کے نام درج کئے ہیں۔ چھیاسٹھ حضرات کے نام گنائے ہیں۔ ان ناموں میں سے اہم ترین یہ ہیں:-

(۱) مولوی عبدالحی صاحب داماد شاہ عبدالعزیز صاحب (۲) مولوی محمد اسمٰعیل شہید (۳) مولوی عبدالغنی برادر خورد شاہ عبدالعزیز (۴) مولوی محمد علی صاحب رامپوری (۵) مولوی ولایت علی صاحب عظیم آبادی (۶) مفتی الٰہی بخش صاحب مترجم مثنوی مولانا روم (۷) مولوی عبداللہ صاحب غزنوی جنہوں نے امرتسر اور پنجاب کے دوسرے حصوں میں ارشاد و ہدایت کا کام کیا۔ اور جن کے بعد اُن کے خاندان نے اس کام کو جاری رکھا (۸) میاں جی شاہ نور محمد صاحب جھنجانوی جن کے مرید رشید اور خلیفہ خاص مولوی رشید احمد صاحب گنگوہیؒ اور مولوی محمد قاسم صاحب نانوتوی بانیٔ مدرسہ دیوبند کے استاد حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکیؒ تھے (۹) مولوی سید اولاد حسین صاحب قنوجی جن کے فرزند ارجمند نواب صدیق حسن خانصاحب بھوپالی نے اسلامی مسائل پر سو سے زیادہ کتابیں لکھیں اور انیسویں صدی کے اخیر میں علوم اسلامی کی بڑی اشاعت کی (۱۰) مولوی کرامت علی صاحب جونپوری ٭

سب سوانح نگار متفق ہیں کہ سید صاحب کے مریدوں میں بلند ترین مرتبہ مولوی عبدالحیؒ اور مولوی محمد اسمٰعیل شہیدؒ کا تھا۔ بلکہ اکثر کہا جاتا ہے کہ "یہ دونوں بزرگ بمنزلہ حضرت ابوبکر صدیقؓ اور حضرت عمرؓ کے آپ کے یارِ غار اور جاں نثار تھے۔" مولوی محمد اسمٰعیل صاحب میں حضرت عمرؓ کی طرح جوش و خروش اور جرأت و بہادری تھی اور باطل اور بدعت کے خلاف وہ اسی طرح تیغ بکف رہتے تھے۔ لیکن اس کے باوجود مولوی عبدالحی صاحب کو سب مریدوں سے افضل سمجھا جاتا ہے۔ وہ خاموش طبع تھے۔ لیکن ان کا ایمان چٹان کی طرح محکم و مضبوط تھا۔ طبیعت میں حضرت ابوبکرؓ کی طرح وقار اور تحمل تھا۔ نہ مصیبت میں گھبر کر گھبرانے تھے اور نہ کامیابی میں آپے سے باہر ہو جاتے تھے۔ آپ نے سید صاحب کو ہمیشہ صحیح اور نیک مشورہ دیا اور ان کے مشن پر اس وقت ایمان لائے جب سید صاحب کی خوبیاں ابھی بے نقاب نہ ہوئی تھیں۔

مولانا محمد اسمٰعیل شہیدؒ کا نام مولوی عبدالحی صاحب کے بعد لیتے ہیں۔ لیکن سید صاحب کی اصلاحی کوششوں کو جتنی تقویت اور رونق آپ سے ہوئی۔ شائد ہی کسی اور فردِ واحد کی مدد سے ہوئی ہو۔ آپ کی ذات میں بڑی خوبیاں جمع تھیں۔ آپ بڑے بہادر اور سمجھدار جرنیل تھے۔ اور سرحد کے جن معرکوں کی کمان آپ کے ہاتھ میں تھی اُن میں اکثر کامیاب رہے۔ اس کے علاوہ آپ زبردست مقرر اور بااثر واعظ تھے۔ آپ جہاد

میں شریک ہونے سے پہلے جامع مسجد دہلی کی سیڑھیوں پر ہر جمعہ کو وعظ کیا کرتے تھے۔ اور آپ کے وعظ وارشاد نے مسلمانوں کی مذہبی اور ذہنی زندگی میں جو انقلاب پیدا کر دیا۔ اس کے متعلق مولانا ابوالکلام آزاد لکھتے ہیں۔
شاہ صاحب (شاہ ولی اللہ صاحبؒ) نے مزاجِ وقت کے عدمِ تحمل واستعداد سے مجبور ہو کر بحکم

بہ رمز نکتہ ادا می کنم کہ خلوتیاں
سرِ سبو بگشادند و در فرو بستند!

دعوت واصلاحِ اُمت کے جو بھید پرانی دہلی کے کھنڈروں اور کوٹلہ کے حجروں میں دفن کر دیئے تھے۔ اب اس سلطانِ وقت وسکندرِ اعظم کی بدولت شاہجہاں آباد کے بازاروں اور جامع مسجد کی سیڑھیوں پر اُن کا ہنگامہ مچ گیا۔ اور ہندوستان کے کناروں سے بھی گزر کر نہیں معلوم کہاں کہاں تک چرچے اور افسانے پھیل گئے۔ جن باتوں کے کہنے کی بڑوں بڑوں کو بند حجروں کے اندر بھی تاب نہ تھی۔ وہ اب برسرِ بازار کہی جا رہی تھیں اور ہو رہی تھیں۔"

سامعین بلکہ مخالفین پر مولانا محمد اسمٰعیل کے وعظ کا جو اثر ہوتا تھا۔ اس کا اندازہ معاصرانہ تحریروں مثلاً "آثار الصنادید" سے ہو سکتا ہے۔ اور انکی علمی قابلیت۔ عقلِ سلیم۔ تیز منطق اور زورِ کلام کا ثبوت ان کتابوں سے ملتا ہے۔ جو انہوں نے یادگار چھوڑیں۔ ہم "صراطِ مستقیم" کا ذکر کر چکے ہیں۔ لیکن ہمارے خیال میں انکی اہم ترین کتاب "تقویت الایمان" ہے۔ جو انہوں نے اردو زبان میں اس وقت لکھی۔ جب اس زبان کو ابھی گھٹنوں چلنا نہ آیا تھا۔ حیرت ہوتی ہے کہ اس زمانے میں جب اردو نثر میں گنتی کی کتابیں تھیں۔ ایک صاحبِ کمال نے اس میں کیا جادو بھر دیا ہے۔ اور اسکی مدد سے اپنے خیالات کو کتنی خوبی سے ادا کیا ہے۔ مولانا شہیدؒ کا ارادہ کلمۂ توحید لا الٰہ الا اللہ محمد الرسول اللہ کی تفسیر لکھنے کا تھا۔ چنانچہ آپ نے اسکی تشریح کی کہ "ایمان کے دو جزو ہیں۔ خدا کو خدا جاننا اور رسولؐ کو رسولؐ سمجھنا۔ خدا کو خدا سمجھنا اس طرح ہوتا ہے۔ کہ اسؐ کا شریک کسی کو نہ سمجھے اور رسولؐ کو رسولؐ سمجھنا اس طرح ہوتا ہے کہ اس کے سوا کسی کی راہ نہ پکڑے۔ اس پہلی بات کو توحید کہتے ہیں۔ اور دوسری کو اتباعِ سنت کہتے ہیں۔ اور اس کے خلاف کو بدعت۔" چنانچہ آپ نے اپنی کتاب کے دو باب ٹھہرائے۔ پہلا بیان توحید اور شرک کے متعلق اور دوسرا

بدعت کے خلاف اتباعِ سنت کی تائید میں یہ کتاب نہ صرف مذہبی بلکہ ادبی نقطۂ نظر سے بھی بڑی اہم ہے۔ اس کی طرزِ تحریر ایسی بااثر اور پُرزور ہے کہ بقول صاحبِ سیر المصنفین معلوم ہوتا ہے کہ ایک دریائے ذخار اُمڈا چلا آتا ہے۔ "شاہ صاحب نے اپنی کتاب کے پہلے باب میں توحید کے متعلق جو کچھ لکھا۔ وہ آپ کے زورِ بیان اور جوشِ اصلاح کا نہایت عمدہ نمونہ ہے۔ آپ فرماتے ہیں۔ "سننا چاہیئے کہ اکثر لوگ پیروں کو اور پیغمبروں کو اور اماموں کو اور شہیدوں کو اور فرشتوں کو اور پریوں کو مشکل کے وقت پکارتے ہیں۔ اُن سے مرادیں مانگتے ہیں اور ان کی منتیں مانگتے ہیں اور حاجت برآئی کے لئے انکی نذر و نیاز کرتے ہیں اور بلا کے ٹلنے کے لئے اپنے بیٹوں کو اُن کی طرف نسبت کرتے ہیں۔ کوئی اپنے بیٹے کا نام عبد النبی رکھتا ہے۔ کوئی علی بخش کوئی حسین بخش کوئی پیر بخش۔ کوئی مدار بخش کوئی سالار بخش کوئی غلام محی الدین۔ کوئی غلام معین الدین اور ان کے جینے کے لئے کوئی کسی کے نام کی چوٹی رکھتا ہے۔ کوئی کسی کے نام کی بدھی پہناتا ہے۔ کوئی کسی کے نام کے کپڑے پہناتا ہے۔ کوئی کسی کے نام کی بیڑی ڈالتا ہے۔ کوئی کسی کے نام کے جانور ذبح کرتا ہے۔ کوئی مشکل کے وقت دہائی دیتا ہے۔ کوئی اپنی باتوں میں کسی کے نام کی قسم کھاتا ہے۔ غرض کہ جو کچھ ہندو اپنے بتوں سے کرتے ہیں وہ سب کچھ یہ جھوٹے مسلمان انبیاء اور اولیاء سے اماموں سے اور شہیدوں سے اور فرشتوں اور پریوں سے کر گزرتے ہیں اور دعویٰ مسلمانی کئے جاتے ہیں۔ سبحان اللہ! یہ منہ اور یہ دعویٰ!"

مولنا اسمٰعیل حضرت سید صاحب کے ساتھ بالاکوٹ میں شہید ہوئے تھے۔ اور مولوی عبد الحی اس سے پہلے ہی وفات پا گئے تھے۔ جب سید صاحب کی شہادت سے ان کا سارا سلسلہ بکھرنے لگا۔ تو مولوی ولایت علی عظیم آبادی نے منتشر قوتوں کو جمع کرنے کا کام ہاتھ میں لیا۔ وعظ و ارشاد سے لوگوں کو ہدایت کی اور

لہ یہ ایک نہایت عبرت آموز واقعہ ہے۔ کہ شاہ اسمٰعیل شہیدؒ جن کی تمام عمر قبر پرستی کے خلاف جہاد میں صرف ہوئی۔ آج بالاکوٹ میں ان کی قبر پر "لوگ تسوار چڑھا کر منتیں اور مرادیں آپ سے مانگتے ہیں۔" اسی طرح امام ابن تیمیہؒ کی تمام عمر پیر پرستی اور قبر پرستی کی مخالفت میں گزری۔ مگر آج دمشق میں ان کا مزار مرادیں مانگنے والوں کی بہت بڑی زیارت گاہ ہے۔

جو لوگ بد دل ہو گئے تھے۔ انکی ڈھارس بندھائی۔ آپ کی وفات محرم ۱۲۶۹ھ (۱۸۵۲ء) میں ہوئی۔ اس کے بعد بعض لوگ جو معرکۂ بالاکوٹ کے بعد راجہ گلاب سنگھ والئے کشمیر سے برسرِ پیکار تھے ۔ سرحد پر مقام ستھانہ چلے گئے اور وہاں سے انگریزی فوجوں کے خلاف چھیڑ چھاڑ میں مشغول ہوئے۔ جس کی وجہ سے حکومت کو مختلف وقتوں میں فوجیں بھیجنی پڑیں۔ ہندوستان سے بھی ان لوگوں کی مدد کے لئے پٹنہ اور دوسری جگہوں سے روپیہ بھیجا جاتا تھا چنانچہ حکومت نے پٹنہ اور انبالہ میں مشتبہ لوگوں کے خلاف مقدمے چلائے۔ جن میں اکثر کو سزا ہوئی اور وہابیوں بلکہ عام مسلمانوں کے خیالات کے متعلق حکومت کے دل میں شبہات پیدا ہو گئے۔ مسلمان بھی غدر کے بعد حکومت سے بد دل ہو رہے تھے۔ اور ہندوستان کو کئی لوگ دار الحرب کہتے اور یہاں سے ہجرت واجب سمجھنے لگے تھے۔

اس ناخوشگوار صورت حالات کا تدارک خان بہادر مولوی عبداللطیف خان سیکریٹری محمڈن لٹریری ایسوسی ایشن کلکتہ نے کیا۔ انہوں نے مکہ معظمہ سے حنفی۔ شافعی اور مالکی تینوں فرقوں کے مفتیوں کے فتوے منگائے اور واضح کیا کہ جب تک اسلامی فرائض کے ادا کرنے میں کوئی امر مانع نہیں۔ ہندوستان دار الحرب نہیں۔ اس کے علاوہ مولوی صاحب نے مختلف جگہوں پر مولوی کرامت علی جونپوری کا وعظ کرایا اور رسائل تقسیم کئے جن سے عام مسلمانوں کے شبہات دور ہوئے۔ اس کے علاوہ لارڈ میو نے مسلمانوں کی تعلیم پر خاص توجہ شروع کی اور سرسید نے مضامین لکھ کر حکومت کے شکوک رفع کئے۔ چنانچہ لارڈ رپن نے وہابی قیدیوں کو کالے پانی سے واپس بلا کر رہا کر دیا۔ اور اس کش مکش کا خاتمہ ہوا۔

مولوی کرامت علی صاحب جنہوں نے انیسویں صدی کے آخر میں مولانا سید احمد کی خالص اصلاحی کوششوں کو جاری رکھا۔ بڑے قابل۔ معاملہ فہم اور سمجھدار بزرگ تھے۔ آپ سید صاحب کو اپنے زمانے کا مجدد سمجھتے تھے۔ آپ کی کوششیں زیادہ تر ترویجِ علوم دین اور اصلاحِ رسوم پر وقف ہیں اور ڈھاکہ اور اضلاع بنگال میں جہاں حاجی شریعت اللہ اور دوسرے بزرگوں نے ارشاد و ہدایت کا کام بہت پہلے شروع کر رکھا تھا۔ اپنی علمی قابلیت سے مضر رسوم اور غیر اسلامی عقائد کے خلاف بہت کوشش کی۔ آپ بہت سی کتابوں کے مصنف ہیں مثلاً "ردّ البدعت"۔ "دافع الوسواس"۔ "ترجمہ شمائل ترمذی"۔ "ترجمہ مشکوٰۃ جلد اوّل"۔ "مفتاح الجنت" وغیرہ۔ امیر دوست محمد خان والیٔ کابل آپ کے دوستوں میں سے تھے۔

رائٹ آنریبل سید امیر علی ایک مضمون میں لکھتے ہیں "عربی فلسفہ و علوم سے مجھے جو کچھ واقفیت ہے۔ وہ میرے محترم دوست مولوی سید کرامت علی جونپوری کی وجہ سے ہے"۔ میانہ روی اور معاملہ فہمی میں آپ شاہ عبد العزیز کے جانشین سمجھے جاتے ہیں اور اس میں کوئی شک نہیں کہ ایک ایسے موقعے پر جب قوم کی کشتی گرداب میں جارہی تھی۔ آپ نے مسلمانوں کو قومی فلاح و بہبود کا رستہ دکھایا۔ اور آپ کا شمار حضرت سید احمد بریلوی کے برگزیدہ خلفاء میں ہوتا ہے۔ آپ کی وفات ۱۲۹۰ھ یعنی ۱۸۷۳ء میں ہوئی۔ مزار رنگپور (بنگال) میں ہے۔

مومن

یہ خلفاء تو ایسے بزرگ تھے جنہیں حضرت سید احمد صاحب نے بیعت کی اجازت دے رکھی تھی۔ لیکن ان کے علاوہ سید صاحب کے مریدوں میں اور کئی بلند پایہ ہستیاں تھیں۔ ان میں سے ایک قابلِ ذکر ہستی اردو کا مشہور شاعر مومن ہے۔ بعض لوگوں کو تعجب ہو گا کہ ایک حکیم۔ نجومی اور "تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو" کے عاشقانہ گیت گانے والا مومن کس طرح ان لوگوں میں شریک ہو سکتا ہے۔ جنکی زندگیاں سادہ اور سپاہیانہ تھیں۔ لیکن یہ امر واقعہ ہے کہ مومن بھی اس انقلاب سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہا۔ جو تمام شمالی ہندوستان میں وقوع پذیر ہوا۔ وہ حضرت مولنا سے دلی عقیدت رکھتا تھا۔ چنانچہ ایک مثنوی میں وہ حضرت سید احمد کی تعریف میں لکھتا ہے ؎

وہ خضرِ طریقِ رسولِ خدا	کہ جو پیرو اُس کا ہے سو پیشوا
وہ نورِ مجسم وہ ظلِ الٰہ	کہ سائے سے جسکے خجل مہر و ماہ
زہے سید احمد قبولِ خدا	سدِ اُمتانِ رسولِ خدا

اِس مثنوی میں جہاد کی فضیلت بتائی ہے۔ اور لوگوں کو حضرت کے جھنڈے تلے جمع ہونے کی ترغیب دی ہے ؎

جو داخل سپاہِ خدا میں ہوا	فدا جی سے راہِ خدا میں ہوا
حبیب حبیبِ خداوند ہے	خداوند اس سے رضامند ہے
امامِ زمانہ کی یاری کرو	خدا کے لئے جاں نثاری کرو

اخیر میں دُعا کی ہے ؎

الٰہی مجھے بھی شہادت نصیب | یہ افضل سے افضل عبادت نصیب!
الٰہی اگرچہ ہوں میں تیرہ کار | پہ تیرے کرم کا ہوں اُمیدوار
تو اپنی عنایت سے توفیق دے | عروجِ شہید اور صدیق دے

ایک رباعی میں یہی خیال شاعرانہ شوخی سے ادا کیا ہے ؎

مومن تمہیں کچھ بھی ہے جو پاسِ ایماں | ہے معرکۂ جہاد چل دیجے وہاں
انصاف کرو۔ خدا سے رکھتے ہو عزیز | وہ جاں جسے کرتے تھے بتوں پر قرباں!

ایک اور جگہ اپنے مذہبی خیالات بڑے جوش سے بیان کئے ہیں ؎

اربابِ حدیث کا میں فرمانبر ہوں | تقلید کے منکروں کا سر دفتر ہوں
مقبول روائتِ ائمہ نہ قیاس! | یعنی کہ فقط مطیعِ پیغمبر ہوں

مومن نے جو اشعار مولانا سید احمد کی امامت کے متعلق لکھے ہیں۔ اُن سے ایسا معلوم ہوتا ہے۔ کہ وہ مولانا کے بعض اور عقیدتمندوں کی طرح انہیں مہدیٔ دوراں سمجھتا تھا ؎

گلابِ ناب سے دھوتا ہوں مغزِ اندیشہ | کہ فکرِ مدحتِ سبطِ قسیمِ کوثر ہے
وہ کون امامِ جہان و جہانیاں احمدؐ! | کہ محض مقتدیٔ سنّتِ پیمبرؐ ہے
وہ شاہِ مملکتِ ایماں کہ جسکا سالِ خروج | "امامِ برحق مہدی نشاں علی فر" ہے

۱۲۴۲ھ

یا ؎

شوقِ بزمِ احمد و ذوقِ شہادت ہے مجھے
جلد مومن لے پہنچ اس مہدیٔ دوراں تلک

حالی کو بالعموم مسلمانانِ ہند کا پہلا قومی شاعر سمجھا جاتا ہے۔ لیکن جب ہم اس بات پر غور کرتے ہیں کہ مولانا سید احمد بریلوی نے پہلی دفعہ مسلمانانِ ہند کو دوسری قوموں کے مقابلے میں جمع کیا۔ اور ان کے ایک طبقے کو مذہبی آزادی دلانے کے لئے اپنی جان قربان کر دی تو یہ ماننا پڑتا ہے۔ کہ مسلمانان

ہند کی جُداگانہ قومیت کا اظہار سب سے پہلے انہوں نے کیا۔ اس صورت میں مومن کو مسلمانانِ ہند کا پہلا قومی شاعر ماننا پڑے گا۔ کیونکہ اُس نے مولانا سید احمد کے خیالات کی ترجمانی اسی طرح کی جسطرح بعد میں سرسید کی حالی نے!

غیر مقلد ۔ اہلحدیث

"صراطِ مستقیم" اور دوسری کتابوں سے جو سید صاحب کے سفرِ حج سے پہلے لکھی گئیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ سید صاحب جو مذہبی اور معاشرتی اصلاحات عمل میں لانا چاہتے تھے۔ ان کا خیال انہیں شاہ عبدالعزیز صاحب کے فیض صحبت سے ہوا۔ ان اصلاحی کوششوں سے وہ کسی حد تک بے خبر تھے۔ جو امام محمد بن عبدالوہاب کے پیرو عرب میں کر رہے تھے اور جن کا بیج امام ابن تیمیہؒ نے اپنی زندگی ہی میں اپنی تصنیفات میں بو یا تھا۔ جب وہ حج کے لئے مکہ معظمہ تشریف لے گئے تو وہاں انہیں وہابیوں کے عقائد سے باخبر ہونے کا موقع ملا جو اُن کے سفرِ حج سے چند سال پہلے مقاماتِ مقدسہ پر قابض تھے۔ حضرت سید صاحب اور وہابیوں کے مقاصد میں بہت اشتراک تھا۔ اس لئے اُن کے بہت سے ساتھی وہابی عقائد سے متاثر ہو کر آئے۔ مثلاً وہابی عقائد میں ایک اہم عقیدہ "عدم وجوب تقلیدِ شخصی" کا ہے۔ اہل سنت مسلمان فقہ کے چار بڑے اماموں امام ابو حنیفہؒ امام شافعیؒ۔ امام مالکؒ اور امام حنبلؒ میں سے کسی ایک کے پیرو اور اُن کے طے کردہ مسائلِ فقہ میں سے کسی ایک کے مقلد ہوتے ہیں۔ لیکن وہابی اُسے غیر ضروری سمجھتے ہیں۔ چنانچہ شاہ اسمٰعیل شہید نے بھی سفرِ حج کے بعد اپنے آپ کو غیر مقلد ظاہر کیا۔ مولوی عبدالحی اُن سے متفق نہ تھے۔ سید صاحب کے عقائد کے متعلق اختلافِ رائے ہے لیکن جہاد کے دوران میں جب مخالفین عام مسلمانوں کو سید صاحب کے عقائد کے بارے میں بہکانے لگے۔ اور انہوں نے مقام پنجتار مذہبی مسائل کی تشریح کے لئے افغان علماء کو بلایا اور شاہ اسمٰعیل صاحب نے بڑی قابلیت سے مسئلہ "عدم وجوب تقلید" کی حمایت کی۔ اُس وقت شاہ صاحب نے جو رائے دی وہ آبِ زر سے لکھنے کے قابل ہے۔ انہوں نے فرمایا کہ "یہ وقت ترکِ تقلید کا نہیں ہے۔ ہم کو اس وقت کفار سے جہاد کرنا ہے۔ تقلید کا جھگڑا اٹھا کر اپنے اندر تفرقہ ڈالنا بہتر نہیں۔ اس جھگڑے سے جس کی بنا ایک فروعی اختلاف سنت یا مستحب ہے۔ ہمارا اصلی کام ہجرت اور جہاد کا جو فرضِ عین ہے فوت ہو جائے گا۔"

سید صاحب کی وفات کے بعد دو جماعتوں نے اُن کا کام جاری رکھا۔ یعنی علمائے دیوبند اور طبقہ اہلحدیث نے۔ ان میں سے دیوبندی جماعت نے تقلیدِ شخصی کو قائم رکھا اور "فروعی اُمور میں امتیازی خصوصیت اختیار کر کے اپنا فرقہ الگ نہیں بنایا۔ مگر اصولی اصلاح یعنی محوِ شرک و بدعت اور اشاعت کتاب و سنت میں پوری جد و جہد سے کام لیا۔ یہاں تک کہ اپنی اسلامی خدمات کی بدولت ہندوستان کے جمہور مسلمانوں پر اُن کا اثر غالب آیا۔" دوسرا طبقہ یعنی "اہلحدیث حنفا کی جماعت ہے۔ جنہوں نے تقلید کا قلادہ توڑ کر پھینک دیا، اور کتاب و سنت کی ترویج اور شرک و بدعت کے مٹانے میں بلاخوف علماً و عملاً ایسی کوششیں کیں۔ کہ سارے ہندوستان میں ان کی روشنی پھیلی اور توحید کا منارہ بلند ہوا"[1]

اہلحدیث کی مرکزی جماعت "اہلحدیث کانفرنس امرتسر" ہے۔ اور اُس کے سرگرم کارکن مولوی ابوالوفا ثناء اللہ امرتسری ہیں۔ جنہوں نے آریہ سماج اور قادیانی جماعت کے ساتھ مباحثوں میں بڑا حصہ لیا ہے۔ اہلحدیث تقلید کے قائل نہیں۔ اور یہ نہیں مانتے کہ اجتہاد کا حق چار اماموں کے بعد کسی کو نہیں رہا۔ لیکن احادیث کے مطالعہ میں وہ بعض دفعہ قوتِ تنقیدی کو پوری طرح عمل میں نہیں لاتے اور ضعیف اور موضوعی احادیث کے رد کرنے میں بھی اکثر بڑا تامل کرتے ہیں اس کے علاوہ قرآن اور احادیث کی ترجمانی میں وہ لفظی معانی پر اتنا زور دیتے ہیں کہ اُن کے معانی کبھی کبھی عقل سلیم اور قرآن کے دوسرے بدیہہ الفاظ سے دور جا پڑتے ہیں۔ وہ تصوف کو بھی بدعت سمجھتے ہیں۔ اور اسکی مخالفت کرتے ہیں۔ وہ یہ نہیں سوچتے کہ اس کے صحیح استعمال یعنی سلوک "مجددیہ" یا "طریقۂ محمدیہ" جیسے سلسلے قائم کرنے سے اسلام کو روحانی اور اجتماعی فائدے پہنچ سکتے ہیں لیکن یہ صحیح ہے کہ اسلامی روایات کو برقرار رکھنے۔ دوسرے مذاہب کا مقابلہ کرنے اور اسلام کی ترقی اور مذہبی و معاشرتی اصلاح میں یہ جماعت سب سے آگے ہے۔ مسلمانوں کو فضول رسموں سے بچانے۔ بیاہ۔ شادی ختنے اور تجہیز و تکفین کی فضول خرچیوں سے روکنے اور پیر پرستی و قبر پرستی کے نقائص دور کرنے میں اس جماعت نے بڑا کام کیا ہے۔ یہ درست ہے کہ تعلیم یافتہ حضرات بھی اِن نقائص اور مُضر رسوم کو بُرا سمجھتے ہیں۔ لیکن انہیں

---

[1] مولانا محمد اسلم جیراج پوری

ٹینس۔ سینما اور تہذیبِ حاضر کی دوسری دلچسپیوں سے اتنی فرصت ہی نہیں ملتی کہ معاشرتی اصلاح کا ٹھوس اور محنت طلب کام اپنے ذمے لیں۔ اِس لئے یہ کام اکثر ان لوگوں کو کرنا پڑتا ہے جو تعلیم میں بھی بہت آگے نہیں اور کئی باتوں میں تنگ خیال بھی ہیں۔ بعض لوگ انہیں "چوبِ خشک" کہتے ہیں۔ لیکن اُن کے دل ایمان اور یقین کی دولت سے مالا مال ہیں اور وہ "امر بالمعروف ونہی عن المنکر" کے پابند ہیں۔ اُن کی کوششوں سے فضول اور مُضر رسوم اور خلافِ شرع عقائد جو ہندوستانی مسلمانوں میں بہت عام ہیں روز بروز کم ہو رہے ہیں۔ اگرچہ کامیابی کے لئے بہت زیادہ محنت درکار ہے لیکن ان کوششوں کی جس قدر تعریف کی جائے بجا ہے +
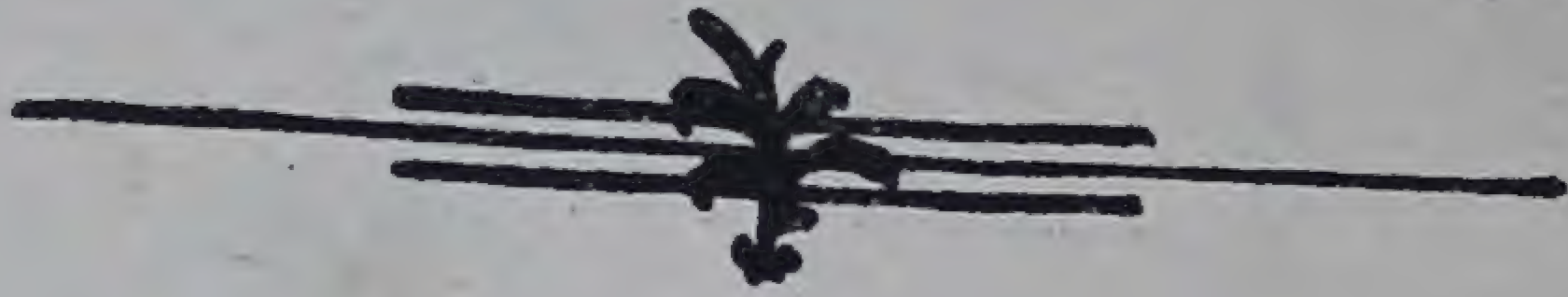
اربابِ تصوّف

اربابِ تصوّف

تاریخ داں حضرات جانتے ہیں کہ انیسویں صدی مسلمانانِ ہند کے لئے ابتلا و آزمائش کا زمانہ تھا۔ انکی سیاسی مشکلات انتہا کو پہنچ چکی تھیں اور اخلاقی و معاشرتی نقطۂ نظر سے بھی ان میں اصلاح کی ضرورت تھی۔ یہ قاعدہ ہے۔ کہ جب کسی قوم پر دَورِ انحطاط آتا ہے۔ اس وقت یا تو کوئی مصلح نمودار ہو جاتا ہے۔ جو اصلاحی جد وجہد کے کٹھن اور دشوار گزار رستے سے قوم کو پھر سلامتی کی طرف لے جائے یا عوام الناس ایک ایسے فلسفے کی تلاش کرتے ہیں۔ جو اُن کے دلوں سے زندگی کی تلخ حقیقتوں کو محو کر دے اور انحطاط کو انحطاط نہ سمجھنے دے۔ ہندوستان میں یہ دونوں صورتیں پیدا ہوئیں۔ حضرت سید احمد بریلوی اور سر سید احمد دہلوی نے قوم کو اصلاح و ترقی کا دشوار گذار راستہ دکھایا۔ لیکن جس طرح بغداد کی تباہی اور مسلمانوں کے سیاسی و ذہنی انحطاط کے زمانے میں تصوف نے اسلامی ممالک میں فروغ پایا۔ اسی طرح ہندوستان میں بھی انیسویں صدی میں تصوّف نے ایک بار پھر عروج حاصل کیا۔ اور اس آخری دور میں بھی کئی اولیاء نے شہرت پائی۔ جن کی زندگیاں بے عیب اور بے ریا تھیں۔ لیکن کم از کم عوام پر اُن کی تعلیم کا یہی اثر ہوتا تھا کہ وہ دنیا کو ایک سراب سمجھکر اور حاکم و محکوم اور کامیاب و ناکام کا فرق بے معنی خیال کر کے اپنے دل سے احساسِ زیاں کو بھلا دیتے اور زندگی کی تلخ حقیقتوں سے آنکھیں بند کر لیتے۔

اس دَور میں بعض فرقے تو ایسے شروع ہوئے جو بالکل خلافِ شرع تھے۔ مثلاً رسول شاہی فرقہ جس نے نواحِ دہلی میں بڑا فروغ حاصل کیا۔ لیکن بالعموم جن بزرگوں نے شہرت حاصل کی وہ متشرع اور عالم فاضل بزرگ تھے۔ شاہ ولی اللہ صاحب کے جاری کردہ چشمے سے فیضِ عام کی ندیاں رواں تھیں۔ اور شاہ عبدالعزیز صاحب کے درس اور حضرت سید احمد بریلوی کی اصلاحی کوششوں سے خلافِ شرع بدعتوں نے عام مسلمانوں کو مسخر نہیں

کیا۔ یہ بزرگ عموماً علم حدیث۔ تفسیر اور تصوّف کے فاضل تھے۔ دنیاوی طمع سے بالکل آزاد۔ ان کی اپنی زندگیاں لوگوں کے لئے مشعلِ ہدایت تھیں۔ لیکن انہوں نے طریقت کو شریعت پر ترجیح دی تھی۔ مدرسہ و مسجد چھوڑ کر خانقاہ کو اختیار کیا تھا۔ اس لئے تصوّف کی پیچیدگیوں سے وہ بھی بالاتر نہ تھے ؛

ان بزرگوں میں سے ایک قابلِ ذکر ہستی خواجہ محمد سلیمان تونسوی تھے۔ آپ ۱۱۸۴ھ (۱۷۷۰ء) میں بمقام گڈ گوبی پیدا ہوئے جو آپ کے مزار واقع تونسہ سے تین کوس کے فاصلے پر ہے۔ خواجہ نور محمد مہاروی کے ہاتھ پر بیعت کی۔ اور پھر طلبِ علم اور حصولِ فیض کی خاطر دہلی۔ اجمیر۔ جے پور جابجا پھرتے رہے۔ جب خواجہ نور محمد صاحب وفات پانے لگے۔ تو انہوں نے آپ کو خلیفہ مقرر کیا۔ نواب محمد بہاول خان عباسی کو آپ سے بڑی عقیدت تھی اور جب ۱۸۵۰ء میں آپ نے وفات پائی تو ریاست بہاولپور کی طرف سے ستّر ہزار روپے کی لاگت سے ایک عالی شان روضہ آپ کے مزار پر تعمیر کیا۔ مغربی پنجاب میں جہاں لوگ پیروں کے بہت قائل ہیں۔ آپ کے بے شمار معتقد ہیں۔ تذکرہ نویسوں نے آپ کے بہت سے خرقِ عادت واقعات کا ذکر کیا ہے۔ لیکن آپ کا اثر زیادہ تر ماسواء اللہ سے بے نیازی اور زہد و اتقا کی وجہ سے تھا۔ مزار تونسہ شریف میں مرجعِ خلائق ہے ؛

اس عہد کے دوسرے بزرگ حضرت شاہ فضل الرحمٰن صاحب گنج مرادآبادی ۱۲۱۳ھ (۱۷۹۰ء) میں قصبہ ملانواں ضلع ہردوئی ملک اودھ میں پیدا ہوئے۔ بچپن ہی میں شفقتِ پدری سے محروم ہو گئے۔ لیکن تحصیلِ علم کا شوق آپ کو دہلی لے گیا۔ جہاں آپ نے شاہ عبدالعزیزؒ اور شاہ محمد اسحٰق صاحب سے حدیث کا علم حاصل کیا۔ علومِ ظاہری کی تکمیل کے بعد "سلسلۂ نقشبندیہ" میں شاہ محمد آفاق صاحب کے مرید ہوئے۔ اور انہی سے سندِ خلافت پائی۔ تحصیلِ علوم سے فارغ ہو کر ملانواں واپس گئے۔ اور کچھ عرصہ بعد ترک وطن کر کے گنج مرادآباد تشریف لے گئے۔ جہاں آپ نے ترویجِ سنت اور ردِ بدعت میں کوشش شروع کی۔ اس زمانے میں یہاں مساجد کے اندر تعزیے رکھے جاتے تھے اور نماز باجماعت کا کوئی انتظام نہ تھا۔ آپ نے تعزیے مساجد سے نکال کر رکھدئے اور نماز کا باقاعدہ انتظام شروع کیا۔ مخالفوں نے نواب واجد علی شاہ کے دربار میں آپ کی شکایت کی اور وہاں سے آپ کی طلبی ہوئی۔ لیکن ایک حاکم حاضر دربار نے آپ کی سفارش کی۔

اور آپ کو واپس آنے کی اجازت مِل گئی۔ واپس آکر آپ نے امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا کام پُورے زور شور سے جاری رکھا۔ قرآن۔ تفسیر اور حدیث کا اکثر درس دیتے تھے۔ آپ کا طرزِ زندگی بہت سادہ تھا۔ اور پابندیٔ شرع کا بہت خیال رکھتے تھے۔ آپ کے بہت سے مکاشفات بیان کئے جاتے ہیں۔ لیکن آپ کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ آپ کا اخلاق حسب سنتِ نبویؐ نہایت وسیع تھا۔ مدت العمر میں کسی کو آپ سے رنج یا کلفت نہیں پہنچی۔ آپ دورِ آخر کے بہترین مشائخ میں سے تھے۔ طبیعت میں استغنا بے حد تھا۔ اگر کوئی حاجتمند آپ کے پاس آتا تو آپ حتی الامکان ہر طرح سے اس کی امداد کرتے۔ ۱۸۹۵ء میں انتقال ہُوا۔ ہر سال ربیع الاول کی بائیسویں تاریخ کو گنج مرادآباد میں آپ کا عُرس ہوتا ہے۔

اِن دونوں بزرگوں کے علاوہ انیسویں صدی میں اور بھی کئی بزرگ ہوئے۔ جنہیں ان کے معاصرین نے بڑی عقیدت کی نظر سے دیکھا۔ اُن میں سب سے دلچسپ ہستی غالباً شاہ غوث علی قلندر رہیں۔ جن کا مزار پانی پت میں مرجع خاص و عام ہے اور جن کی علمیت۔ روشن خیالی اور عظیم المرتبت شخصیت کی تصویر اُن کے خلیفہ ثانی مولانا گل حسن نے "تذکرۂ غوثیہ" میں بڑی قابلیت سے کھینچی ہے۔ آپ کے حالات پر کرامات اور معجزات کا وہ غلاف نہیں چڑھا جس نے بعض دوسرے بزرگوں کو عوام الناس میں بڑی شہرت دے رکھی ہے۔ شرع و تصوّف کی معلومات۔ رواداری۔ آزاد خیالی اور نکتہ سنجی میں وہ ہندوستان کے بلند ترین صوفیہ کے دوش بدوش ہیں۔ اور ان کا تذکرہ اردو زبان میں صوفیانہ خیالات و خطبات کا بہترین ادبی مرقع ہے۔

آپ ۷ دسمبر ۱۸۰۴ء کو صوبہ بہار میں مونگیر کے نزدیک موضع استھاوان میں پیدا ہوئے۔ خاندانی سلسلہ مخدوم شیخ محمد الحسنی جیلانی کے واسطے سے حضرت غوث الاعظم قدس سرہٗ تک پہنچتا ہے۔ تصوّف گویا آپ کی وراثت میں تھا۔ آپ کی والدہ ماجدہ کو ایک قسم کا جنون تھا۔ اس لئے اُن کا دودھ آپ کو نہ پلایا گیا۔ اور ایک برہمن رام سیتھانی کی بیوی کو آپ کی رضاعی والدہ بننے کا شرف حاصل ہوا۔ تعلیم کے متعلق آپ نے خود ایک دفعہ بعد میں ارشاد کیا۔ "کہ جب ہم چار برس چار مہینے کے ہوئے تو بڑی والدہ صاحبہ نے بسم اللہ پڑھکر قرآن شریف شروع کیا۔ اور پنڈت رام سیتھانی صاحب نے جو پدر رضاعی تھے

نرنکار کا نام لے کر شاستر کا آرنبھ (آغاز) کیا۔ دس برس کی عمر میں قرآن شریف نصف حفظ کر لیا اور نصف ناظرہ پڑھا۔ کتب فارسی بھی تا "سکندر نامہ" بڑی والدہ صاحبہ سے پڑھیں اور سنسکرت "سہارت سدھ چندر کا" تک پنڈت جی سے حاصل کی اور عربی کی صرف نانا محمد حیات سے پڑھی۔ بعد چند مدت کے ہمارے والد ماجد نے اپنے پاس دہلی بلا لیا۔ یہاں مولوی محمد اسمٰعیل صاحب سے ایک سبق "کافیہ" کا اور مولوی شاہ اسحاق صاحب اور مولٰنا شاہ عبد العزیز صاحب سے حدیث شریف پڑھی۔ باقی کتابیں مولوی فضل امام صاحب خیر آبادی سے پڑھیں"۔

جس طرح ظاہری تعلیم میں آپ نے سنسکرت اور عربی کو ساتھ ساتھ پڑھا۔ اسی طرح باطنی تعلیم میں بھی کوئی امتیاز نہ رکھا۔ آپ نے انیس بزرگوں سے بیعت کی۔ جن میں سے گیارہ مسلمان تھے اور آٹھ ہندو تعلیم کے بعد آپ نے آزادانہ حصولِ فیض کی خاطر پھرنا شروع کیا۔ دو مرتبہ حج کو تشریف لے گئے۔ ہندوستان کے اکثر برگزیدہ معاصرین سے ملے۔ اور بالآخر ۱۸۶۲ء میں پانی پت آ مقیم ہوئے۔ اور یہیں ۱۸۸۰ء میں وفات پائی۔

آپ کا قاعدہ تھا کہ چاشت و اشراق کی نماز کے بعد حجرے میں تشریف لاتے اور جو کوئی حاضر ہوتا۔ اس کے سوالات کا جواب دیتے اور "نقول و حکایات و لطائف و نکات۔ اشعار و امثال مطابق ہر موقعہ اور مناسب ہر حال" ارشاد فرماتے۔ مولٰنا گل حسن کے طرزِ تحریر سے یہ کتاب تصوف۔ شعر و شاعری۔ اخلاق اور شاہ صاحب کے معاصرانہ حالات کا ایک قیمتی خزانہ بن گئی ہے۔

شاہ غوث علیؒ خود پیر تھے۔ بیعت کراتے تھے۔ لیکن اپنے زمانے کے پیروں کی خامیوں سے خوب واقف تھے اور اس کے متعلق اپنے خیالات کے اظہار سے گریز نہ کرتے تھے۔ مثلاً عام پیروں کی علمی کوتاہیوں پر آپ نے نہایت موثر طریقے سے کئی جگہ اظہارِ خیال کیا ہے۔ ایک روز آپ نے ارشاد کیا کہ "اگلے زمانے میں اکثر لوگ تحصیلِ علم کے بعد فقیری اختیار کرتے تھے۔ اب وہ زمانہ ہے کہ علم ہو یا نہ ہو مرید ہوتے ہی فقیری کا دم بھرنے لگتے ہیں۔ اور خیال کرتے ہیں کہ جو فقیر ہوتا ہے اس کو علم بھی حاصل ہو جاتا ہے۔ بلکہ علما پر زبان طعن و تشنیع دراز کرتے ہیں کہ ان کو تفسیر و حدیث کے معنی نہیں آتے اور ہم کو اللہ تعالےٰ نے علم لدنی عطا

علی گڑھ

فرمایا ہے۔ اس طرح سے جاہلوں میں بیٹھ کر اپنی تعریف کرتے اور عجیب و غریب معنی گھڑتے ہیں۔ چنانچہ نقل ہے۔ کہ ایک مرید نے اپنے پیر سے پوچھا کہ حضرت اٰمَنْتُ بِاللّٰہِ کے کیا معنی ہیں جواب دیا۔ میاں یہ بات خلوت میں بتانے کی ہے۔ اس میں بڑا راز ہے۔ عالموں کو ان معنی (معانی) کی خبر نہیں۔ زنہار کسی کے سامنے بیان نہ کرنا ورنہ پھانسی دئے جاؤ گے۔ علماء نے بہت فقیروں کو قتل کروایا۔ تم نے سنا نہیں کہ شاہ منصور کو ملاؤں نے دار پر کھینچ دیا تھا۔ انہوں نے اُسی اٰمَنْتُ بِاللّٰہِ کے معنی ظاہر کر دئے تھے۔ لو سنو! معنی یہ ہیں۔ اٰمَنْتُ بِاللّٰہِ۔ اللہ میاں کے ایک بلا تھا۔ وملٰئِکَتِہٖ اور ملائی کھا جاتا تھا۔ وکُتُبِہٖ اسکے پیچھے کتے لگا دئے۔ ورُسُلِہٖ اور اس کو رسی سے باندھ دیا۔ والیومِ الاٰخِر اور اس پر قیامت ہو گی والقدرِ خیرہٖ من اللہ تعالیٰ اور اپنے کئے کی سزا کو پہنچ گیا۔ اور یاد رکھو کہ فقیر آخر کو یہی بھید مرید کے کان میں کہدیتے ہیں اور وہ کامل ہو جاتا ہے۔ پیر خلافت دے کر اس کو روانہ کرتے ہیں۔ سو آج سے تو بھی خلیفہ ہو گیا۔ واہ سبحان اللہ کیا تعلیم اور کیا فقیر۔ بس آج کل ایسی فقیری اور یہ پیری مریدی ہے جس نے علما کو زیادہ بُرا بھلا کہا۔ وہی فقیر کامل ہے!"

شاہ صاحب نے شاہ عبدالعزیز صاحب اور مولوی فضلِ امام جیسے بزرگوں کے زیرِ سایہ تعلیم پائی تھی شرع کا خیال آپ کو بدرجۂ نہایت تھا۔ اس لئے اولیاء اور قبور کے متعلق بعض اربابِ تصوف جو غلو کرتے ہیں اس سے آپ کو بہت نفرت تھی۔ مثلاً تصورِ مرشد جو بعض صوفیہ کے نزدیک باطنی تعلیم کا اہم مرحلہ ہے اور جس کے جواز میں سید صاحب نے بھی ایک رسالہ لکھا ہے۔ اُسے آپ خلافِ اسلام سمجھتے تھے۔ "تذکرۂ غوثیہ" میں لکھا ہے۔

"ایک روز کسی شخص نے تصورِ شیخ کے باب میں سوال کیا۔ آپ نے فرمایا۔ کہ ہمارے نزدیک تو شرک ہے۔ اور ابتدائے بُت پرستی بھی اس سے ہوتی ہے۔" اسی طرح آپ قبور کو سجدہ کرنے کے سخت مخالف تھے۔

"تذکرۂ غوثیہ" میں آپ کا ارشاد درج ہے۔ کہ "جب ہم کرنت پور میں گئے۔ تو دیکھا کہ صبحدم آن کر سجادہ نشین صاحب نے حضرت احمد شاہ کے مزار کا طواف و سجدہ کیا۔ ہم نے کہا کہ صاحب طواف و سجدہ تو یہاں ادا ہوا۔ اگر حضرت غوث الاعظمؒ کے مزار پر آپ ہوں تو وہاں کیا کیجئے گا۔ اور حضرت رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کے لئے کیا باقی رکھا۔ اور خدا سے تو کچھ مطلب ہی نہیں جس کے لئے کچھ ادب و تعظیم درکار ہو۔ وہ خفا ہو گئے۔

اور بولے میاں طالب علم جھجھک ہوتے ہیں۔ اس واسطے ان کو فیض حاصل نہیں ہوتا۔ ہم نے کہا کہ صاحب ایسے فیض کو ہمارا سلام ہے۔ کہ جس کے لئے خدا کو چھوڑ کر دوسرے کے سامنے سر جھکائیں۔ اور توحید سے نکل کر شرک میں مبتلا ہوں"۔

یہ قطعہ اکثر شاہ صاحب کی زبان پر ہوتا تھا ؎

تاکے بہ زیارتِ مقابر عمرے گزرانی اے فسردہ!

یک گریۂ زندہ پیش عارف بہتر ز ہزار شترِ مُردہ!

اِسی طرح محرم کے موقعے پر آئمۂ محترم کی شان میں جو غلو ہوتا ہے۔ اُسے آپ نے ایک نہایت پُر معنی اور پُر لطف مثال سے واضح کیا ہے۔ "ایک روز ارشاد ہوا۔ کہ شہر لکھنؤ میں ایک سنی حضرات شیعہ کی محفل میں جا پہنچا اور کہا کہ رات میں نے عجیب و غریب خواب دیکھا ہے۔ کہ زبان کو یارائے بیان نہیں۔ تمام اہل محفل مشتاق ہوئے کہ قبلہ کچھ تو فرمائیے۔ اس نے کہا رات میں کیا دیکھتا ہوں کہ ایک سواری نہایت شان و تجمل اور دھوم دھام سے چلی آتی ہے۔ ایک زرق برق لشکر ہمراہ ہے۔ ہاتھی گھوڑے اُونٹ ہر طرح کے ساز و ساماں سے آراستہ و پیراستہ ہیں۔ لشکر کے جھنڈوں پہ زرد زری پھریرے اُڑتے ہیں۔ میں نے دریافت کیا۔ تو معلوم ہوا۔ کہ حضرت امام حسین علیہ السلام سید الشہدا شہید کربلا کی سواری ہے۔ اس کے بعد ایک اور سواری نمودار ہوئی۔ ساز و سامان تو سب کچھ تھا مگر پہلی سواری سی کر و فر اور زینت و آرائش نہ تھی۔ معلوم ہوا کہ یہ سواری حضرت امام حسن علیہ السلام کی ہے۔ اس کے بعد ایک تیسری سواری نمودار ہوئی۔ صرف سوار اور پیادہ ہمراہ تھے۔ اور کوئی بات شان و شوکت کی نہ تھی۔ سنا کہ یہ حضرت علی مرتضےٰ شیرِ خدا تشریف لئے جاتے ہیں۔ اس کے پیچھے ایک اور گرد اٹھی اس میں سے ایک بزرگ مع چند سواروں کے ظاہر ہوئے۔ جن کے گھوڑے بے سر و سامان اور دُبلے پتلے تھے۔ سنا کہ یہ حضرت محمد مصطفےٰ رسولِ خدا ہیں۔ میں یہ کیفیت دیکھ رہا تھا۔ کہ دور سے ایک ٹٹو نظر آیا۔ اس پر ایک پیر کہن سال سر جھکائے بڑی افسردگی کی حالت میں بیٹھے ہیں۔ نہ تو ٹٹو کا چار جامہ درست۔ نہ پوری دُمچی سلامت۔ ایک رکاب اُونچی۔ ایک نیچی۔ قدم رکھتا کہیں ہے۔ پڑتا کہیں ہے۔ بڑے میاں کے کپڑے بھی

میلے کچیلے۔ پاؤں میں بھدی سی جوتیاں۔ نہ کوئی خدمتگار ہے نہ سائیس۔ میں نے بعد آداب اُن سے پوچھا۔ کہ
حضرت آپ کون ہیں۔ اُنہوں نے فرمایا کہ میرے بندے! خالقِ موجودات۔ مُوجدِ کائنات میں ہی تو ہوں۔
تم لوگ نہ میری خبر لیتے ہو۔ نہ میرے نام پہ کوڑی دیتے ہو۔ رسولؐ کی فاتحہ بھی سال میں کہیں کہیں ہو جاتی
ہے۔ علیؓ کے نام پر بھی محبانِ علیؓ کسی قدر خیرات کرتے ہیں۔ حسنؓ کی محفلیں بھی کم و بیش ہوتی ہیں۔ حسینؓ کے
تو بڑے بڑے امام باڑے اور لنگر خانے جاری ہیں۔ اُن سب کے پاس ساز و سامان بہت کچھ ہیں۔ ہمارے
پاس کیا خاک ہو۔ ہم کو تو کوئی بھی نہیں پُوچھتا۔ اتنے میں آنکھ کھُل گئی۔ یہ بات شیعہ لوگ سُن کر بہت
خفا ہوئے اور کہا کہ میاں تم کیسے بہتان باندھتے ہو۔ اور جھوٹے خواب بیان کرتے ہو۔ اُس نے کہا
حضرت آپ کے نزدیک تو امام حسینؑ کے مقابلے میں خدا کچھ چیز ہی نہیں۔ آپ صاحبوں کو کبھی خدا کا نام
لیتے نہ سُنا۔"

شاہ صاحب کے ارشادات سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ وہ اس حقیقت سے خوب واقف تھے۔ کہ ولی یا
پیر کی بزرگی کرامات اور خرقِ عادت واقعات میں نہیں۔ بلکہ اخلاقِ نبوی کی پیروی میں ہے۔ چنانچہ جب
کسی شخص نے شاہ صاحب کے ایک مُرید سے استفسار کیا" کہ تم کو جناب مولوی غوث علی شاہ صاحب
کی خدمت میں حاضر ہوتے ہوئے عرصہ گزرا ہے۔ بھلا اُن کی کوئی کشف و کرامت بھی دیکھی۔" تو اس سوال
کا جواب دینے کے لئے شاہ صاحب نے جو تمثیل بیان کی وہ نہایت پُر معنی ہے۔ آپ نے فرمایا" کہ
ابوبکر واسطی جو بڑے عالم تھے۔ حضرت جنیدؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور سال بھر تک ساکت و خاموش
وہاں کی صحبت کا رنگ ڈھنگ دیکھتے رہے۔ جب کوئی کشف و کرامت حضرت جنیدؒ کی جو پابند شرع تھے
نہ دیکھی تو دل برداشتہ ہو کر حضرت سے رخصت چاہی۔ آپ نے اُن کا ہاتھ پکڑ لیا اور فرمایا کہ بھلا مولوی صاحب
آپ برس دن یہاں رہے نہ اپنی کہی نہ ہماری سُنی یہ بات ہے تو کیا ہے۔ اس وقت موقع پا کر ابوبکر واسطی
نے عرض کیا کہ حقیقت میں بات تو یہ ہے کہ میں بیعت کے ارادے سے حاضر ہوا تھا۔ سال بھر رہ کر دیکھا
گیا۔ مگر آپ سے کوئی کشف و کرامت ظاہر نہیں ہوئی۔ وہی عالموں کا سا طور طریق ہے نماز۔ روزہ۔ تہجد
واشراق چاشت۔ درس و تدریس۔ جب آپ میں اور عالموں سے کوئی فوقیت نہیں پائی۔ ناچار اجازت

چاہی۔ حضرت نے یہ سُن کر فرمایا۔ کہ بھلا اس سال بھر میں کوئی امر خلاف سنت رسول اللہ بھی سرزد ہوا۔ ابوبکر نے جواب دیا۔ کہ نہیں۔ اس وقت حضرت نے اُن کا ہاتھ جھٹک کر فرمایا کہ جا جنید کی یہی کرامت ہے!"
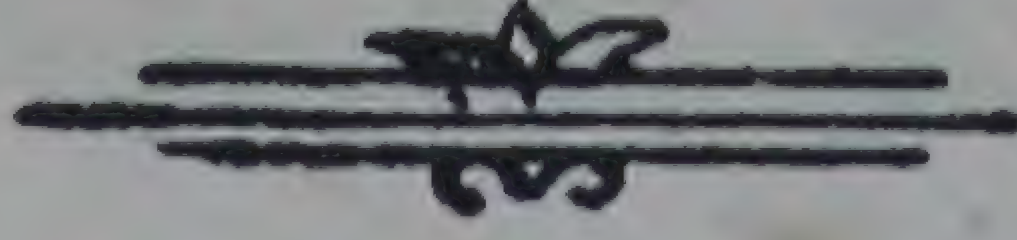
علیگڑھ

عام حالات

ابھی تک ہم نے جن حالات کا ذکر کیا ہے۔ وہ بیشتر اس زمانے میں رُونما ہوئے جب مسلمانوں کی حکومت ابھی باقی تھی۔ اُن کے اقتدار کی بنیادیں کھوکھلی ہو چکی تھیں۔ لیکن ابھی تک ہنگامۂ غدر کی طرح کوئی کاری ضرب نہ لگی تھی۔ اور اگرچہ وہ کمزور اور ضعیف ہو گئے تھے۔ لیکن بے جان نہ تھے اب ہم ان لوگوں کا ذکر کرتے ہیں۔ جنہیں زیادہ مایوس کن اور تکلیف دہ حالات سے سابقہ پڑا۔ اس زمانے میں اسلامی حکومت کا چراغ گل ہوا۔ اور مسلمانوں کا تنزّل جو ۱۷۱۹ء میں شروع ہوا تھا ۱۸۵۷ء میں انتہا کو پہنچ گیا۔ آہستہ آہستہ تمام ملک اُن کے ہاتھ سے نکل گیا تھا۔ پلاسی کی لڑائی ۱۷۵۷ء میں ہوئی تھی۔ اور اگرچہ اس کے بعد میر جعفر بنگال کا صوبہ دار مقرر ہوا۔ لیکن وہ "مردہ بدستِ زندہ" تھا صحیح حکمران "کمپنی بہادر" ہی تھی۔ پنجاب میں ۱۷۹۹ء میں شاہ زمان والیٔ کابل رنجیت سنگھ کو اپنا صوبیدار مقرر کر گیا تھا۔ لیکن رنجیت سنگھ خود مختار ہو گیا۔ ۱۸۱۸ء میں اُس نے ملتان فتح کیا۔ جہاں نواب مظفر خان بہادری سے مقابلہ کرتے ہوئے کام آیا۔ اس سے اگلے سال کشمیر مسلمانوں کے قبضے سے نکل گیا اور رنجیت سنگھ نے آہستہ آہستہ پشاور پر اقتدار بڑھانا شروع کیا۔ سندھ ۱۸۴۳ء میں اور اودھ ۱۸۵۶ء میں کمپنی نے ملحق کر لیا۔ اس کے بعد بھی اگر مسلمانوں کا کوئی سیاسی اقتدار باقی تھا۔ تو اُسے غدر کے ہنگامے نے مٹا دیا۔

اس سیاسی انقلاب کے علاوہ جو انحطاط مسلمانوں کی معاشرتی اور تمدنی زندگی میں ہوا۔ وہ اس سے بھی زیادہ اہم تھا۔ اس کی صحیح اور مفصل تصویر ڈاکٹر سر ولیم ہنٹر نے اپنی کتاب " اور انڈین مسلمانز" (ہمارے ہندوستانی مسلمان) میں کھینچی ہے۔ اور چونکہ سر سید احمد خان کی کوششوں کا صحیح اندازہ اسوقت

تک نہیں ہو سکتا۔ جب تک مسلمانوں کی غدر کے بعد کی حالت معلوم نہ ہو۔ اِس لئے ہم اس کتاب سے کسی قدر طویل اقتباسات دے کر اس زمانے کے حالات واضح کرتے ہیں:۔

یہ کتاب ڈاکٹر ہنٹر نے لارڈ میو کے ایما پر ۱۸۷۱ء میں لکھی تھی۔ اس زمانے میں سرحد پر شورش جاری تھی۔ اور ہندوستان سے بھی بعض وہابی مسلمان روپیہ اور آدمی سرحد پر بھیجتے تھے۔ لارڈ میو نے جنہیں مسلمانوں کی تعلیم سے خاص دلچسپی تھی۔ اس بات کی وجہ معلوم کرنی چاہی کہ مسلمان حکومت سے کیوں بددل ہیں۔ اور انکی تسکین کیلئے کیا کچھ کیا جا سکتا ہے۔ اس مسئلے کی توضیح کے لئے ڈاکٹر سر ولیم ہنٹر نے یہ کتاب لکھی۔ کتاب کے چوتھے باب میں انہوں نے مسلمانوں کی اقتصادی حالت اور مشکلات پر بحث کی ہے۔ اس میں وہ لکھتے ہیں کہ مسلمانوں کو حکومت سے بہت سی شکایات ہیں۔ ایک شکایت یہ ہے کہ حکومت نے ان کے لئے تمام اہم عہدوں کا دروازہ بند کر دیا ہے۔ دوسرا ایک ایسا طریقۂ تعلیم جاری کیا ہے۔ جس میں ان کی قوم کے لئے کوئی انتظام نہیں۔ تیسرے قاضیوں کی موقوفی سے ہزاروں خاندانوں کو جو فقہ اور اسلامی علوم کے پاسبان تھے۔ بیکار اور محتاج کر دیا ہے۔ چوتھی شکایت یہ ہے کہ اُن کے اوقاف کی آمدنی۔ جو ان کی تعلیم پر خرچ ہونی چاہئے تھی۔ غلط مصرفوں پر خرچ ہو رہی ہے۔ ڈاکٹر ہنٹر نے ان شکایات پر بالتفصیل بحث کی ہے۔ اور مسلمانوں کی حالتِ زار کا نقشہ کھینچا ہے۔ بالخصوص مشرقی بنگال کے خاندانی مسلمانوں کی پستی اور افلاس کی یہ حالت تھی کہ ڈاکٹر ہنٹر لکھتے ہیں۔ "اگر کوئی سیاست دان دارالعوام میں سنسنی پیدا کرنا چاہے تو اس کے لئے کافی ہے کہ وہ بنگال کے مسلمان خاندانوں کے سچے سچے حالات بیان کر دے"۔ یہی لوگ کبھی زمانے میں محلوں میں رہتے تھے۔ گھوڑے گاڑیاں نوکر چاکر موجود تھے۔ اب یہ حالت ہے کہ "اُن کے گھروں میں جوان بیٹے اور بیٹیاں۔ پوتے اور پوتیاں۔ بھتیجے اور بھتیجیاں بھرے پڑے ہیں۔ اور ان بھوکوں کے لئے اُن میں سے کسی ایک کو بھی زندگی میں کچھ کرنے کا موقع نہیں۔ وہ منہدم اور مرمت شدہ مکانوں اور خستہ برآمدوں میں قابلِ رحم زندگی کے دن کاٹ رہے ہیں۔ اور روز بروز قرض کی دلدل میں زیادہ دھنستے جاتے ہیں حتیٰ کہ کوئی ہمسایہ ہندو قرضخواہ اُن پر نالش کرتا ہے اور مکان اور زمینیں جو باقی تھیں اُن کے قبضے سے نکل جاتی ہیں۔ اور یہ قدیمی مسلمان خاندان ہمیشہ کے لئے ختم ہو جاتا ہے"۔

اس کے بعد ڈاکٹر ہنٹر سرکاری ملازمتوں میں مسلمانوں کے تناسب کا مقابلہ دوسری قوموں کے ساتھ کرتے ہیں۔ پہلے مال اور منصفی کے محکموں میں مسلمانوں کی حالتِ زار بتاتی ہے۔ اس کے بعد لکھتے ہیں "لیکن مسلمانوں کی بدقسمتی کا صحیح نقشہ ان محکموں میں دیکھا جاسکتا ہے۔ جن میں ملازمتوں کی تقسیم پر لوگوں کی اتنی نظر نہیں ہوتی۔ ۱۸۶۹ء میں ان محکموں کا یہ حال تھا۔ کہ اسسٹنٹ انجینئروں کے تین درجوں میں چودہ ہندو اور مسلمان صفر۔ امیدواروں میں چار ہندو۔ دو انگریز اور مسلمان صفر۔ سب انجینئروں اور سپروائزروں میں چوبیس ہندو اور ایک مسلمان۔ اوورسیروں میں تریسٹھ ہندو اور دو مسلمان اکاؤنٹس ڈیپارٹمنٹ میں پچاس ہندو اور مسلمان معدوم وغیرہ!"

سرکاری ملازمتوں کے علاوہ ہائی کورٹ کے وکیلوں کی فہرست بڑی عبرت آموز ہے۔ ایک زمانہ تھا۔ کہ یہ پیشہ سارا مسلمانوں کے ہاتھ میں تھا۔ اس کے بعد بھی ۱۸۵۱ء تک مسلمانوں کی حالت اچھی تھی اور مسلمان وکلا کی تعداد ہندوؤں اور انگریزوں کی مجموعی تعداد سے کم نہ تھی۔ لیکن ۱۸۵۱ء سے تبدیلی شروع ہوئی۔ اب نئی طرز کے آدمی آنے شروع ہوئے اور امتحانات کا طریقہ بھی تبدیل کر دیا گیا۔ ۱۸۵۲ء سے ۱۸۶۸ء تک جن ہندوستانیوں کو لائسنس دیا گیا۔ ان میں ۲۳۹ ہندو تھے۔ اور ایک مسلمان!"

ڈاکٹر ہنٹر لکھتے ہیں "اگلے دن ایک بڑے سرکاری محکمے میں دیکھا گیا۔ کہ سارے محکمے میں ایک بھی اہلکار ایسا نہ تھا۔ جو مسلمانی[1] زبان سے واقف ہو۔ اور حقیقتاً اب کلکتے میں شاید ہی کوئی سرکاری دفتر ایسا ہوگا۔ جس میں کسی مسلمان کو دربان۔ چپراسی یا دواتیں بھرنے۔ قلم درست کرنے کی نوکری سے زیادہ کچھ ملنے کی امید ہو سکتی ہے۔"

چنانچہ انہوں نے کلکتے کے ایک اخبار کی ایک شکایت نقل کی ہے۔ "تمام ملازمتیں اعلیٰ ہوں یا ادنےٰ۔ آہستہ آہستہ مسلمانوں سے چھینی جارہی ہیں۔ اور دوسری قوموں بالخصوص ہندوؤں کو بخشی جارہی ہیں۔ حکومت کا فرض ہے کہ رعیت کے تمام طبقوں کو ایک نظر سے دیکھے۔ لیکن اب یہ حالت ہے کہ اپنے گزٹ میں مسلمانوں کو

---

[1] بنگال کے مسلمان جو زبان بولتے ہیں۔ وہ عام بنگالی سے اس قدر مختلف ہے۔ کہ اسے ایک علیحدہ نام "مسلمانی" سے یاد کیا جاتا ہے۔

سرکاری ملازمتوں سے علیحدہ رکھنے کا کھلم کھلا اعلان کرتی ہے۔ چند دن ہوئے کمشنر کے دفتر میں کئی آسامیاں خالی ہوئیں۔ سرکاری گزٹ میں ان کا اشتہار دیتے ہوئے کمشنر صاحب نے تصریح کر دی کہ یہ ملازمتیں ہندوؤں کے سوا کسی کو نہیں ملیں گی"۔

ڈاکٹر ہنٹر لکھتے ہیں "جب ملک ہمارے قبضے میں آیا۔ تو مسلمان سب قوموں سے بہتر تھے۔ نہ صرف وہ دوسروں سے زیادہ بہادر اور جسمانی حیثیت سے زیادہ توانا اور مضبوط تھے۔ بلکہ سیاسی اور انتظامی قابلیت کا ملکہ بھی اُن میں زیادہ تھا۔ لیکن یہی مسلمان آج سرکاری ملازمتوں اور غیر سرکاری کاموں سے یکساں محروم ہیں"۔

ڈاکٹر ہنٹر کی کتاب بڑی مفصل ہے۔ اس کے مندرجہ بالا اقتباسات ہی سے ظاہر ہے۔ کہ ۱۸۷۰ء کے قریب دوسری قوموں کے مقابلے میں مسلمانوں کی کیا حالت تھی۔ ملازمتوں میں وہ نہ ہونے کے برابر تھے۔ اور چونکہ سرکاری ملازموں کے ہاتھ میں کئی طرح کا اختیار بھی ہوتا ہے۔ اس لئے یہ کمی انہیں بہت مہنگی پڑی۔ شمالی ہندوستان کے مسلمانوں نے تجارت میں کبھی امتیاز حاصل نہیں کیا۔ اور زمینیں قرضے کی وجہ سے اُن کے ہاتھ سے نکلی جا رہی تھیں۔

ڈاکٹر ہنٹر نے جو حالات لکھے ہیں۔ وہ زیادہ تر بنگال کے متعلق ہیں۔ لیکن شمالی ہندوستان میں مسلمانوں کی حالت اس سے بہتر نہ تھی۔ بالخصوص غدر کے بعد تو اُن کی حالت اتنی خراب ہو گئی تھی۔ کہ سرسید نے خود ہندوستان چھوڑ کر مصر میں سکونت اختیار کرنے کا ارادہ کیا۔ انہوں نے بعد میں ایک لیکچر میں کہا "میں اس وقت ہرگز نہیں سمجھتا تھا کہ قوم پھر بنے گی اور عزت پائے گی۔ اور جو حال اس وقت قوم کا تھا۔ مجھ سے دیکھا نہیں جاتا تھا"۔ ان دو فقروں سے قوم کی زبوں حالی کا اندازہ ہو سکتا ہے لیکن خدا کا شکر ہے۔ کہ سرسید نے ہجرت کا ارادہ ترک کر دیا۔ اور فیصلہ کیا کہ "نہایت نامردی اور بے مروتی کی بات ہے۔ کہ اپنی قوم کو اس تباہی کی حالت میں چھوڑ کر خود کسی گوشہ عافیت میں جا بیٹھوں۔ نہیں اس کی مصیبت میں شریک رہنا چاہئیے۔ اور جو مصیبت پڑے اس کے دور کرنے میں ہمت باندھی قومی فرض ہے"۔

مسلمانوں کے مصائب اگر تمامتر اقتصادی ہوتے۔ تب بھی اُن کا حل آسان نہ تھا۔ لیکن اس زمانے میں انہیں جو نئے مسائل پیش آ رہے تھے۔ وہ زندگی کے ہر شعبے کے متعلق تھے۔ مذہبی تعلیمی۔ اقتصادی اور

ذہنی پستی کی اصلاح کے لئے ضروری تھا کہ مسلمان انگریزی تعلیم حاصل کریں۔ اور وہ اس سے بدکتے تھے۔
اب تک اُن کی ادبی زبان فارسی تھی۔ لیکن اس زبان کا مستقبل تاریک تھا اور اردو میں غزل گو شعراء کے
دواوین کے سوا کوئی قابل ذکر لٹریچر نہ تھا۔ نثر میں چند گنتی کی کتابیں تھیں۔ اور ابھی اس میں علمی مسائل پیش
کرنے کی صلاحیت نہ آئی تھی۔ اردو شاعری بھی نقائص سے پُر تھی۔ اور قوم کی نشوونما میں کسی طرح کارآمد نہ
ہو سکتی تھی۔ قوم کی اصلاح کے لئے ضروری تھا۔ کہ ایک نئی زبان تیار ہو۔ جو فارسی کی جگہ لے۔ ایک نیا لٹریچر
پیدا ہو۔ جو شاندار ماضی اور موجودہ زبوں حالی کی تصویر قوم کے سامنے کھینچ کر رکھدے۔ شاعری اور شاعرانہ
تنقید کے بالکل نئے اصول رائج ہوں۔ علی گڑھ کی تحریک نے یہ سب کچھ کیا۔ سر سید احمد خان کی تعلیمی اصلاح
کا زمانہ اردو ادب کا بھی شاندار عہد ہے۔ کیونکہ اردو ادب کے "عناصرِ خمسہ" میں سے چار یعنی حالی
شبلی۔ نذیر احمد اور سر سید احمد خان اس تحریک کی رُوحِ رواں تھے ؎

سر سید احمد خان

سر سید احمد خان جو اس تحریک کے علمبردار تھے۔ ۱۷ اکتوبر ۱۸۱۷ء کو
دہلی میں پیدا ہوئے۔ اُن کے دادا جواد الدولہ سید ہادی شاہ عالم کے
زمانے میں صوبہ شاہجہان آباد کے محتسب اور قاضی لشکر تھے۔ اُن کے والد میر متقی ایک آزاد طبیعت کے
آدمی تھے اور دنیاداری کے مشغلوں میں کم دلچسپی لیتے تھے۔ وہ شاہ غلام علی کے مُرید تھے۔ اور اکثر وقت
انکی صحبت یا تیراکی اور تیراندازی میں جس کے وہ بڑے ماہر تھے صرف کرتے۔ سر سید کے نانا دبیر الدولہ امین الملک
خواجہ فرید الدین احمد خان بہادر مصلح جنگ تھے۔ جو پہلے کمپنی کے مدرسہ کلکتہ میں سپرنٹنڈنٹ تھے! اور پھر
اکبر شاہ ثانی کے زمانے میں وزیر ہو گئے تھے۔ وہ بھی صوفی منش آدمی تھے۔ سر سید کی تربیت والدہ
نے کی۔ جو بڑی دانشمند اور دُور اندیش خاتون تھیں ؎

سر سید کی تعلیم پُرانے اسلامی اصولوں پر ہوئی۔ بسم اللہ کی تقریب شاہ غلام علی صاحب نے ادا کی۔
پہلے قرآن مجید پڑھا۔ پھر فارسی کی درسی کتابیں مثلاً کریما۔ خالق باری۔ آمد نامہ۔ گلستاں۔ بوستاں
وغیرہ پڑھیں۔ عربی میں شرحِ ملا۔ شرحِ تہذیب۔ میبذی۔ مختصر معانی اور مطول کا کچھ حصہ پڑھا۔ ریاضی
کا علم انہوں نے اپنے ماموں نواب زین العابدین سے سیکھا۔ اور طب حکیم غلام حیدر خان سے۔ اس کے

بعد وہ اپنے طور پر مختلف کتابیں پڑھتے رہے۔ اور ۱۸۴۶ء میں جب دہلی کی منصفی پر آئے۔ تو تحصیلِ علم میں بہت ترقی کی ٭

سر سید نے ملازمت کی ابتداء "صدر امین" کے طور پر کی۔ پھر ۱۸۴۱ء میں منصفی کا امتحان پاس کر کے منصف مقرر ہوئے۔ اور ملازمت کے سلسلے میں دہلی۔ بجنور۔ مرادآباد۔ غازی پور۔ علیگڑھ اور بنارس مقیم رہے۔ جولائی ۱۸۷۶ء کے آخر میں پنشن لے کر علیگڑھ آ مقیم ہوئے۔ جہاں مولوی سمیع اللہ خان صاحب بڑی تندہی اور محنت سے مجوزہ ایم اے او کالج کا ابتدائی مدرسہ چلا رہے تھے۔ انہوں نے زندگی کے باقی بائیس سال اپنے ارادوں کی تکمیل میں یہیں گزارے ٭

سر سید نے ملازمت کے پینتیس سال بڑی نیک نامی سے بسر کئے۔ اور سرکاری فرائض کے علاوہ تصنیف و تالیف اور ترویج علوم کے لئے بھی وقت نکالا۔ اُن کی تصانیف طرح طرح کی ہیں۔ مثلاً

(۱) "انتخاب الاخوین" یعنی قواعد دیوانی کا خلاصہ

(۲) "قولِ متین در ابطالِ حرکتِ زمین"

(۳) "تسہیل فی جرّ الثقیل"

(۴) رسالہ "اسبابِ بغاوتِ ہند"

لیکن معلوم ہوتا ہے۔ تاریخی اور مذہبی مباحث میں اُن کا دل بہت لگتا تھا۔ اور ان کی اکثر مشہور کتابیں انہی مضامین کے متعلق ہیں۔ ان کی اہم ترین تاریخی کتاب "آثار الصنادید" ہے جس میں دہلی و نواحِ دہلی کی عمارات کی تاریخ لکھی ہے۔ اور جس کا ترجمہ فرانسیسی زبان میں گارسن دتاسی نے کیا تھا۔ اس ترجمے کو دیکھ کر "رائل ایشیاٹک سوسائٹی لنڈن" نے ۱۸۶۴ء میں سر سید کو آنریری فیلو منتخب کیا تھا۔ اس کتاب کے علاوہ سر سید نے بڑی محنت سے "آئینِ اکبری" اور "تاریخ فیروز شاہی کی تصحیح کی۔ اور تاریخ سرکشی بجنور مرتب کی ٭

سر سید کی مذہبی تصانیف بہت زیادہ ہیں۔ ہم نے سر سید کے خاندان کے جو حالات لکھے ہیں۔ اُن سے ظاہر ہے کہ "مذہب ہی کی آغوش میں انہوں نے پرورش پائی تھی۔ اور مذہب کی گود میں ہوش سنبھالا تھا اور

۱۸۳۹ء سے لے کر جب انہوں نے رسولِ اکرمؐ کے مختصر حالات لکھے۔ ۱۸۹۸ء تک جب وہ "اُمہات المومنین" کے متعلق ایک عیسائی مُصنف کے اعتراضات کا جواب لکھتے لکھتے وفات پا گئے۔ مذہبی مباحث میں انکی دلچسپی برقرار رہی ہے۔ انہوں نے اپنی کتاب "آثار الصنادید" میں حضرت سید احمد بریلویؒ۔ شاہ اسمٰعیل شہید اور شاہ عبدالعزیز صاحب محدثؒ کے حالات جس ادب اور محبت سے لکھے ہیں۔ اُن سے اور انکی ابتدائی کتابوں سے ظاہر ہے۔ کہ انہیں ان بزرگوں سے بڑی عقیدت تھی۔ وہ حضرت سید احمد بریلوی کی وہابی تحریک اصلاح سے بہت متاثر ہوئے۔ انہوں نے اپنے آپ کو اس زمانے میں بالاعلان وہابی مسلمان کہا تھا جب سب وہابیوں کو باغی سمجھا جاتا تھا اور ڈاکٹر ہنٹر کی کتاب کا جواب لکھتے ہوئے تصریح کی تھی۔ کہ میں خود وہابی ہوں اور لکھا کہ "میری رائے میں وہابیوں اور تمام دوسرے مسلمانوں میں وہی فرق ہے۔ جو پروٹسٹنٹ اور رومن کیتھولک فرقوں میں ہے۔ مولانا حالی لکھتے ہیں۔" مولانا اسمٰعیل شہید نے اُن کے خیالات کی اور زیادہ اصلاح کی اور انہیں کسی قدر تقلید کی بندشوں سے آزاد کیا۔" سر سید نے حضرت سید احمد بریلویؒ اور شاہ اسمٰعیل شہیدؒ کی تائید میں کئی کتابیں لکھیں مثلاً "راہِ سنت دردِ بدعت" (۱۸۵۰ء) اور "کلمۃ الحق" وغیرہ۔ سر سید کے عقائد میں بعد میں کئی تبدیلیاں ہوئیں لیکن وہ اصلاحی جوش جو مولانا سید احمد بریلوی کے تمام معتقدین کا خاصہ تھا۔ اُن میں تمام عمر باقی رہا۔ ان رسائل وکتب کے علاوہ سر سید نے کئی اور اہم کتابیں لکھیں۔ مثلاً (۱) "تبیین الکلام" جس میں انہوں نے بائبل کی تفسیر نئے اصولوں کے مطابق لکھنی شروع کی تھی (۲) "رسالہ طعام اہل کتاب" (۳) "خطباتِ احمدیہ" جس میں سر ولیم میور کی کتاب "لائف آف محمد" کا جواب بڑی محنت اور جانفشانی سے لکھا۔ (۴) تفسیر قرآن کی سات جلدیں۔ اور کئی دوسرے مذہبی رسائل۔

تصنیف و تالیف کے علاوہ سر سید کا دوسرا محبوب مشغلہ اشاعتِ تعلیم تھا۔ اور سرکاری ملازمت کے زمانے ہی میں انہوں نے یہ شغل جاری رکھا۔ سب سے پہلا مدرسہ جو انہوں نے جاری کیا۔ مراد آباد کا فارسی مدرسہ تھا۔ یہ ۱۸۵۹ء میں قائم ہوا۔ دوسرا سکول جس میں انگریزی بھی پڑھائی جاتی تھی۔ غازی پور میں ۱۸۶۴ء میں شروع کیا۔ لیکن ان دونوں مدرسوں سے زیادہ اہم کام جو انہوں نے علی گڑھ کالج کے قیام سے پہلے شروع کیا وہ "سائنٹفک سوسائٹی غازی پور" کا افتتاح تھا۔ جو ۱۸۶۳ء میں ہوا۔ اس سوسائٹی کا مقصد مغربی علوم کو ہندوستان میں رائج کرنا تھا۔ ڈیوک آف آرگائل جو اس وقت وزیر ہند تھے۔ سوسائٹی کے مربی تھے۔ اور ممالک شمال

مغربی اور پنجاب کے لیفٹیننٹ گورنر نائب مربی - یہ سوسائٹی غازی پور میں شروع ہوئی تھی - لیکن جب سرسید علیگڑھ تبدیل ہوگئے تو سوسائٹی بھی وہیں منتقل ہوگئی - سوسائٹی کے زیرِ اہتمام مختلف علمی مضامین پر تقریریں ہوا کرتی تھیں - اور سوسائٹی نے کئی مفید کتابیں انگریزی سے اردو میں ترجمہ کرائیں - اس سوسائٹی نے ایک اخبار بھی جاری کیا جس کا ایک کالم انگریزی میں اور ایک اردو میں ہوتا تھا - اخبار کے مضامین بیشتر ہندوؤں اور مسلمانوں کی سوشل اصلاح پر مشتمل تھے - جب تک سرسید علیگڑھ رہے - سوسائٹی اور اخبار کا انتظام اُن کے ہاتھ میں رہا - لیکن جب وہ ۱۸۶۷ء میں بنارس تبدیل ہوگئے - تو راجہ جے کشن داس نے تمام انتظام اپنے ہاتھ میں لیا - بنارس میں بھی سوسائٹی اور اخبار سے سرسید کی دلچسپی برقرار رہی - اور اپنے سفرِ انگلستان کے حالات وہ اس اخبار کو بھیجتے رہے -

اب تک سرسید نے اشاعتِ تعلیم کے لئے جو کوششیں کی تھیں - اُن میں مسلمانوں کی تخصیص نہ تھی - مرادآباد کا مدرسہ یا غازی پور کا سکول یا سائنٹفک سوسائٹی سب میں ہندو شریک تھے - اور دونوں فریق فائدہ اٹھاتے - لیکن سرسید کے قیامِ بنارس کے دوران میں چند ایسے واقعات پیش آئے - جنہوں نے سرسید کے زاویۂ نگاہ میں بڑی تبدیلی پیدا کر دی - اور چونکہ ان واقعات سے نہ صرف سرسید کے خیالات بدلے - بلکہ شاید ہندوستان کی قسمت پر بھی گہرا اثر پڑا - اس لئے اِن واقعات کی تفصیل دیکھنے کے لائق ہے - مولانا حالی "حیاتِ جاوید" میں لکھتے ہیں :-

"۱۸۶۷ء میں بنارس کے بعض سربرآوردہ ہندوؤں کو یہ خیال پیدا ہوا کہ جہاں تک ممکن ہو - تمام سرکاری عدالتوں میں سے اردو زبان اور فارسی خط کے موقوف کرانے میں کوشش کی جاوے اور بجائے اس کے بھاشا زبان جاری ہو - جو دیوناگری میں لکھی جاوے +"

سرسید کہتے تھے - کہ یہ پہلا موقع تھا - جب مجھے یقین ہوگیا - کہ اب ہندو مسلمانوں کا بطور ایک قوم کے ساتھ چلنا اور دونوں کو ملا کر سب کے لئے مشترک کوشش کرنا محال ہے - اُن کا بیان ہے کہ "انہی دنوں میں جبکہ یہ چرچا بنارس میں پھیلا - ایک روز مسٹر شیکسپیر سے جو اس وقت بنارس میں کمشنر تھے - میں مسلمانوں کی تعلیم کے باب میں کچھ گفتگو کر رہا تھا اور وہ متعجب ہو کر میری گفتگو سن رہے تھے - آخر

انہوں نے کہا۔ کہ آج یہ پہلا موقعہ ہے ۔ کہ مَیں نے تم سے خاص مسلمانوں کی ترقی کا ذکر سُنا ہے ۔ اِس سے پہلے تم ہمیشہ عام ہندوستانیوں کی بھلائی کا خیال ظاہر کرتے تھے ۔ مَیں نے کہا کہ اب مجھے یقین ہوگیا ہے ۔ کہ دونوں قومیں کسی کام میں دل سے شریک نہ ہوسکیں گی ۔ ابھی تو بہت کم ہے ۔ آگے آگے اس سے زیادہ مخالفت اور عناد ان لوگوں کے سبب جو تعلیم یافتہ کہلاتے ہیں ۔ بڑھتا نظر آتا ہے ۔ جو زندہ رہے گا ۔ وہ دیکھے گا ۔ انہوں نے کہا ۔ " اگر آپ کی پیشگوئی صحیح ہو ۔ تو نہایت افسوس ہے "۔ میں نے کہا " مجھے بھی نہایت افسوس ہے ۔ مگر اپنی پیش گوئی پر مجھے پُورا یقین ہے "۔

علیگڑھ کالج

سر سید احمد خان ابھی بنارس میں مقیم تھے ۔ کہ سید محمود کو حکومت کی طرف سے انگلستان میں تعلیم حاصل کرنے کے لئے ایک معقول وظیفہ ملا ۔ اور سر سید نے انہیں اور سید حامد کو ساتھ لے کر ولایت جانے کا ارادہ کیا ۔ یکم اپریل ۱۸۶۹ء کو وہ ولایت روانہ ہوئے اور اٹھارہ اُنیس مہینے کے سفر کے بعد اکتوبر ۱۸۷۰ء میں بنارس واپس آئے ۔ انگلستان میں اُن کا قیام زیادہ تر لندن میں رہا ۔ اور یہ وقت اُنہوں نے " خطبات احمدیہ " کے لئے مواد جمع کرنے میں صرف کیا ۔ اس کے علاوہ انہیں انگریز قوم کی ترقیوں اور اُن کی تعلیمی اور معاشرتی خوبیوں کا مطالعہ کرنے کا بھی موقع ملا ۔ واپس آکر سب سے پہلا کام جو انہوں نے کیا وہ " تہذیب الاخلاق " کا اجرا تھا ۔ جس کا پہلا نمبر اُن کی واپسی کے دو مہینے بعد شائع ہوا ۔ یہ رسالہ عموماً خشک مباحث سے پُر ہوتا تھا ۔ اور اس کا حلقۂ اثر بھی بہت وسیع نہ تھا ۔ لیکن اس میں کئی ایسی مذہبی باتوں کا ذکر ہوتا تھا ۔ جن کا عوام کو ناگوار ہونا قدرتی امر تھا ۔ چنانچہ ابھی اس پرچے کے دو تین نمبر ہی نکلے تھے کہ چاروں طرف سے اسکی مخالفت ہونی شروع ہوئی ۔ اور علیگڑھ کالج کے افتتاح کے سات آٹھ سال پہلے سر سید انگریزی تعلیم کی ترویج سے نہیں بلکہ اپنے معاشرتی اور مذہبی عقائد کی وجہ سے مسلمانوں میں " نیچری " اور " کرسٹان " کہلانے لگے ۔

سر سید ۱۸۷۰ء میں ولایت سے واپس آئے ۔ واپسی پر اُنہوں نے " کمیٹی خواستگار ترقئ تعلیم مسلمانان " قائم کی ۔ اس کمیٹی نے فیصلہ کیا کہ مسلمانوں کی اعلیٰ تعلیم کے لئے ایک کالج کھولا جائے ۔ چنانچہ " محمڈن کالج فنڈ کمیٹی " قائم ہوئی ۔ حکومتِ ہند نے جسے اس فیصلے کی اطلاع دی گئی تھی ۔ اس تجویز کو بہت پسند کیا اور لکھا

کہ "شمال مغربی اضلاع کے مسلمانوں کی یہ تجویز اس بات کی مستحق ہے کہ جہاں تک ممکن ہو حکومت اس میں مدد دے۔ اخلاقی مدد اور امدادی گرانٹ کے وعدے کے علاوہ لارڈ نارتھ بروک وائسرائے و گورنر جنرل ہند نے اپنی جیب سے دس ہزار روپیہ دینے کا وعدہ کیا۔ سر ولیم میور نے ایک ہزار روپیہ دیا اور دوسرے انگریز افسروں نے بھی مدد کی۔ بالآخر فروری ۱۸۷۳ء میں سید محمود نے مجوّزہ کالج کے متعلق مکمل سکیم پیش کی جسے کمیٹی نے منظور کیا۔ اس کے بعد یہ فیصلہ ہوا کہ علیگڑھ میں جہاں مدرسۃ العلوم قائم کرنے کا فیصلہ ہوا تھا۔ پہلے ایم اے او ہائی اسکول قائم کیا جائے۔ سرسید اس زمانے میں بنارس تھے۔ اس اسکول کا انتظام مولوی سمیع اللہ خان سیکرٹری علیگڑھ سب کمیٹی کو کرنا پڑا۔ انہوں نے یہ کام دل سے اور کوشش سے سرانجام دیا۔ چنانچہ سر ولیم میور نے ۲۴ مئی ۱۸۷۵ء کو اسکول کا افتتاح کرتے ہوئے کہا "مولوی سمیع اللہ سب آرڈینیٹ جج نے دل و جان سے اس سکول کے لئے محنت کی ہے۔ اور تھوڑے ہی عرصے میں جو نمایاں ترقی اس اسکول نے کی وہ بہت حد تک انہی کی وجہ سے ہے"۔

اس اثناء میں کالج فنڈ کمیٹی نے چندے کے لئے کوششیں جاری رکھیں۔ فنڈ کمیٹی کے سیکرٹری سرسید، صدر چھتاری کے کنور لطف علی خان اور نائب صدر راجہ باقر علی تھے۔ لارڈ نارتھ بروک نے کالج کی مدد کے لئے جو نیک مثال قائم کی تھی دوسروں نے اسکی پیروی کی۔ نظام حیدرآباد نے سرسالار جنگ کی کوشش سے نوّے ہزار روپیہ دیا۔ اور چھ ہزار سالانہ دینے کا وعدہ کیا۔ جو بعد میں بڑھا دیا گیا۔ خلیفہ سید محمد حسن وزیراعظم پٹیالہ نے مہاراجہ سے اٹھاون ہزار چندہ دلوایا۔ نواب رام پور نے بھی بڑی مدد کی۔ حکومت نے ۱۸۷۵ء میں بیالیس سو روپیہ سالانہ گرانٹ کا فیصلہ کیا۔ جو سر الفرڈ لائل نے بڑھا کر بعد میں بارہ ہزار کر دی۔ ان گرانقدر عطیوں اور دوسرے چندوں سے جو مسلمانوں۔ انگریزوں اور دوسری قوموں سے موصول ہوئے "کالج فنڈ کمیٹی" کی مالی حالت بہت اچھی ہوگئی۔ اور کمیٹی نے جلد کالج کھولنے کا فیصلہ کیا۔ سرسید احمد خان جولائی ۱۸۷۶ء میں پنشن پاکر علی گڑھ آ مقیم ہوئے اور ۸ جنوری ۱۸۷۷ء کو لارڈ لٹن کے ہاتھ کالج کا افتتاح ہوا۔

سرسید کی مخالفت

کالج کے قیام میں سرسید کو کوئی خاص دشواریاں نہیں پیش آئیں اور انہیں تمام روشن خیال اور با اثر مسلمانوں کی مدد حاصل تھی۔ لیکن ایک طبقے میں

چند وجوہات کی بنا پر اُن کی بہت مخالفت ہوئی۔ اور چونکہ اس مخالفت کے متعلق عوام بلکہ خواص میں بھی کئی غلط فہمیاں رائج ہیں۔ اس لئے ہم اُن وجوہات پر قدرے تفصیل سے بحث کرینگے۔ سب سے بڑی غلط فہمی جو اس بارے میں بہت عام ہے۔ یہ ہے کہ علما نے سرسید کی مخالفت اس وجہ سے کی کہ وہ مسلمانوں میں انگریزی تعلیم رائج کرنا چاہتے تھے۔ ہم نے سرسید کے موافق اور مخالف تحریروں کا مطالعہ کیا ہے۔ ہماری رائے میں یہ خیال غلط ہے۔ اور علما اور اسلام کے خلاف صریح بے انصافی ہے۔ آخر علما، اندھے نہ تھے۔ تحصیلِ علم کے بارے میں رسول کریمؐ کا واضح ارشاد ہے کہ "علم چین میں بھی جاکر حاصل کرو"۔ اب اگر "چین" میں جہاں کے باشندے انگریزوں کی طرح اہلِ کتاب بھی نہیں۔ تحصیل علم کی تلقین کی گئی ہے۔ تو انگریزی تعلیم کی کیوں مخالفت ہو۔ اس کے علاوہ جب شاہ عبدالعزیزؒ سے انگریزی کالجوں میں تعلیم حاصل کرنے کے متعلق فتویٰ لیا گیا تو انہوں نے بزور کہا "جاؤ۔ انگریزی کالجوں میں پڑھو۔ اور انگریزی زبان سیکھو۔ شرعاً ہر طرح جائز ہے"[1]۔ اب لوگ حیران ہیں کہ جب سرکار کے قائم کئے ہوئے کالجوں میں پڑھنا جائز تھا تو ایک ایسے مدرستہ العلوم کی کیوں مخالفت ہوئی جو مسلمانوں کا جاری کردہ تھا۔ اور جس میں مذہبی تعلیم کا بھی انتظام تھا۔

اس معما کے حل کرنے کے لئے ان مضامین اور فتاویٰ کا مطالعہ کرنا چاہیئے۔ جو سرسید کی مخالفت اور انکی تکفیر میں شائع ہوئے۔ اُن کے پڑھنے سے پتہ چلتا ہے کہ علی گڑھ کالج کی مخالفت اس وجہ سے نہیں ہوئی۔ کہ وہاں مغربی علوم پڑھائے جاتے تھے۔ بلکہ اس لئے کہ اس کی بنا میں سرسید کا ہاتھ تھا اور سرسید اپنی کتب اور "تہذیب الاخلاق" میں معاشرتی اور مذہبی مسائل کے متعلق ایسے عقائد کا اظہار کر رہے تھے۔ جنہیں عام مسلمان اسلام کے خلاف سمجھتے تھے۔ علی گڑھ کالج کے متعلق سخت سے سخت مضامین اور درشت سے درشت فتاویٰ میں یہ نہیں لکھا کہ انگریزی پڑھنا کفر ہے۔ بلکہ یہی ہوتا تھا کہ جس شخص کے عقائد سرسید جیسے ہوں وہ مسلمان نہیں۔ اور جو مدرسہ ایسا شخص قائم کرنا چاہے۔ اسکی اعانت جائز نہیں۔ شروع شروع میں لوگوں کا خیال تھا کہ سرسید اپنے مدرسے میں اپنے عقائد کی تبلیغ کرینگے جن کا اظہار وہ اپنے رسائل وکتب

---

[1] "اسبابِ بغاوتِ ہند" مصنفہ سرسید احمد خان

میں کررہے تھے۔ سرسید نے ایسا نہیں کیا۔ لیکن اُن کی تصانیف میں کئی ایسی باتیں ہوتی تھیں۔ جن سے مخالف بلکہ موافق بھی بدظن ہوجاتے تھے۔ سرسید نے جب بائبل کی نامکمل تفسیر لکھی تھی تو نواب محسن الملک کو اسکی عبارت اتنی شاق گزری تھی۔ کہ اس وقت سرسید سے تعارف نہ ہونے کے باوجود انہوں نے اس کے خلاف سرسید کو ایک طول طویل خط لکھا۔ اور جب اُن سے ملے تو انہیں یقین نہ آتا تھا۔ کہ سرسید قبلہ رُو ہوکر نماز پڑھتے ہیں۔ اور حقیقت یہ ہے کہ سرسید کی اس کتاب سے صرف مسلمانوں ہی کو ان کے متعلق شکوک پیدا نہیں ہوئے۔ بلکہ دوسری قوموں نے بھی وہی نتائج اخذ کئے۔ جو نواب محسن الملک یا عام مسلمان اخذ کرتے تھے چنانچہ جان آرنلڈ جن کی خط وکتابت سرسید سے تھی۔ اس تفسیر کے متعلق لکھتے ہیں کہ اگر تفسیر بائیبل کا کام مسلمانوں ہی کے ہاتھوں ہوجائے تو پھر عیسائیوں کو یہ ثابت کرنا کچھ دشوار نہ ہوگا کہ اگر انجیل صحیح ہے۔ تو (نعوذ باللہ) قرآن ضرور جھوٹ ہے[1]

اس تفسیر کے بعد سرسید نے دوسری بے احتیاطی الفنسٹن کی کتاب "تاریخِ ہند" کا ترجمہ کرتے وقت کی۔ اس کتاب میں جہاں کہیں مصنف نے رسولِ اکرمؐ کا ذکر کیا تھا۔ وہاں آپ کے متعلق (عیاذاً باللہ) "پیغمبرِ باطل" کا لفظ لکھا تھا۔ سرسید نے بھی بلاکم وکاست یہ لفظ اسی طرح ترجمے میں لکھ دیا۔ جب کتاب کا یہ حصّہ چھپا۔ تو مولوی سمیع اللہ خان اور دوسرے ممبروں نے اس پر اعتراض کیا کہ ایسی کتاب میں جو اسکولوں کے طلبہ کے پاس جاتی ہو کم ازکم ایک مسلمان کو اس طرح کے الفاظ استعمال نہیں کرنے چاہئیں۔ ہمارے خیال میں یہ اعتراض بہت وزنی تھا۔ اور مولانا حالی بھی اس بارے میں لکھتے ہیں۔ کہ ممکن تھا کہ ترجمے میں باطل کا لفظ نہ لکھا جاتا۔" ہم ہندوستانی مسلمانوں کی اس روش کو فضول اور مُضر قرار دیتے ہیں کہ وہ اپنے عقائد یا خیالات کے خلاف کچھ بھی سننا گوارا نہیں کرتے اور سمجھتے ہیں کہ کانوں میں انگلیاں ٹھونس لینے یا آنکھوں پر پٹی باندھ لینے سے دنیا کی تلخیاں مٹ جائیں گی۔ لیکن انہیں خواہ مخواہ اشتعال دینے میں کوئی مصلحت نہیں اور سرسید نے تو یہ کتاب آج سے ستر اسّی سال پہلے لکھی تھی۔ لیکن ہمارا خیال ہے کہ آج بھی اگر انگلستان کی کسی تاریخ میں حضرت

---

[1] حیاتِ جاوید

عیسےٰ علیہ السلام کا ذکر ایسی ناشائستگی اور کج خلقی سے ہو۔ تو وہاں بھی اس کی ضرور مخالفت کی جائے۔

مندرجہ بالا اسباب کی بنا پر مسلمان سر سید کے ولایت جانے سے پہلے ہی اُن سے بدظن تھے۔ لیکن اُنکی سب سے زیادہ مخالفت اس وقت ہوئی۔ جب انہوں نے "تہذیب الاخلاق" جاری کیا۔ اور ان مذہبی عقائد کا اظہار کیا جنہیں عام مسلمان تعلیم اسلامی کے خلاف اور ملحدانہ سمجھتے تھے۔ مثلاً شیطان۔ اجنہ اور ملائک کے وجود سے انکار۔ حضرت عیسےٰؑ کے بن باپ کے پیدا ہونے یا زندہ آسمان پر جانے سے انکار حضرت عیسےٰ و حضرت موسےٰ کے معجزات سے انکار وغیرہ وغیرہ۔ سر سید نے اپنے وقت کا بڑا حصہ ان عقائد و خیالات کی تفصیل میں صرف کیا ہے۔ اور اگرچہ یہ صحیح ہے۔ کہ یہ کام انہوں نے خالص اسلامی ہمدردی سے متاثر ہو کر کیا۔ لیکن اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ ان عقائد کی مخالفت قدرتی امر تھا۔

جن لوگوں نے سر سید کے حالات بغور نہیں پڑھے وہ سمجھتے ہیں کہ سر سید کی مخالفت اُن دقیانوسی علمائے کی۔ جو ہندوستان کو دارالحرب سمجھتے تھے اور سرکارِ انگلشیہ اور انگریزی تعلیم کے مخالف تھے حقیقت اس کے بالکل برعکس ہے۔ مدرسۃ العلوم کے سب سے بڑے مخالف دو بزرگ تھے[1]۔ اور دونوں معزز سرکاری ملازم یعنی مولوی امداد علی ڈپٹی کلکٹر اور مولوی علی بخش سب جج۔ حالی لکھتا ہے کہ "ہندوستان میں جس قدر مخالفین اطراف وجوانب سے ہوئے۔ اُن کا منبع انہی دونوں صاحبوں کی تحریریں تھیں۔" اور ان کی مخالفت کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ "بعض جلیل القدر انگریز مدرسۃ العلوم کے سخت مخالف تھے[2] اور ان میں سے بعض کے ساتھ ان دونوں صاحبوں کو خاص تعلق تھا۔ اس لئے سر سید کی مخالفت کو انہوں نے ایک ذریعہ ان کی خوشنودی اور اپنی سرخروئی کا سمجھا۔"

کالج کا افتتاح لارڈ لٹن نے جنوری ۱۸۷۷ء میں کیا۔ اس تاریخ سے کالج نے دن بدن ترقی کرنی شروع کی۔ سر سید نے کالج کا اسٹاف بالخصوص یورپین اسٹاف چننے میں بڑی کوشش کی تھی۔ اور مسٹر تھیوڈور بیک

[1-2] سر سید نے بعض مضامین میں علی گڑھ کے کلکٹر اور صوبہ کے ڈائرکٹر محکمۂ تعلیم کو بھی مدرسۃ العلوم کا مخالف قرار دیا ہے۔

پرنسپل ایم اے او کالج کی مدد سے انہیں بڑے قابل اور ہونہار اساتذہ مل گئے تھے۔ اس وقت فلسفہ کے پروفیسر ٹی۔ ڈبلیو آرنلڈ تھے۔ جو بعد میں سر ٹامس آرنلڈ ہوئے۔ انگریزی پروفیسر رالے پڑھاتے تھے۔ جو بعد میں والٹر رالے کے نام سے انگریزی ادب کے بہترین نقاد مشہور ہوئے۔ فارسی کے استاد مولانا شبلی تھے۔ جنہیں مولوی سمیع اللہ کی مردم شناس آنکھ نے چنا اور سر سید کے سامنے پیش کیا۔ ان کے علاوہ سر تھیوڈور مارلیسن، مسٹر آرچی بالڈ وغیرہ کی شرکت نے کالج کو بڑی رونق دی۔ یہ لوگ نہ صرف قابل اور محنتی تھے۔ بلکہ انہیں اپنے فرائض کا بڑا احساس تھا۔ اور اُن کی سرپرستی میں کالج نے دن دونی رات چوگنی ترقی شروع کر دی۔

کالج کی مالی حالت بھی اب بہتر ہو رہی تھی۔ ۱۸۸۴ء میں سر سید نے پنجاب کا دورہ کیا تھا۔ اور لدھیانہ جالندھر۔ امرتسر۔ لاہور۔ پٹیالہ ہر جگہ ان کا شاندار استقبال ہوا۔ لدھیانہ میں جہاں وہ پہلے پہنچے فقط اسٹیشن کے اندر آٹھ سو سے زیادہ آدمی اُن کے استقبال کے لئے موجود تھے۔ لوگ پھول اور ہار لے کر آئے ہوئے تھے۔ لیکن ہجوم کی وجہ سے سر سید تک پہنچنا مشکل تھا۔ اس لئے اکثر لوگوں نے دُور ہی سے ہار اور پھول ان پر پھینکے۔ باہر خلق کا اتنا اژدہام تھا کہ گاڑیوں تک پہنچنا دشوار ہو گیا۔ لاہور میں ان کے دوست اور قوم کے محسن خان بہادر برکت علی اور پٹیالہ میں وزیر اعظم پٹیالہ نے ان کا استقبال کیا۔ ہر جگہ انہیں چندے کی معقول

لہ مولوی طفیل احمد منگلوری بھی جنہوں نے یورپین اسٹاف کے خلاف کئی الزام لگائے ہیں۔ اس امر کا اعتراف کرتے ہیں "سر سید کے انتقال کے بعد مسٹر بیک نے سر سید میموریل فنڈ اور علی گڑھ کالج کی ترقی کے لئے حد درجہ کوشش کی۔ اس سے ان کی صحت خراب ہو گئی۔ ہر چند انہیں کام سے منع کیا گیا۔ مگر بیماری کی حالت میں جب کہ وہ تعطیلات کے زمانے میں شملہ میں تھے۔ کام کرتے رہے۔ حتیٰ کہ ستمبر ۱۸۹۹ء میں وہاں ان کا انتقال ہو گیا۔ ان کے انتقال کے بعد مسٹر (سر) تھیوڈور مارلیسن نے بہ حیثیت پرنسپل کے نہ صرف تعلیمی کام بلکہ انتظامی کام حد درجہ کی تندہی سے کئے۔ طلبا کے لئے ملازمت کی ایجنسی قائم کی اپنے غیر معمولی رسوخ سے جو انہیں حکام کے حلقے میں حاصل تھا۔ طلبا کو ادنےٰ سے لے کر اعلےٰ ملازمتیں دلواتے تھے۔ تمام طلباء کالج کے لئے وہ بمنزلہ خاندان کے ایک بزرگ کے تھے۔ جو نہ صرف طالب علمی کے زمانے میں بلکہ ان کی کاروباری زندگی میں ہر دم یکساں مددگار رہتے تھے۔ دورانِ ملازمت میں اپنے شاگردوں کی ترقی اور بہبودی میں برابر ساعی رہتے تھے۔ اور مصیبت میں ان کی مدد کرتے تھے"۔

رقمیں دی گئیں۔ متعدد سوسائٹیوں اور انجمنوں کی طرف سے ایڈریس پیش ہوئے اور اس میں کوئی شک نہیں
کہ "زندہ دلانِ پنجاب" کی اس قدردانی سے سرسید کو بڑی تقویت پہنچی اور جیسا کہ حالی نے لکھا ہے ایک اور
خداساز تائید سرسید کے منصوبوں کی یہ ہوئی کہ پنجاب کے مسلمان جنہوں نے برٹش گورنمنٹ کی بدولت ایک
مدت کے بعد نئی زندگی حاصل کی تھی ...... سرسید کی منادی پر اس طرح دوڑے جس طرح پیاسا
پانی پر دوڑتا ہے"۔

انہی ایام میں ایک اور اہم کام انہوں نے یہ کیا کہ ۱۸۸۶ء میں یعنی "نیشنل کانگرس" کی بنیاد سے ایک سال
بعد آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس" کی بنیاد ڈالی۔ کالج کی حالت اس وقت تسلی بخش تھی۔ لیکن ظاہر
ہے کہ ایک کالج قوم کی تمام تعلیمی ضروریات پوری نہیں کر سکتا۔ اس کے علاوہ چھ کروڑ مسلمانوں میں جو مختلف
صوبوں اور مختلف ضلعوں میں پھیلے ہوئے تھے۔ بیداری اور تعلیم کا شوق پیدا کرنے کے لئے ضروری تھا
کہ ان کے پاس جا کر ان کے سامنے قوم کا رونا رویا جائے۔ اور حصولِ تعلیم پر زور دیا جائے۔ اور اس
میں کوئی شک نہیں کہ مسلمانوں میں عام بیداری پیدا کرنے میں کئی لحاظ سے یہ کانفرنس علیگڑھ کالج سے
بھی زیادہ مفید ثابت ہوئی ہے۔ مختلف اور دور دراز مقامات پر جہاں سے شاید علی گڑھ کالج میں دو
یا تین طلبا تعلیم کے لیے آتے تھے۔ اس کانفرنس کے اجلاس منعقد ہوئے۔ ان میں شبلی اور حالی اپنی
نظمیں پڑھتے۔ مولانا نذیر احمد۔ نواب محسن الملک۔ خواجہ غلام الثقلین لیکچر دیتے اور وہاں ایک نئی زندگی
کے آثار نمودار ہو جاتے۔ اس کے علاوہ "مسلم لیگ" کے قیام سے پہلے سیاسی و نیم سیاسی امور میں بھی کانفرنس
ہی کو قوم کی آواز سمجھا جاتا تھا۔ چنانچہ سرسید نے "انڈین نیشنل کانگرس" کے خلاف جو اہم لیکچر ۲۸ دسمبر ۱۸۸۷ء
کو دیا تھا۔ وہ ایجوکیشنل کانفرنس ہی کے دوسرے سالانہ اجلاس میں دیا گیا۔

اب تک کالج کا انتظام ایک مینیجنگ کمیٹی کے ہاتھ میں تھا جس کے سیکرٹری سرسید تھے۔ اس کام میں
ان کے دستِ راست مولوی سمیع اللہ خان تھے۔ جنہوں نے مدرسۃ العلوم کا ابتدائی مدرسہ اس وقت
چلایا تھا۔ جب ابھی سرسید بنارس میں ملازم تھے۔ ۱۸۸۹ء میں سرسید نے ایک ٹرسٹی بل تجویز کیا۔ جس
کے مطابق کالج کا انتظام ٹرسٹیوں کے ہاتھ میں چلا جاتا تھا۔ اس بل کی ایک دفعہ یہ تھی کہ بورڈ آف ٹرسٹیز

کا سیکرٹری تو سرسید کو ہونا ہی تھا۔ اس کے جائنٹ سیکرٹری بھی اُن کے صاحبزادے آنریبل سید محمود ہوں تاکہ سرسید کے بعد وہ سیکرٹری ہو سکیں۔ مولوی سمیع اللہ خان۔ نواب انتصار جنگ اور بعض دوسرے بزرگوں نے اس دفعہ کی بڑی مخالفت کی۔ اس مخالفت کی ایک وجہ تو یہ تھی۔ کہ کالج کے انتظامات میں سرسید کے علاوہ کسی نے اتنی محنت نہ کی تھی جتنی مولوی سمیع اللہ خان نے اور سرسید کے بعد اُن کا سیکرٹری ہونا قدرتی امر تھا۔ دوسرے لوگوں کو سید محمود سے کئی شکایتیں بھی تھیں۔ اُن کی قابلیت میں کوئی شک نہ تھا لیکن وہ طبیعت کے ذرا تیز تھے۔ اور شراب نوشی کی مذموم عادت انکی شہرت کو بٹا لگا رہی تھی۔ ظاہر ہے کہ جو شخص اسی زمانے میں اپنی قابلیت، شہرت اور باپ کے اثر و رسوخ کے باوجود کثرت شراب نوشی کی وجہ سے ہائی کورٹ کی ججی کے ناقابل سمجھا جائے۔ اور اس سے استعفےٰ طلب کیا جائے۔ وہ ایک ایسی قوم کے اہم ترین ادارے کا موزوں مہتمم کیسے ہو سکتا تھا۔ جو شراب کو حرام سمجھتی ہے۔ اور کالج کے طلبا کے لئے وہ کون سی نیک مثال قائم کر سکتا تھا۔ سید محمود کے مخالفین کے اعتراضات میں بڑا وزن تھا۔ اور یہ ممکن تھا کہ مولوی سمیع اللہ اور سید محمود کے علاوہ کسی تیسرے آدمی کو جائنٹ سیکرٹری چُنا جاتا۔ لیکن سرسید اپنی تجویز پر اڑے رہے اور اُن کے احترام کے پیشِ نظر کمیٹی نے بھی کثرت رائے سے یہ تجویز منظور کر لی۔ چنانچہ مولوی سمیع اللہ خان اور انکی پارٹی کالج سے علیحدہ ہو گئی۔

مولوی سمیع اللہ کو اس فیصلے کا بڑا رنج ہوا۔ مگر انہوں نے کالج کی مخالفت یا اُسے ضعف پہنچانے کی کوئی کوشش نہ کی۔ لیکن قومی ہمدردی کا خیال انہیں بھی نچلا نہ بیٹھنے دیتا تھا۔ انہوں نے الہ آباد جا کر ۱۸۹۲ء میں "یونیورسٹی مسلم ہوسٹل" کی بنیاد ڈالی اور اگرچہ مولانا شبلی تو اسے "مسجدِ ضرار" ہی کہتے رہے لیکن قومی تعلیم کے مسئلے کا یہ بھی ایک حل تھا اور شاید جداگانہ قومی کالجوں کے قیام سے بہتر تھا۔ جن لوگوں نے مسلمانوں کی تعلیم

لہ مولانا شبلی کی ملازمت علی گڑھ میں مولوی سمیع اللہ خان کی کوششوں کو دخل تھا۔ لیکن ٹرسٹی بل کے سوال پر وہ اس شدت سے سید محمود کے حامی تھے۔ کہ مولوی سمیع اللہ کا ذکر کرتے ہوئے انہوں نے تہذیب و اخلاق کے معمولی اصول بھی نظر انداز کر دئے۔ سید محمود کی تعریف میں جو قصیدہ انہوں نے لکھا ہے۔ اس میں ممدوح سے

کے مسئلے پر غور کیا ہے۔ اور فرضی دلائل کو چھوڑ کر نتائج پر زیادہ توجہ دی ہے۔ وہ جانتے ہیں کہ جو سکول یا کالج خالص مسلمانوں کے لئے قائم ہیں ان میں قومی روایات کا تو تھوڑا بہت خیال ہوتا ہے مگر اُن کا تعلیمی معیار بالعموم سرکاری کالجوں اور سکولوں سے پست رہتا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ مسلمان طلبا ابھی تک عام طور پر دوسری قوموں سے پیچھے رہے ہیں اور چونکہ قومی اسکولوں میں انہیں دوسری اقوام کے طلبا سے مقابلہ نہیں کرنا پڑتا۔ اور ان کے ساتھ ملنے جلنے کا زیادہ اتفاق نہیں ہوتا۔ اس لئے ان کی تعلیمی حالت ترقی نہیں کرتی۔ چنانچہ سر فضل حسین جو دس پندرہ سال انجمن حمایت اسلام لاہور کے سیکرٹری رہے اور اسلامیہ کالج لاہور کی روح رواں تھے جب پنجاب میں وزیر تعلیم مقرر ہوئے تو سب سے پہلا قدم انہوں نے یہ اٹھایا کہ اسلامیہ اسکولوں یا کالجوں کی امداد کرنے کی بجائے گورنمنٹ کالج لاہور اور دوسرے سرکاری تعلیمی اداروں میں مسلمان طلبا کے داخلے کا خاطر خواہ انتظام کیا اور ان کی تعداد مقرر کر دی۔ تاکہ وہ ان میں بآسانی داخل ہو سکیں اور جن قوموں کے ساتھ انہیں زندگی کی تگ و دو میں حصّہ لینا ہے۔ اُن کے پہلو بہ پہلو اس تگ و دو کے لئے تیاری کریں۔ مولوی سمیع اللہ خان نے بھی یونیورسٹی مسلم ہوسٹل کے قیام سے مسلمانوں کی قومی تعلیم کے مسئلے کا ایک نہایت

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۵۶) خطاب ہے:۔

باپ کی طرح سے تو قوم کا بن پشت و پناہ	جانشینی کے لئے کون ہے تجھ سے افضل
ایک عالم کو مسلّم ہے ترا فضل و کمال	پھر نہ مانے کوئی حاسد تو جنوں کا ہے خلل

اس کے بعد سید محمود بلکہ سر سید کے متعلق مولٰنا کی جو رائے ہوئی۔ اس سے بھی زمانہ واقف ہے۔ الہ آباد مسلم ہوٹل کی تاسیس کے وقت بھی مولانا شبلی نے مولوی سمیع اللہ خان کے خلاف بہت زہر اُگلا۔ اور ہوسٹل کا تاریخی نام "مسجد ضرار" رکھا۔ لیکن ایک وقت ایسا بھی آیا جب مولٰنا شبلی کو اس اصول کی قدر معلوم ہوئی۔ جس پر مولوی صاحب نے یہ ہوسٹل قائم کیا تھا۔ نیشنل اسکول اعظم گڑھ کا ذکر کرتے ہوئے ۱۹۱۳ء کے ایک خط میں لکھتے ہیں۔ "قابلِ غور یہ مسئلہ ہے کہ نیشنل اسکول کو ہائی اسکول بنانا چاہئے۔ یا ایک بورڈنگ قائم کرنا چاہئے۔ اسکول ہر شہر میں سرکاری یا مشن موجود ہوتے ہیں۔ اور ان کے برابر اسٹاف کا سکول بنانا آسان کام نہیں اور بہت قوت اور محنت صرف کرنی

موزوں حل پیش کیا۔ یعنی مسلمان بورڈوں کے ایک جگہ رکھنے سے ان کی قومی روایات کا خیال رکھا۔ لیکن پڑھتے وہ سب باقی تمام طلبا کے ساتھ۔ انہی کے ساتھ لیکچروں میں شریک ہوتے۔ انہی کے ساتھ امتحانوں میں بیٹھتے۔ نتیجہ یہ ہے کہ فی زمانہ الہ آباد یونیورسٹی مسلم ہوسٹل کے طلبا ہندوستان کی کسی قوم کے طلبا سے پیچھے نہیں۔ اور یہ عجیب بات ہے کہ اگر علیگڑھ کالج کے قیام سے مسلمانوں کو اعلیٰ سرکاری ملازمتوں کے لئے تیار کرنا تھا۔ تو آج اس مقصد کے لئے مولوی سمیع اللہ خان کا قائم کردہ مسلم ہوسٹل علی گڑھ یونیورسٹی سے شاید زیادہ مفید ثابت ہو رہا ہے۔ مثلاً آئی۔سی۔ایس کے امتحان میں ہر سال مسلم ہوسٹل کے دو تین طلبا کامیاب ہو جاتے ہیں اور علیگڑھ سے کئی سالوں کے بعد ایک آدھ ہوتا ہے۔

سرسید کے آخری سال بڑی مایوسی کے تھے۔ کالج کمیٹی نے سید محمود کو جائنٹ سیکرٹری بنانا قبول کر لیا تھا۔ لیکن وہ خود ہی اپنے آپ کو اس ذمہ داری کے ناقابل ثابت کر رہے تھے۔ ٹرسٹی بل پاس ہونے کے تھوڑی دیر بعد انہیں سرکاری ملازمت سے استعفےٰ دینا پڑا۔ اس کے بعد وہ علیگڑھ آ گئے اور باپ کا ہاتھ بٹانے لگے۔ لیکن کثرتِ شراب نوشی نے اُن کے دماغ کا ستیاناس کر دیا تھا اور فرض شناس اور متشرع باپ کے ساتھ ان کا نبھاؤ مشکل تھا۔ چنانچہ کچھ عرصہ بعد وہ علیگڑھ چھوڑ کر لکھنؤ جا بسے۔ جہاں باپ کی نگرانی سے دور ان کی حالت روز بروز بدتر ہوتی گئی۔

اس مصیبت کے علاوہ سرسید کو ایک بڑا بھاری صدمہ یہ ہوا۔ کہ ایک ہندو کلرک نے جسے انہوں نے کالج کا خزانچی مقرر کر رکھا تھا۔ کالج کے حسابات میں سے ایک لاکھ روپے سے زیادہ کا غبن کیا اور یہ روپیہ اس طرح ضائع اور برباد کر دیا کہ پھر وصول نہ ہو سکا۔ ان دو صدموں نے سرسید کے آخری ایام کو بہت مکدر کر دیا۔ اور انکی صحت پر بُرا اثر ڈالا۔ اب ان کی عمر بھی اسّی سال سے زیادہ ہو رہی تھی۔ چنانچہ ۲۷ مارچ ۱۸۹۸ء کو بمقام علیگڑھ

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۵۷)

پڑتی ہے۔ اب تجربہ کار لوگ اس کو تسلیم کرتے جاتے ہیں۔ کہ اسلامی بورڈنگ بنانا زیادہ مفید ہے۔ جس میں اخلاق اور مذہبی تربیت ہو۔ باقی تعلیم تو کسی اسکول میں حاصل کریں گے"۔

ان کا انتقال ہوگیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون ۰

مرض الموت میں ہذیان کی حالت طاری ہونے سے پہلے قرآن شریف کی یہ آئتیں برابر اُن کی زبان پر جاری تھیں۔ حَسْبِیَ اللّٰہُ وَنِعْمَ الْوَکِیْلُ نِعْمَ الْمَوْلٰی وَنِعْمَ النَّصِیْرُ ۰ اِنَّ اللّٰہَ وَمَلٰٓئِکَتَہٗ یُصَلُّوْنَ عَلَی النَّبِیِّ یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَیْہِ وَسَلِّمُوْا تَسْلِیْمًا ۰

محسن الملک

جب سر سید کی وفات ہوئی۔ تو کالج کی کشتی ہچکولے کھا رہی تھی۔ کالج پر اس وقت پچاس ہزار روپے کا قرض تھا اور آمدنی معمولی اخراجات کی بھی کفیل نہ تھی۔ چندہ غبن کے واقع کے بعد ہی آنا بند ہوگیا تھا۔ اب طلبا نے بھی کالج چھوڑنا شروع کر دیا۔ ۱۸۹۵ء میں ۵۶۵ طلبا کالج میں پڑھتے تھے۔ اس کے بعد طلبا کی تعداد میں بھی بتدریج کمی ہونی شروع ہوئی۔ حتٰی کہ ۳۱ مارچ ۱۸۹۸ء کو یعنی سر سید کی وفات سے چار روز بعد طلبا کی تعداد فقط ۳۴۳ تھی۔ کالج کے لئے یہ بڑا نازک وقت تھا۔ اور ڈر تھا کہ کہیں سر سید، مولوی سمیع اللہ اور قوم کے دوسرے خادموں کی ساری محنت اکارت نہ جائے۔ لیکن کالج کے ٹرسٹیوں نے اس موقعے پر بڑی سمجھ سے کام لیا۔ سر سید کی وفات کے بعد تھوڑی دیر تک سید محمود نے سیکرٹری کے طور پر کام کیا۔ لیکن یہ ظاہر ہوگیا تھا کہ اب اُن میں کالج کی ناؤ کو سنبھالنے کی ہمت نہیں۔ ٹرسٹیوں نے اتفاق رائے سے نواب محسن الملک کو سر سید کا جانشین چنا اور ٹرسٹی بورڈ کا معتمد بنایا۔ نواب محسن الملک کی کامیاب سیکرٹری شپ کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ کالج کے طلبا کی تعداد جو سر سید کی وفات کے بعد ۳۴۳ تھی۔ نواب محسن الملک کی وفات کے وقت ۸۰۰ تھی اور کالج کی سالانہ آمدنی جو ۱۸۹۸ء میں ۷۶ ہزار تھی۔ نو سال میں ڈیڑھ لاکھ ہوگئی۔ پانچ چھ سال میں مسلم یونیورسٹی کے لئے چھ لاکھ کا چندہ جمع ہو گیا۔ اس کے علاوہ کالج کے طلبا کی شہرت عروج پر تھی۔ اور علیگڑھ کالج کا طالب علم ہونا ایک بڑی خوبی سمجھا جاتا تھا۔ سر سید کی زندگی میں علما اُن کے مخالف رہے۔ لیکن نواب محسن الملک کے شفیقانہ طرزِ عمل نے ان کی سب شکائتیں دور کر دیں۔ اور شاہ سلیمان (پھلواری شریف) اور کئی دوسرے علما ایجوکیشنل کانفرنس میں باقاعدہ شریک ہوتے رہے۔ کالج کے معائنے کے لئے نہ صرف پرنس آف ویلز تشریف لائے۔ بلکہ امیر حبیب اللہ

نے بھی قدم رنجہ فرمایا۔ اور جب انہوں نے کالج کے طلباء سے کلام مجید سن کر اور مذہبی امور کے متعلق سوالات پوچھ کر اپنی تشفی کر لی تو بآوازِ بلند اعلان کیا کہ جو لوگ کالج کو بُرا کہتے ہیں وہ جھوٹے ہیں" ہمہ دروغ است و کذب و بدگوئی"۔

قوم کے جس محسن نے آٹھ نو سال میں کالج کو نئی زندگی اور نیا وقار دیا۔ اُس کا نام سید مہدی علی تھا۔ سید صاحب ۹ دسمبر ۱۸۳۷ء کو بمقام اٹاوہ پیدا ہوئے۔ اُن کی تعلیم بھی سرسید۔ حالی۔ شبلی وغیرہ کی طرح قدیم طرز کے اسلامی مدرسوں ہی میں ہوئی تھی۔ اس کے بعد وہ دس روپے کے مشاہرے پر بطور ایک کلرک کے ملازم ہوئے لیکن خداداد استعداد موجود تھی۔ ترقی کرتے کرتے تحصیلدار ہو گئے۔ اور جب ۱۸۶۷ء میں ڈپٹی کلکٹری کے امتحان میں شریک ہوئے۔ تو سب اُمیدواروں میں اوّل آئے۔ وہ یو۔ پی میں ڈپٹی کلکٹر تھے کہ سالار جنگ کی نگاہِ انتخاب اُن پر پڑی اور ۱۸۷۱ء میں انسپکٹر جنرل آف ریونیو ہو کر وہ حیدرآباد چلے گئے۔ یہاں انہوں نے بڑی محنت اور فرض شناسی سے کام کیا۔ ایک سرکاری کام کے سلسلے میں ولایت گئے۔ وہاں گلیڈسٹون اور دوسرے زعماء سے ملے۔ ریاست میں مختلف عہدوں پر مامور رہے۔ منیر نواز جنگ محسن الدولہ محسن الملک کے خطاب سے شرف یاب ہوئے۔ لیکن چند وجوہات کی بنا پر انہیں حیدرآباد چھوڑنا پڑا۔ اور ۱۸۹۳ء میں وہ پنشن پاکر علیگڑھ آ مقیم ہوئے۔ یہاں انہوں نے سرسید کی جو مدد کی اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے! حالی جس نے سرسید کے باقی شرکائے کار کے حالات اسلئے نہیں لکھے۔ کہ "جو شخص مدرستہ العلوم کی ہسٹری لکھیگا وہ اس فرض کو فراموش نہیں کرے گا۔" نواب محسن الملک کے متعلق لکھتا ہے۔ "لیکن ایک شخص جو سرسید کے کاموں کا مددگار ہی نہ تھا۔ بلکہ اس گاڑی کے ہانکنے میں گویا برابر کی جوڑ تھا۔ اگر اس موقع پر اس کا ذکر قلم انداز کیا گیا تو ہمارے نزدیک سرسید کی کامیابی کا ایک بڑا سبب بیان کرنے سے رہ جائے گا"۔

نواب محسن الملک کے تمام کارنامے گنانے کی یہاں گنجائش نہیں۔ لیکن ان کی ایک آدھ خصوصیت کا ذکر کرنا ضروری ہے۔ جس نے ان کا کام بہت آسان کر دیا تھا۔ سرسید سے عام مسلمانوں بلکہ ان کے ساتھیوں کو یہ شکایت تھی۔ کہ ان کا طرزِ عمل تحکمانہ ہے۔ دوسرے ان کے مذہبی عقائد سے اُن کے شرکائے کار کو اختلاف تھا۔ اس لئے اُن کے ساتھ مل کر کام کرنا آسان نہ تھا۔ یہ صحیح ہے کہ قوم کے خادم یہ سمجھتے تھے۔ کہ قوم کی بہتری سرسید کی تعلیمی اور اجتماعی کوششوں کی کامیابی میں ہے۔ اور اس لئے وہ ان اختلافات

اور مشکلات کے باوجود سرسید کے کام میں دل سے شریک رہے۔ لیکن ظاہر ہے کہ یہ شرکت ان کے لئے بہت آسان نہ تھی۔ اور سرسید کے زیر قیادت کام کرنا بعضوں کو بارِ خاطر تھا۔ نواب محسن الملک کے ساتھ کام کرتے ہوئے یہ دشواری پیدا نہ ہوتی تھی۔ وہ ہر ایک کا دل ہاتھ میں رکھتے تھے۔ طبعاً حلیم تھے اور اس نکتے سے بھی خوب واقف تھے۔ کہ ایک جزوی یا مشکوک اصلاح کے لئے قوم کے مستقبل یا اپنے سارے تعلیمی پروگرام کو خطرے میں ڈالنا قومی ہمدردی کا راستہ نہیں۔ باہمی مفاہمت اور ایک دوسرے کا نقطہ نگاہ سمجھنا اجتماعی زندگی کی بنیاد ہے۔ چنانچہ انہوں نے عام مسلمانوں کے دلوں میں علیگڑھ کے متعلق اختلافات بہت کم کر دئے اور چونکہ سارے مسلمان علیگڑھ کالج کو اپنی انسٹی ٹیوشن سمجھنے لگے۔ اس لئے انہوں نے اسکی ترقی میں اتنی کوشش کی کہ سرسید کے رفقا خود حیران رہ گئے۔ اور بقول ایک ظریف کے اگر سرسید کو معلوم ہوتا۔ کہ میری موت کے بعد میرے کاموں میں لوگ اتنی کوشش کریں گے۔ تو وہ بن آئی مرجاتے۔

علی گڑھ کالج اور "محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس" کے مہتمم ہونے کے علاوہ نواب محسن الملک سرسید کے سیاسی جانشین بھی تھے۔ اور ان کا اہم ترین کام اس وفد کا اہتمام تھا۔ جو لارڈ منٹو کے پاس فرقہ وارانہ انتخابات کا مسلک منوانے کے لئے حاضر ہوا۔ اس کام کے لئے انہوں نے قوم کے سربرآوردہ ستر اراکین کو چنا۔ نواب عماد الملک بلگرامی سے اپنے مطالبات عرضداشت کی صورت میں لکھوائے۔ وہ چاہتے تو وفد کی قیادت خود

لہ خود محسن الملک بقول حالی" سرسید سے کیا مدرسے کے انتظام کے متعلق اور کیا مذہبی مسائل کے متعلق وہ اکثر اختلاف کرتے تھے۔ مگر مخالفت کبھی نہیں کی" مولوی سمیع اللہ خان نے الفنسٹن کی تاریخ کے متعلق سرسید سے اختلاف کیا تھا۔ اور سرسید کا دل ان سے کبھی صاف نہیں ہوا۔ لیکن جب قوم کے فائدے اور علی گڑھ کالج کے قیام کا سوال پیدا ہوا۔ تو فوراً میدان میں آئے۔ اور "محمڈن اینگلو ورنیکلر ہائی اسکول علی گڑھ کو کامیاب بنا کے دکھایا۔ اسی طرح مولٰنا نذیر احمد اور سرسید کے ذاتی تعلقات خوشگوار نہ تھے۔ لیکن انہوں نے سرسید کے کام کی پوری طرح حمایت کی۔ اور محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کی ایک بڑی کشش مولانا نذیر احمد کی تقریریں ہوتی تھیں۔

کرتے۔ لیکن اُن کی نگاہِ انتخاب ہز ہائی نس آغا خان پر پڑی۔ یہ وفد یکم اکتوبر ۱۹۰۶ء کو وائسرائے کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اور اپنے مقاصد میں کامیاب رہا۔ اس کے بعد محسن الملک ایک پولیٹیکل ایسوسی ایشن کے قیام میں کوشاں ہوئے۔ چنانچہ ۳۰ر دسمبر ۱۹۰۶ء کو بمقام ڈھاکہ مسلمانوں کا ایک نمائندہ جلسہ ہوا۔ جس میں "آل انڈیا مسلم لیگ" قائم کرنے کا فیصلہ ہوا۔ اور نواب محسن الملک، اور نواب وقار الملک اس کے سیکرٹری منتخب ہوئے۔

محسن الملک کا زمانۂ قیادت ٹھوس قومی کاموں کے لئے ممتاز ہے۔ لیکن اُن کے حالاتِ زندگی دیکھنے سے یہ خیال ہوتا ہے۔ کہ انتہائی ایثار۔ حزم و احتیاط۔ راست بینی اور ٹھوس قومی خدمت کے باوجود انہیں قومی زندگی میں سکون نصیب نہیں ہوا۔ اور کالج کی معتمدی اُن کے لئے کانٹوں کی سیج بنی رہی ہے۔ اسکی متعدد وجوہات تھیں۔ ایک تو سید محمود اور دیگر با اثر ٹرسٹیوں کی مخالفانہ کوششیں۔ دوسرے حالات کی تبدیلی۔ اُس زمانے میں علی گڑھ کالج اور قوم کو جن مسائل سے واسطہ پڑا تھا۔ اُن کے حل کرنے کے لئے بڑے تدبر اور انتہائی فہم و فراست کی ضرورت تھی۔ لیکن کالج کے اندر ہی نوجوانوں کا ایک ایسا گروہ پیدا ہو گیا تھا۔ جو ان خوبیوں کی اہمیت نہ سمجھتے تھے۔ اور شخصی اور جزوی شکایتوں کی بنا پر جوش میں آجاتے تھے۔ نواب محسن الملک عملی آدمی تھے اور جانتے تھے کہ خیر کثیر کیخاطر اکثر شر قلیل گوارا کرنا پڑتا ہے لیکن نوجوانوں کے نزدیک طرزِ عمل کمزوری پر دال تھا۔ نواب محسن الملک کمزوری کے طعنوں سے کبھی نہ ڈرے۔ اور انہوں نے ہمیشہ وہی کیا جسے قوم کے صحیح مفاد کے لئے ضروری سمجھتے لیکن ایک بے غرض اور حساس دل پر ان طعنوں کا جو اثر ہوتا ہو گا وہ ظاہر ہے۔

نواب محسن الملک کے آخری ایام علی گڑھ کالج کی سٹرائک نے بہت مکدر کر دیئے اور حقیقتاً یہی واقعہ ان کی موت کا باعث ہوا۔ اُن کی وفات ۱۶ر اکتوبر ۱۹۰۷ء کو بمقام شملہ ہوئی اور علیگڑھ میں دفن ہوئے۔

جس سال نواب صاحب فوت ہوئے۔ اس سال کانفرنس کا اجلاس کراچی میں تھا۔ محسن الملک کے آخری ایام کی بے لطفی کا رنج سب کو تھا۔ لیکن ان کے عملی کارنامے دیکھ کر طبیعت کو سہارا ہونا تھا۔ حالی نے نظم پڑھی ؎

وہ مُلک کا محسن۔ وہ مسلمانوں کا غمخوار
سر کر کے مہم قوم کے کام آگیا آخر!

حالیؒ

کہا جاتا ہے کہ مسلمانوں میں خاموش اور مخلص کارکن کم ہیں۔ اور جو کوئی قوم کی خدمت کرتا ہے اپنی خدمات کو بہت بڑھا کر بیان کرتا ہے اور استحقاق سے زیادہ صلہ چاہتا ہے۔ یہ شکایت اگر صحیح ہے تو خوش قسمتی سے کئی مسلمان اس کلیہ سے مستثنٰی بھی ہیں۔ محسن الملک کا ذکر ہم کر چکے ہیں۔ لیکن اس خصوصیت میں شاید حالی اُن سے بھی بڑھا ہوا ہے۔ حالی نے قوم کی روحانی - ادبی اور اخلاقی اصلاح میں بڑا حصہ لیا ہے۔ لیکن اپنا اور اپنی کوششوں کا ذکر ہمیشہ اس کسر نفسی سے کیا ہے کہ ناواقف دھوکا کھا جاتا ہے۔ اور ان کے کارناموں کو کسی اور کی کوششوں کا پھل سمجھ لیتا ہے ÷

حالی نے اردو شاعری کی اصلاح میں سب سے زیادہ حصہ لیا ہے۔ مقدمہ شعر و شاعری میں پرانی شاعری کے نقائص اور جدید شاعری کے اصول اس عقل سمجھ اور قابلیت سے سمجھائے اور شاعرانہ تنقید کا ایسا دستور العمل مرتب کیا۔ جس کا جواب اردو تو کیا دنیا کی بہت کم زبانوں میں ملے گا۔ اس کے علاوہ مولینا نے جدید شاعری کے جسمِ بے جان میں قومی شاعری کی رُوح ڈالی اور اس میں کئی مضامین اس پُر اثر طریقے سے ادا کئے۔ کہ جدید شاعری کو قوم کے ادب میں ایک ممتاز جگہ مل گئی۔ ظاہر ہے کہ جدید اردو شاعری کا اصل بانی حالی کے سوا کوئی نہیں۔ لیکن حالی کی تحریریں دیکھیں تو ہم یہی کہیں گے کہ جدید شاعری کی بنیاد آزاد نے ڈالی۔ اردو شاعری کی کایا پلٹنے کے علاوہ مولانا نے اردو نثر میں بھی بیش بہا اضافہ کیا۔ اردو زبان میں علمی تنقید کی بنیاد انہی نے ڈالی۔ سیرت نگاری کا نیا رنگ انہی نے اختیار کیا "حیاتِ سعدیؒ" "حیاتِ جاوید" اور اردو کی مقبول ترین سوانح عمری "یادگارِ غالب" انہی کے قلم سے نکلیں۔ اِن سب باتوں سے ظاہر ہے کہ اردو ادب کی حیاتِ تازہ میں جتنی کوششیں انہوں نے کیں۔ شاید ہی کسی اور نے کی ہوں لیکن جب اردو ادب کے محسنوں کا ذکر آتا ہے تو حالی چپکے سے سرسید کی طرف اشارہ کر دیتے ہیں۔ کہ "فادر آف اردو لٹریچر" تو وہ ہیں ÷

قومی اصلاح کے معاملے میں بھی یہی حال ہے "حیاتِ جاوید" اور حالی کے مضامین پڑھیں تو یہی خیال ہوتا ہے۔ کہ قوم کی اصلاح فقط سرسید نے کی اور قوم کی بیداری میں علیگڑھ کالج۔ "تہذیب الاخلاق" اور "ایجوکیشنل کانفرنس" کے علاوہ اور کسی چیز کا ہاتھ نہیں۔ لیکن اہلِ بصیرت جانتے ہیں۔ کہ مسلمانانِ ہندوستان

کی بیداری میں "مسدّسِ حالی" نے بھی علیگڑھ کالج کے قیام سے کچھ کم کام نہیں کیا۔ سر سید خود اس کتاب کی اہمیت سے واقف تھے۔ مسدّس ان کے ایما پر لکھا گیا اور وہ کہتے ہیں "بے شک میں اس کا محرک ہوا ہوں اور اس کو میں اپنے اُن اعمالِ حسنہ میں سے سمجھتا ہوں کہ جب خدا پوچھیگا تو کیا لایا۔ میں کہوں گا کہ میں حالی سے مسدّس لکھوا لایا ہوں اور کچھ نہیں"۔

آج قوم اس گڑھے سے کسی حد تک نکل چکی ہے۔ جس کی پستی اور ذلت "مسدسِ حالی" کا موضوع تھا۔ اس کے علاوہ قوم کا مذاق گذشتہ تیس سال میں بہت کچھ بدل گیا ہے۔ آج مسدّس کے مضامین پوری طرح سمجھنا اور اس انقلاب کا اندازہ کرنا جو اس کتاب نے ہندوستانی مسلمانوں کی زندگی میں پیدا کر دیا تھا۔ بہت آسان نہیں لیکن خوش قسمتی سے ابھی کئی ایسے لوگ موجود ہیں جنہوں نے وہ زمانہ دیکھا ہے جب حالی نے اپنا مسیحائی صور پھونکا تھا۔ اور جس کی آواز سے قوم میں نئی زندگی کی لہر دوڑ گئی تھی۔ مولوی عبدالحق نے اپنے ایک مضمون میں ایک دعوت کا ذکر کیا ہے۔ جو ان کے ماموں زاد بھائی کے ختنے پر پنجاب کے ایک گاؤں میں ہوئی۔ انہوں نے اُس ساحرانہ اثر کی تصویر کھینچی ہے جو آج سے پچاس سال پہلے مسدّس کے سننے سے "ان پڑھ اُجڈ گنواروں" پر ہوتا تھا۔ وہ لکھتے ہیں۔ "صبح کا وقت تھا۔ میدان میں بہت بڑا شامیانہ تنا ہوا تھا۔ اور اس میں لوگ کھچا کھچ بھرے ہوئے تھے۔ بلکہ مجمع شامیانے سے بہت دور تک پھیلا ہوا تھا۔ اس میں زیادہ تر اس گاؤں اور آس پاس کے گاؤں کے کسان اور مزدور تھے۔ اتنے میں ایک طوائف اٹھی۔ یہ لاہور سے بلائی گئی تھی . . . . اُس نے کھڑے ہو کر مجمع پر ایک نظر ڈالی۔ اور یک بار گی مسدّسِ حالی گانا شروع کیا ؎

کسی نے یہ بقراط سے جا کے پوچھا
مرض تیرے نزدیک مہلک ہیں کیا کیا

جب تک وہ گاتی رہی۔ سناٹے کا عالم رہا۔ کچھ لوگ جھوم رہے تھے اور کچھ آبدیدہ تھے۔ وہ سماں اب تک میری نظروں کے سامنے ہے اور وہ گانا اب تک میرے کانوں میں گونج رہا ہے"۔

جب حالی نے مسدّس کا حقِ تصنیف "مدرسۃ العلوم" کو دینا چاہا تو سر سید نے نہایت سچے کی بات

کہی۔ انہوں نے لکھا میں نہیں چاہتا کہ اس مسدّس کو جو قوم کے حال کا آئینہ اور یاروں کے ماتم کا مرثیہ ہے۔ کسی قید میں مقید کیا جائے۔ جس قدر چھپے اور جس قدر وہ مشہور ہو اور لڑکے ڈنڈوں پر گاتے پھریں۔ اور رنڈیاں مجلسوں میں طبلے سارنگی پر گاویں۔ قوال درگاہوں میں گاویں۔ حال لانے والے اس سچّے حال پر حال لاویں۔ اُسی قدر مجھ کو زیادہ خوشی ہو گی"۔

مسدّس کی مقبولیت فوری تھی اور قوم کے کسی خاص طبقے تک محدود نہ تھی۔ پہلا ایڈیشن ۱۸۷۹ء میں چھپا اور اس کے سات سال بعد حالی لکھتے ہیں "اگرچہ اس نظم کی اشاعت سے شاید کوئی معتدبہ فائدہ سوسائٹی کو نہیں پہنچا۔ مگر چھ برس میں جس قدر مقبولیت یا شہرت اس نظم کو اطراف ہندوستان میں ہوئی۔ وہ فی الواقع تعجب انگیز ہے. . . . . . اس تھوڑی سی مدت میں یہ نظم ملک کے اطراف و جوانب میں پھیل گئی۔ ہندوستان کے مختلف اضلاع میں اس کے سات ایڈیشن اب سے پہلے چھپ چکے ہیں۔ بعض قومی رسول میں اس کا انتخاب بچوں کو پڑھایا جاتا ہے۔ مولود شریف کی مجلسوں میں جا بجا اس کے بند پڑھے جاتے ہیں۔ اکثر لوگ اس کو پڑھ کر بے اختیار روتے اور آنسو بہاتے ہیں۔ اِس کے بند ہمارے واعظوں کی زبان پر جاری ہیں[1]۔ کہیں کہیں قومی ناٹک میں اس کے مضامین ایکٹ کیے جاتے ہیں۔ بہت سے مسدّس

---

[1] خط کشیدہ الفاظ حالی کے ہیں۔ اس کے باوجود سید سلیمان ندوی لکھتے ہیں۔ "اُس مسدس کا لکھنا تھا۔ کہ مذہبی شاعروں نے اس کا جواب لکھا. . . . . کافر گروں نے اس کے بعض مضامین کی بنا پر فتوے مرتب کیے عام مسلمانوں نے اس کے چبھتے ہوئے نشتروں پر شور و غل کیا۔ مگر بادِ مخالف کے یہ جھونکے سچائی کے اس پہاڑ کو اپنی جگہ سے ہٹا نہ سکے!" اب ہم حیران ہیں کہ حالی سچا تھا۔ جو کہتا ہے کہ چھ سال کے عرصے میں مسدس کے بند مولود شریف کی مجلسوں میں اور واعظوں کی زبان پر جاری ہو گئے یا سید صاحب! حقیقت یہ ہے کہ علما کو ہر اچھی چیز کا مخالف سمجھنے کا فیشن اس قدر عام ہے کہ بڑے بڑے بزرگ بھی اس سے نہیں بچ سکتے اور ان خیالات کا اظہار کرتے ہوئے واقعات کو نہیں پرکھتے۔ اس کے علاوہ قوم کو ہر حالت میں ظالم بنایا جاتا ہے اور ہر ہیرو کو مظلوم! یہ خیال بھی واقعیت سے خالی ہے اور ہر وہ شخص جو ہتھیلی پر سرسوں جمانے کو ایک خیال موہوم سمجھتا ہے اور واقعات پر نہایت ٹھنڈے دل سے غور کرتا ہے۔ جانتا ہے کہ ہندوستانی

اس کی روشن پر اسی بحر میں ترتیب دئے گئے"۔

مُسدّس نے قوم کی بیداری کا پیغام اس حلقے تک پہنچایا۔ جہاں علیگڑھ کالج یا کانفرنس کی رسائی نہ تھی۔ ان دونوں کا حلقہ تعلیم یافتہ طبقے تک محدود تھا۔ لیکن مسدس کی سادہ زبان اور سیدھے سادھے خیالات جتنے خواص کو مرغوب تھے۔ اتنے ہی عوام کو عزیز تھے۔ بہت سے لوگ علیگڑھ کالج کے مخالف بھی تھے لیکن مسدس کی مخالفت کون کرتا۔ یہ کسی نئے مذہب کا پرچار نہ تھا۔ اس میں شہد کے ساتھ سرکہ نہ ملایا گیا تھا۔ حالی کے آنسو خالص آبحیات کے چھینٹے تھے۔ دل سے نکلے ہوئے۔ درد سے بھرے ہوئے۔ کون ایسا سنگدل تھا۔ جو ان کی قدر نہ کرتا اور انہیں زمین پر پامال ہونے دیتا!

مسدّس کی قدر و قیمت کا اندازہ کرنے کے لئے ایک مستقل کتاب کی ضرورت ہے۔ ظاہر ہے۔ کہ جس نظم نے سات کروڑ آدمیوں کی قسمت بدل دی ہو اس کی اہمیت کس قدر ہوگی اور اس میں کوئی شک نہیں کہ مسدس دنیا کی پانچ سات اہم ترین طویل نظموں میں سے ہے۔ حالی اگر قوم کا یہ مرثیہ لکھدیتے اور اس کے علاوہ کچھ نہ کرتے۔ تب بھی قوم کے محسنوں میں ان کا شمار سر سید اور محسن الملک کے ساتھ ساتھ ہوتا۔ لیکن مسدس لکھنے کے علاوہ حالی نے بہت کچھ کیا۔ اردو شاعری کی تو انہوں نے تاریخ ہی بدل ڈالی۔ آج تک اُردو اور

بقیہ حاشیہ صفحہ ۶۵

مسلمانوں نے بالعموم ہر اہم مرحلے پر بڑی سمجھ کا ثبوت دیا ہے۔ اور افراد یا تصانیف کی مناسب قدر کرنے میں کوتاہی نہیں کی۔ حالی خود جس کی نظر حالات کے اقتضا سے قوم کے نقائص پر زیادہ تھی۔ مسدّس کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے "اگر قوم کے دل میں متاثر ہونے کا مادہ نہ ہوتا تو یہ اور ایسی ہزار نظمیں بیکار تھیں۔ پس مصنف کو اگر فخر ہے تو صرف اس بات پر ہے کہ اس نے زمینِ شور میں تخم ریزی نہیں کی اور پتھر میں جونک نہیں لگانی چاہی۔ اُس نے ایک ایسی جماعت کو مخاطب گردانا ہے۔ جو بے راہ ہے پر گمراہ نہیں ہے۔ وہ رستے سے بھٹکے ہوئے ہیں مگر رستے کی تلاش میں چپ و راست نگران ہیں۔ اُن کے ہُنر مفقود ہو گئے ہیں۔ مگر قابلیت موجود ہے۔ اُنکی صورت بدل گئی ہے۔ مگر ہیولیٰ باقی ہے۔ اُن کے قویٰ مضمحل ہو گئے ہیں۔ مگر زائل نہیں ہوئے۔ اُن کے جوہر مٹ گئے ہیں۔ مگر جلا سے پھر نمودار ہو سکتے ہیں۔ اُن کے عیبوں میں خوبیاں بھی ہیں۔ مگر چھپی ہوئی۔ اُن کے خاکستر میں چنگاریاں بھی ہیں۔ مگر دبی ہوئی"۔

فارسی شاعری میں شعر کی خوبی الفاظ کے انتخاب تشبیہوں کی جدت اور مضمون کی شگفتگی پر منحصر تھی۔ اُن کاغذی پھولوں کو خلوص جذبات کی ضرورت ہی نہ تھی۔ حالی نے شعر کی بنیاد خالص جذبات پر رکھی۔ فنی خوبیوں اور لفظی تراش خراش پر نہیں۔ اُن کی نظموں کو اگر حیاتِ جاوید حاصل ہے تو خلوص اور درد کی وجہ سے ہے۔ نہ کہ فنی خوبیوں کی وجہ سے! اِن میں خامیاں ہیں۔ لیکن خلوص۔ جوش اور سچائی نے سیدھے سادھے الفاظ میں جان ڈال دی اور انہیں الہامی درجہ دے دیا ہے۔ حالی کا قول تھا ؎

اَے شعرِ دلفریب نہ ہو تو تو غم نہیں

پر تجھ پہ حیف ہے جو نہ ہو دلگداز تو!

لیکن یہ یاد رہے کہ کلام حالی کا درد اور اسکی سچائی کسی ادبی اصول کی پیروی کا نتیجہ نہ تھی۔ بلکہ یہ حالی کی اپنی بلند اور پاکیزہ سیرت کا عکس تھا۔ حالی ایک غریب خاندان کا چشم و چراغ تھا۔ نواب مصطفےٰ خان شیفتہ کا ایک معمولی ملازم تھا۔ لیکن آخر کیا بات تھی کہ سید محمود جن کی آزاد طبعی مشہور ہے کہتے تھے۔ "اگر خدا مجھ سے کبھی یہ سوال کرے کہ میرے جتنے بندوں سے تو مِلا ہے اُن میں سے کون ایسا ہے کہ جس کی پرستش کرنے کے لئے تیرا دل تیار ہو جائے تو میرا جواب حاضر ہے اور وہ یہ ہے کہ وہ شخص الطاف حسین حالی ہے"۔ خواجہ غلام الثقلین حالی کو ایک "صاحبِ باطن ولی" کہتے تھے۔ حالی کی سیرت کا یہ اندازہ صرف معاصرانہ رایوں پر منحصر نہیں بلکہ انکی تصانیف سے بھی انکی انصاف پسندی میانہ روی۔ بالغ نظری۔ خلوص۔ قومی درد اور بے غرضی ٹپکتی ہے۔ بے شک دہلی نے شیفتہ۔ حکیم محمود خان۔ حکیم اجمل خان جیسے کئی فرشتہ خصلت پاکیزہ سیرت انسان پیدا کئے ہیں جن کی روزمرّہ کی زندگیاں اسلامی روایات کی بہترین ترجمان اور صحابہ کرام کی زندگیوں کا صحیح نمونہ تھیں لیکن فنا فی القوم ہونے کا جو درجہ حالی کو ملا وہ کسی اور کو نصیب نہیں ہُوا۔ حالی میں سرسید کی سی وجاہت اور انتظامی قابلیت نہ تھی۔ لیکن قومی درد اور بے غرضی میں وہ سرسید سے بھی بڑھا ہُوا تھا۔ حالی قوم کا ایک خادم تھا جس نے ہمیشہ کٹھن کام اپنے ہاتھ میں لیا۔ اپنے طبعی جوہر اور خلوص سے اس میں کمال پیدا کیا۔ لیکن حق الخدمت لینے سے بھاگتا رہا۔ بقول خواجہ غلام السیدین کے "سرسید کے حلقۂ احباب اور رفقا میں جو بڑے بڑے مشاہیر اور قابلِ احترام لوگوں پر مشتمل تھا۔ حالی کی سیرت سب سے برتر اور بلند تھی"۔ حالی کی یہی پاکیزہ اور بلند سیرت تھی جس کا

عکس اس کی تصانیف میں ہے۔ "اُن کی شاعری میں بھی وہی خالص سونا دمکتا ہے جس سے اُن کی فطرت کا خمیر تیار ہوا تھا۔ اُن میں تصنع اور تکلف کا شائبہ تک نہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا ہر لفظ جو دل سے نکلتا ہے بجلی بن کر دل پر گرتا ہے"!

حالی کا کام علی گڑھ کالج کی تاسیس کی طرح اینٹ اور پتھر پر نہیں لکھا ہوا اور سطحی نظریں اس کا صحیح اندازہ نہیں کر سکتیں۔ لیکن جو لوگ فقط ظاہری کاموں سے متاثر نہیں ہوتے اور شاعری کی "نیم پیغمبرانہ" خوبیوں پر نظر رکھتے ہیں۔ وہ حالی کی اہمیت سے خوب واقف ہیں۔ اور جانتے ہیں کہ مسلمانانِ ہند کی عام بیداری میں حالی سر سید کا برابر کا شریک تھا۔ بقولِ اقبال ؎

آں لالۂ صحرا کہ خزاں دید و بفسرد
سید وگر اُو را نے از اشکِ سحر داد
حالی ز نواہائے جگر سوز نیاسود
تا لالۂ شبنم زدہ را داغِ جگر داد!

علیگڑھ تحریک

ایک ڈچ مبصر نے سید جمال الدین، مفتی محمد عبدہٗ اور سر سید کا مقابلہ کر کے لکھا ہے۔ کہ اگرچہ سر سید کی شہرت ہندوستان سے باہر نہیں ہوئی لیکن قابلیت اور ٹھوس اسلامی خدمات کے لحاظ سے وہ انیسویں صدی کے سب سے بڑے مسلمان ہیں اور انہوں نے اسلام کی خدمت باقی دونوں بزرگوں سے زیادہ کی۔ ہم نے سر سید کی غلطیوں پر پردہ ڈالنے کی کوئی کوشش نہیں کی۔ لیکن ہمیں اس رائے سے پورا اتفاق ہے کہ اسلام کی نشاۃِ ثانیہ کی تاریخ میں سر سید سے بہتر دل و دماغ والا رہنما (ابھی تک) پیدا نہیں ہوا۔ وہ آٹھ کروڑ ہندوستانی مسلمانوں کے متعلق کہہ سکتے ہیں ؎

ہجو مے بُود رہ گم کردہ در دشت
ز آوازِ درایم کارواں شُد!

جب سر سید نے اپنی قومی زندگی کا آغاز کیا۔ اس وقت مسلمان بکھرے ہوئے تھے تعلیمی معاشرتی اور

سیاسی حیثیت سے ذلیل تھے۔ اور روز بروز زیادہ ذلیل ہو رہے تھے۔ اُن کا کوئی مرکز نہ تھا۔ کوئی لائحۂ عمل نہ تھا۔ نتیجہ یہ تھا۔ کہ جس طرح جوہڑ میں کھڑا ہُوا پانی آئے دن زیادہ بدبودار اور غلیظ ہوتا جاتا ہے اسی طرح مسلمان بھی بگڑتے جاتے تھے۔ سرسید کی آواز نے انہیں جونکا دیا۔ مسلمانوں کی ایک خصوصیت ہے۔ کہ جب اُن کے سامنے کوئی دلنشیں لیکن قابلِ عمل اور ٹھوس مطمع نظر رکھا جاتا ہے تو وہ اس کے لئے بڑے جوش اور بڑی مستعدی سے آگے بڑھتے ہیں۔ سرسید نے قوم کے سامنے علی گڑھ کالج کا خواب پیش کیا۔ اور قوم نے اس خواب کو پورا کرنے کے لئے سرسید کا ساتھ دیا۔ قوم کے بہترین دماغوں اور قابل ترین فرزندوں۔ حالی محسن الملک۔ شبلی۔ نذیر احمد۔ ذکاء اللہ سب نے سرسید کی صدا پر لبیک کہا۔ قوم کے اندر ایک نئی زندگی پیدا ہوگئی۔ مولانا شبلی نے مثنوی "صبحِ اُمید" میں سرسید کی کوششوں کا ذکر کرتے ہوئے اس نئی زندگی اور عام بیداری کا خوب نقشہ کھینچا ہے۔ وہ لکھتے ہیں ؎

باتوں میں اثر تھا کس بلا کا — اِک بار جو رُخ پھرا ہوا کا
امید کی بڑھ گئی تگ و تاز — اُونچی ہوئی حوصلوں کی پرواز
خواہش کے بدل گئے ارادے — ہمت نے قدم بڑھائے آگے
وہ دوڑ چلے جو پا بگِل تھے — آندھی ہوئے جو فسردہ دل تھے
جو تھا وہ عجیب جوش میں تھا — مخمور بھی اب تو ہوش میں تھا
اب ملک کے ڈھنگ تھے نرالے — اخبار کہیں۔ کہیں رسالے
تعلیم کے جا بجا وہ جلسے — گھر گھر میں ترقیوں کے چرچے
بے تاب ہر ایک جزو و کُل تھا — ہر بار "بڑھے چلو" کا غل تھا

سرسید کے اخلاق و عادات پر حالی نے جو بسیط تبصرہ کیا ہے۔ اُس کے بعد اس موضوع پر طویل اظہارِ خیال غیر ضروری معلوم ہوتا ہے۔ لیکن سرسید کے کیریکٹر کے متعلق بعض با اثر حلقوں میں ایک غلط فہمی عام ہوگئی ہے۔ جس کا ازالہ ضروری ہے۔ ان بزرگوں کا خیال ہے کہ سرسید خوشامد اور چاپلوسی سے بالا نہ تھے۔ اور کالج کی محبت میں انگریز پروفیسروں کے ایما پر قوم کو ایسے مشورے بھی دیتے تھے۔ جن کی صحت

کے وہ خود قائل نہ تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ اگرچہ سرسید غیر خاطی نہ تھے۔ اور اُن سے کئی سخت غلطیاں بھی ہوئیں لیکن اُن میں ریاکاری۔ خوشامد اور کم ہمتی کا شائبہ تک بھی نہ تھا۔ اُن کی اخلاقی جرأت کا اندازہ ہم اس سے کر سکتے ہیں۔ کہ اثنائے ملازمت ہی میں انہوں نے اپنی ساری طاقت اس شخص کے خیالات کی تردید میں صرف کر دی۔ جو اُن کے صوبے کا حاکم اعلیٰ تھا اور اُن کے متعلق ہر طرح کا حکم دے سکتا تھا۔ یہی نہیں بلکہ اس آزادخیالی کی مثالیں ان کی زندگی میں بہت عام ہیں۔ "رسالہ اسبابِ بغاوتِ ہند" انہوں نے اس زمانے میں لکھا۔ جب کورٹ مارشل کے شعلے ابھی بلند تھے۔ آگرے کے دربار سے وہ اس لئے برہم ہو کر اُٹھ آئے۔ کہ دربار میں ہندوستانیوں اور انگریزوں کی کرسیاں برابر نہ تھیں۔ یہ صحیح ہے کہ انہوں نے ایک زمانے میں انڈین نیشنل کانگرس کی مخالفت کی۔ اور بعض لوگ کہتے ہیں کہ یہ مخالفت حکام کی خوشنودی کے لئے کی تھی۔ لیکن یہ بزرگ یہ نہیں سوچتے۔ کہ جس زمانے میں سرسید نے کانگرس کی مخالفت کی۔ اس زمانے میں اس مخالفت سے حکام کی خوشنودی کا کوئی امکان نہ تھا۔ انڈین نیشنل کانگرس کی ابتدائی تاریخ کے متعلق ہمیں یہ بات نہیں بھولنی چاہیئے۔ کہ اس کا قیام لارڈ ڈفرن وائسرائے ہند کے ایما پر ہوا۔ اس کی تاسیس میں سب سے زیادہ کوشش ایک ریٹائرڈ کلکٹر مسٹر ایلن ہیوم نے کی۔ اور جب سرسید نے اس کی مخالفت کی۔ اس وقت کانگرس کے کھلے اجلاس میں منتخبہ نمائندوں کے علاوہ کانگرس کے بہی خواہ سرکاری افسروں کی ایک بڑی جماعت بھی شریک ہوا کرتی تھی[1]۔ سرسید کی سیاسی پالیسی سے ہمیں کوئی بحث نہیں۔ ممکن ہے وہ صحیح ہو۔ ممکن ہے غلط ہو۔ لیکن اتنا تو یقینی ہے۔ کہ اس زمانے کے حالات اور سرسید کے کیریکٹر کو دیکھتے ہوئے اس پالیسی کو کسی خودغرضی یا اخلاقی گراوٹ پر محمول نہیں کیا جا سکتا۔ سرسید میں ریاکاری۔ حکام پرستی اور ذاتی خودغرضی بالکل نہ تھی۔ اور جو لوگ اُن سے یہ باتیں منسوب کرتے ہیں۔ وہ اُن کے حالات زندگی سے بے خبر ہیں ع

سخن شناس نہ دلبرا خطا ایں جاست

---

[1] ملاحظہ ہو (۱) "مسلمانوں کا روشن مستقبل" از مولانا طفیل احمد صفحہ ۲۵۲ (۲) "تاریخ کانگرس" از مسٹر اینڈ ریوز

سرسید نے جس تحریک کی رہنمائی کی۔ اس کے کئی پہلو تھے۔ تعلیمی۔ مذہبی۔ معاشرتی۔ سیاسی۔ ادبی اور اجتماعی نقطۂ نظر سے مسلمانانِ ہند کی جداگانہ قومی تشکیل اگرچہ شاید کسی حد تک ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان چھوت چھات اور اردو ہندی جھگڑے کا نتیجہ تھی۔ لیکن حالی کی نظموں اور سرسید کی پالیسی نے اُسے بہت تقویت دی۔ سرسید علیگڑھ کو مسلمانوں کا سیاسی مرکز بھی بنانا چاہتے تھے اور ۱۹۱۱ء کے قریب تک یہ جگہ قوم کا سیاسی مرکز رہی بھی۔ لیکن ظاہر ہے کہ ایک تعلیمی ادارہ جسے تمام فریقوں کی مدد اور گورنمنٹ کی سرپرستی کی ضرورت ہو۔ ہر قسم کی سیاسیات کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ قوم کی نئی سیاسیات کی وجہ سے علی گڑھ کی سیاسی مرکزیت جاتی رہی۔ اور شاید اب وہ پھر اُسے نصیب نہ ہو۔

ادبی نقطۂ نظر سے "علیگڑھ تحریک" کے سارے پھل میٹھے تھے۔ جدید اردو ادبیات کا آغاز یہیں سے ہوتا ہے۔ سرسید اور اُن کے رفقا نے مسجع اور مقفیٰ اردو نثر کا خاتمہ کر دیا۔ اور ایک نئی طرزِ تحریر کو رائج کیا۔ جو اظہارِ مطلب کے لئے مفید اور سمجھنے میں آسان تھی۔ نئی اردو شاعری کا امام حالی تھا۔ اور مسلمانوں کی تاریخ اور فارسی شاعری کو شبلی نے قوم میں مقبول کیا۔

مذہبی نقطۂ نظر سے سرسید کے اپنے خیالات پر ہم آیندہ صفحات میں تبصرہ کرینگے۔ لیکن یہاں دو باتوں کا ذکر ضروری سمجھتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ "علیگڑھ تحریک" کے رہنما خود مذہبی مسائل میں متفق نہ تھے۔ سرسید نے "جدید کلام" کا آغاز کیا۔ اور اُن کے باقی رفقائے کار بالخصوص حالی۔ محسن الملک اور نذیر احمد ان کے اکثر عقائد سے اختلاف رکھتے تھے۔ اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ "علیگڑھ تحریک" نے قوم کو جس رنگ میں رنگا۔ وہ مذہبی نہ تھا۔ بلکہ حقیقتاً یہ ایک تعلیمی۔ ادبی اور کلچرل تحریک تھی۔ مذہبی تحریک نہ تھی۔ اس کا اصل مقصد قوم کی دنیاوی پستی کو دور کرنا تھا۔ مذہبی احیا اس کا مطمحِ نظر نہ تھا۔ اور یہ صحیح ہے کہ علی گڑھ کے فارغ التحصیل طلبا پر مذہبی رنگ خاص طور پر نمایاں نہیں۔

علیگڑھ کا اہم ترین مقصد تعلیم تھا۔ جسے چند حدود کے اندر اُس نے اچھی طرح پورا کیا۔ علیگڑھ سے سرسید کی بہت سی اُمیدیں وابستہ تھیں۔ لیکن ان کا عملی مقصد اور مطمحِ نظر نسبتاً محدود تھا۔ وہ دیکھتے تھے کہ جب سے مسلمان ہندوستان میں آئے ہیں۔ سرکاری ملازمت اُن کا اہم ترین پیشہ رہی ہے اور

اگر یہ پیشہ بھی اُن کے ہاتھ سے ہمیشہ کے لئے چھن گیا۔ تو وہ اقتصادی طور پر اور بھی پسماندہ ہو جائیں گے۔ ملازمتوں میں مسلمانوں کے پسماندہ ہونے کی دو وجوہ تھیں۔ ایک تو گورنمنٹ کو اُن پر اعتماد نہ تھا۔ دوسرے اعلیٰ تعلیم میں وہ پیچھے تھے۔ سرسید نے علی گڑھ کالج قائم کر کے ان دونوں باتوں کا سدِباب کرنا چاہا۔ کالج میں اعلیٰ تعلیم کا انتظام کیا۔ اور اس کے ساتھ ساتھ یورپین اسٹاف کو اپنی تعلیمی سکیم کا جزو لاینفک بنا کر سرسید نے حکومت اور مسلمانوں کے درمیان حائل شدہ خلیج کو پُر کرنے کی کوشش کی۔ سرسید اور ان کے بعد محسن الملک نے ان اصولوں پر کالج کو چلایا۔ اور ان میں انہیں غیر معمولی کامیابی ہوئی۔ کالج کے قریباً تمام فارغ التحصیل طلبا کو اعلیٰ ملازمتیں مل گئیں۔ اور تعلیم حاصل کرنے کے بعد علیگڑھ کے طلبا مختلف جگہوں میں قومی کاموں کے لئے ایک مرکز بن گئے۔ ان دنوں علیگڑھ کے طلبا کی شہرت عروج پر تھی۔ اور علیگڑھ قوم کی تمام تعلیمی اور اجتماعی اصلاحوں کا مرکز تھا۔

بظاہر علی گڑھ نے سرسید کی توقعات پُوری کر دی تھیں۔ لیکن کالج کا یہ دورِ زرّیں محسن الملک کی وفات کے ساتھ ختم ہو گیا۔ اس کی ایک وجہ بعض اتفاقی حوادث تھے۔ اور دوسری اہم وجہ یہ تھی کہ جن غلط یا صحیح اصولوں پر سرسید نے کالج قائم کیا تھا وہ نظر سے اوجھل ہو گئے۔ سرسید نے ایک اصول پر ہمیشہ عمل کیا تھا۔ وہ یہ کہ کالج کے اندرونی معاملات میں یورپین پرنسپل کو بہت اختیارات تھے۔ اس اصول کے حق میں دو قوی وجوہات تھیں۔ اول یہ کہ جن اُمور کے لئے کوئی افسر جوابدہ ہو۔ ان سے متعلقہ مسائل طے کرنے میں اسے اختیارات ہونے چاہئیں۔ مثلاً اگر کالج کا پرنسپل تعلیمی نتائج اور طلبا کے ڈسپلن وغیرہ کا ذمہ دار ہے تو اُسے اساتذہ کے انتخاب اور کالج یا ہوسٹل کے قواعد میں دخل ہونا چاہیئے۔ اس کے بغیر وہ اپنے فرائض پُوری طرح انجام ہی نہیں دے سکتا۔ ہم مسلمان اس نکتے کی اہمیت اچھی طرح نہیں سمجھتے۔ اور آج بھی ہندوستان میں بہت سے اسلامیہ اسکول ہیں جن کے سیکرٹری تو ایک طرف انتظامیہ کمیٹی کے اراکین بھی اپنا یہ حق سمجھتے ہیں کہ ہم ہیڈ ماسٹر کو جا کر بتائیں کہ کس لڑکے کو پاس کیا جائے اور کس کو فیل۔ اور سکول میں کون سا استاد ملازم رکھا جائے۔ نتیجہ یہ ہے کہ سب سے کامیاب ہیڈ ماسٹر وہ گنا جاتا ہے۔ جو کمیٹی کے اراکین کو خوش کر سکے۔ خواہ طلبا کی اصلاح ہو یا نہ۔ سرسید اس طریقے کی مضرت سے خوب واقف تھے۔ اور انہوں نے ہمیشہ اس اُصول پر عمل کیا۔ کہ

جب تک پرنسپل اپنا کام فرض شناسی اور تندہی سے کرتا رہے۔ اور کالج کی روز افزوں ترقی کا باعث ہو اسے کالج کے اندرونی معاملات میں پورا اختیار دیا جائے۔ اس کے علاوہ سرسید کی اسکیم کے مطابق یورپین اسٹاف قوم اور گورنمنٹ کے درمیان خوشگوار تعلقات پیدا کرنے کا بھی ایک ذریعہ تھا۔ اس لئے سرسید یورپین اسٹاف بالخصوص یورپین پرنسپل کا خاص طور پر پاس رکھتے۔

محسن الملک نے سرسید کا اصول برقرار رکھا۔ لیکن اُن کے زمانے میں پیچیدگیاں پیدا ہونے لگیں۔ ایک تو تمام پرنسپل انہیں سمجھدار اور قابل نہ ملے۔ دوسرے وہ لوگ جنہیں پرنسپل کے کسی فیصلے کے خلاف جائز یا ناجائز ذرا بھی شکایت ہوئی۔ پرنسپل کے مخالف ہو گئے۔ اور اس بات کا چرچا کرنے لگے۔ کہ اس کالج میں مسلمانوں کا کیا رہا۔ جس میں غیر مسلم پرنسپل کو اتنے اختیارات ہوں۔ اس سلسلے میں ایک اہم واقعہ ۱۹۰۲ء میں پیش آیا۔ جب مولانا محمد علی مرحوم آکسفورڈ سے بی اے کی ڈگری لے کر آئے۔ اور علی گڑھ کالج کے اسٹاف میں شامل ہونے کی کوشش کرنے لگے۔ محسن الملک ان کی قابلیت کے مداح تھے۔ اور چاہتے تھے۔ کہ اس سے فائدہ اُٹھایا جائے۔ "لیکن وہ ذہنیت جو انگلش اسٹاف اس درسگاہ کی تعلیم و تربیت کا جوہر سمجھتا تھا۔ محمد علی میں موجود نہ تھی۔ اس لئے مارسین صاحب کی سخت مخالفت سے درخواست مسترد ہوئی۔" اس کے بعد یورپین پرنسپل کے متعلق مولانا محمد علی کے جو خیالات ہوں گے۔ اُن کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ اسی زمانے میں علیگڑھ کے اولڈ بوائز کی دو متقابل پارٹیاں ہو گئیں۔ جن کی رقابت نے کالج کی اجتماعی زندگی کا خاتمہ کر دیا۔ ہر فریق یہی چاہتا تھا۔ کہ کالج میں میرا عمل دخل ہو۔ اور فریق ثانی ذلیل ہو۔ اس مقصد کے لئے سارے حربے استعمال کئے جاتے۔ ایک پارٹی کے لیڈر مولانا شوکت علی تھے اور دوسری کے سرگروہ صاحبزادہ آفتاب احمد۔ مولانا شوکت علی کو نواب وقار الملک مرحوم جیسے با اثر ٹرسٹی کی حمایت حاصل تھی۔ اور کالج کے اکثر طلبا بھی اُن کے ہمخیال تھے۔ اس پارٹی کے اراکین کو خیال ہو گیا۔ کہ پرنسپل ہم سے اچھا برتاؤ نہیں کرتا۔ چنانچہ اخبارات میں سلسلۂ شکایات شروع ہوا۔ اُدھر اسٹاف کے رویے میں بھی تھوڑی بہت تبدیلی ہو گئی۔ یہاں تک کہ طلبا اور یورپین اسٹاف کے درمیان وہ رابطۂ اتحاد نہ رہا جو سرسید نے قائم کیا تھا ایک موقعے پر طلبا نے پرنسپل کے کسی فیصلے سے ناراض ہو کر سٹرائک کر دی۔ محسن الملک ابھی زندہ

تھے۔ انہوں نے بڑی محنت اور کوشش سے معاملے کو سلجھا دیا۔ لیکن اس واقعہ کے چند ماہ بعد وہ وفات پا گئے۔ اور اُن کے بعد نواب وقار الملک سیکرٹری ہوئے۔ جو شروع ہی سے مولٰنا محمد علی اور مولانا شوکت علی کی پارٹی کے ہمخیال تھے۔ انہوں نے پرنسپل کے اختیارات کو محدود کر دیا۔ اس سے پرنسپل اور یورپین اسٹاف کے خلاف جو عام شکایتیں تھیں ان کا تو خاتمہ ہوگیا۔ لیکن شاید یہ بھی صحیح ہے کہ اس کے بعد یورپین پرنسپل اور اسٹاف نے طلبا کی اصلاح میں وہ دلچسپی نہ لی۔ جو پہلے لیا کرتے تھے۔ اور علیگڑھ کالج کو پھر کبھی وہ شہرت اور اہمیت نصیب نہ ہوئی۔ جو محسن الملک کے زمانے تک حاصل تھی۔

سرسید کی وفات کے بعد نواب محسن الملک نے علیگڑھ کالج کو یونیورسٹی بنانے کی کوشش شروع کی تھی۔ اور اُن کی زندگی میں سات آٹھ لاکھ روپیہ جمع ہوا۔ اُن کی وفات پر ہزہائی نس آغا خان نے اس کام کے لئے بڑی محنت کی۔ بیس لاکھ روپے کے فنڈ کے بغیر حکومت یونیورسٹی قائم کرنے کی اجازت نہ دیتی تھی۔ ہزہائی نس نے دورہ کر کے یہ رقم بھی جمع کر دی۔ لیکن حکومت نے چند ایسی شرطیں عاید کیں کہ نواب وقار الملک۔ مولانا محمد علی۔ مولانا شوکت علی۔ مولٰنا شبلی اور مولٰنا ابوالکلام آزاد نے ان کی مخالفت کی۔ جس کی وجہ سے یونیورسٹی کا معاملہ عرصے تک کھٹائی میں پڑا رہا۔ حتّٰی کہ ہندوؤں نے جن میں یونیورسٹی کی تحریک مسلمانوں سے بہت عرصہ بعد شروع ہوئی تھی۔ یہ شرطیں قبول کر کے بنارس میں ہندو یونیورسٹی قائم کر لی۔ بالآخر بہت سا قیمتی وقت ضائع کرنے کے بعد " کارکنانِ علیگڑھ کالج نے انہی شرائط پر یونیورسٹی بنانی قبول کر لی۔ جو پہلے نامنظور کی تھیں۔ اور جنوری ۱۹۲۱ء سے پُرانا علیگڑھ کالج مسلم یونیورسٹی میں منتقل ہوگیا۔ " سرسید نے قومی یونیورسٹی کا جو خواب پچاس سال پہلے دیکھا تھا وہ اِس طرح پُورا ہوا۔

جامعہ ملّیہ

اسلامی ہندوستان کے تعلیمی اداروں میں شاید سب سے دلچسپ ادارہ جامعہ ملّیہ اسلامیہ ہے۔ جس کی بنیاد ۱۹۲۰ء میں مولٰنا محمد علی مرحوم نے چند دوسرے بزرگوں کی رفاقت میں ڈالی تھی۔ اس زمانے میں حکومت کے خلاف عدم تعاون کی تحریک زوروں پر تھی۔ جس کے زیرِ اثر قوم کے تعلیمی اداروں کو سرکاری گرانٹ اور سرکاری تعلقات سے آزاد کرانے

کی کوشش شروع ہوئی۔ مولنا محمد علی علیگڑھ کالج کو سرکاری اثرات سے آزاد کرانے اور ایک آزاد تعلیمی ادارہ بنانے کے لئے علیگڑھ گئے۔ بہت سے طلبا اُن کے ہم خیال ہو گئے۔ لیکن کالج کے ارباب حل وعقد سمجھتے تھے۔ کہ جب تک مسلمانوں کا ایک معقول حصّہ سرکاری ملازمت کا خواہاں ہے۔ اس وقت تک گورنمنٹ سے قطع تعلق عملی حیثیت سے کالج اور قوم کو مفید نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ انہوں نے بڑے استقلال سے نئی تحریک کا مقابلہ کیا۔ مولنا محمد علی علیگڑھ کالج کو تو آزاد بنانے میں کامیاب نہ ہوئے۔ لیکن جو طلبا اُن کی حمایت میں کالج سے علیحدہ ہو گئے تھے۔ انہیں لے کر انہوں نے جامعہ ملیہ اسلامیہ کی بنا ڈالی۔ شروع شروع میں تو جامعہ علیگڑھ میں رہی۔ لیکن ۱۹۲۵ء میں دہلی آ گئی۔ جہاں حکیم اجمل خان مرحوم اور ڈاکٹر انصاری مرحوم کی مدد اور ڈاکٹر ذاکر حسین شیخ الجامعہ کے حسنِ تدبّر اور انتظامی قابلیت کی وجہ سے اس نے دن دونی رات چوگنی ترقی شروع کر دی ⁂

جامعہ ملیہ کی تاسیس کچھ ایسے حالات میں ہوئی ہے۔ اور اس کی عملی صورت میں کئی باتیں علی گڑھ کالج سے اس قدر مختلف ہیں۔ کہ عام طور پر خیال کیا جاتا ہے۔ کہ جامعہ علیگڑھ کے خلاف ردّ عمل کی حیثیت رکھتی ہے۔ اور اُسے سرسید کا ایک مخالف ادارہ سمجھنا چاہیئے۔ حقیقتاً ایسا نہیں۔ اگر علیگڑھ یونیورسٹی کی موجودہ صورت کو دیکھا جائے۔ اور سرسید کے اُن ارادوں اور منصوبوں سے اس کا مقابلہ کیا جائے۔ جو ابتداء میں علی گڑھ کے متعلق اُن کے دل میں تھے۔ تو خیال ہوتا ہے۔ کہ علیگڑھ عملی حیثیت سے سرسید کے زرّیں خواب کی ایک نہایت معمولی سی تعبیر ہے۔ اور کئی ایسی ضروری باتیں ہیں جن کے حصول کی خواہش سرسید کو بہت تھی۔ لیکن وہ علی گڑھ نے حاصل نہ کیں۔ سرسید جس درسگاہ کا خواب دیکھ رہے تھے۔ اس کے متعلق انہوں نے خود کہا تھا "فلسفہ ہمارے دائیں ہاتھ میں ہوگا۔ نیچرل سائنس بائیں ہاتھ میں اور کلمہ لا الہ الّا اللہ محمد الرّسول اللہ کا تاج سر پر" وہ مغربی علوم کے ساتھ ایمانِ کامل اور صحیح مذہبی تربیت کو ضروری سمجھتے تھے۔ لیکن مذہبی عقائد میں علیگڑھ کالج کے طلبا کی جو قابل افسوس شہرت ایک زمانے میں ہو گئی تھی۔ اُس سے سب واقف ہیں۔ اسی طرح سرسید علیگڑھ کو قوم کے عام

علمی احیاء کا ایک مرکز بنانا چاہتے تھے۔ لیکن جیسا کہ ہم آگے چل کر بتائیں گے۔ علیگڑھ کالج نے نہ تو کوئی حالی یا شبلی پیدا کیا۔ اور نہ کوئی قابلِ ذکر علمی روایات قائم کیں۔ اس طرح اور کئی باتیں ہیں جن میں سرسید کے ارادے کچھ تھے۔ اور عملاً کچھ اور ہوا۔ ایک مفکر کے تخیل اور اسی تخیل کی عملی صورت میں بالعموم بڑا فرق ہوتا ہے۔ اور یہ فرق یہاں بھی نمایاں ہے۔ لیکن سرسید کی خواہشوں اور علیگڑھ کی عملی صورت میں زیادہ فرق غالباً اس وجہ سے ہوا۔ کہ علیگڑھ کالج کا سب سے اہم عملی مقصد ایسے طلبا کی نشو و نما ہوگیا۔ جو فتحمند قوم کے علوم و فنون اور زبان حاصل کر کے ملکی حکومت میں حصّہ لے سکیں۔ اور سرسید کے جو مقاصد اس اہم ترین مقصد کے منافی تھے۔ پس پشت ہو گئے۔ یہ صحیح ہے کہ سرسید سمجھتے تھے۔ کہ سرکاری ملازمت کو زندگی کی معراج سمجھ لینے سے قوم کی نجات نہیں ہو سکتی۔ اور سید محمود کے حالات میں لکھا ہے کہ "جب ان کا تقرر ہائی کورٹ کی ججی پر ہوا ہے۔ تو سرسید نے بارہا یہ بات کہی۔ کہ میرا جو اصلی مقصد سید محمود کی تعلیم سے تھا۔ وہ حاصل نہیں ہوا۔ سید محمود ملازمت کے صیغے میں چاہے اور کتنی ہی ترقی کریں۔ مگر قوم کو جس قسم کے تعلیم یافتوں کی ضرورت ہے۔ اس میں سید محمود سے کچھ مدد نہیں پہنچ سکتی۔" لیکن یہ بھی صحیح ہے۔ کہ اس احساس کے باوجود سرسید نے نہ صرف سید محمود کو ملازمت قبول کرنے سے نہ روکا۔ بلکہ کالج کے طلبا کی تربیت بھی ان اصولوں پر گوارا کی۔ جن کی پیروی سے وہ بیشتر سرکاری ملازمت ہی کے اہل ہو سکتے تھے۔

سرکاری ملازمت کو علیگڑھ کا اہم ترین عملی مقصد بنانے کا ایک نتیجہ یہ ہوا۔ کہ وہاں ایک قسم کی مادیت اور منفعت پسندی پیدا ہوگئی۔ جو طلبا کی مذہبی تربیت اور روحانی ترقی کے لئے ناسازگار تھی۔ اور اس طرح سرسید کا ایک مقصدِ اعلیٰ نظر سے اوجھل ہوگیا۔ سرسید کی دوسری خواہش عام علمی احیاء کے متعلق تھی۔ لیکن جو طلبا حصولِ تعلیم کے بعد ملازمت کی زنجیروں میں جکڑے جائیں۔ وہ اشاعت علوم میں کیا مدد کر سکتے تھے۔ چنانچہ سرسید کی یہ خواہش بھی پوری نہ ہوئی۔

ایک بنیادی الجھن کی وجہ سے علیگڑھ اپنے بانیوں کے چند ایسے اہم مقاصد پورا کرنے سے

اس حد تک قاصر رہا۔ کہ خود علیگڈھ میں یہ خیال پیدا ہونے لگا۔ کہ یہ کالج ہی قوم کے تمام امراض کا علاج نہیں اور قومی اصلاح و ترقی کے لئے ایک ایسا تعلیمی ادارہ قائم ہونا چاہئے۔ جس کا بنیادی مقصد اور دستور العمل علیگڑھ کالج سے مختلف ہو۔ چنانچہ خود علیگڈھ کے سیکرٹری اور سر سید کے خلیفۂ ثانی نواب وقار الملک نے ۱۹۱۲ء میں اُن مسلمانوں کے واسطے "جو سرکاری ملازمتوں کے خواستگار نہیں۔" ایک جداگانہ جامعہ اسلامیہ قائم کرنے کی اسکیم پیش کی۔ نواب صاحب کی خواہش تھی۔ کہ یہ نئی یونیورسٹی گورنمنٹ کے اثرات سے آزاد ہو۔ اس میں ذریعۂ تعلیم اردو ہو۔ لیکن انگریزی ایک لازمی مضمون کے طور پر شامل درس رہے اور طلبا کی تعلیم میں مذہبی تربیت اور کفایت شعاری کی تعلیم کو خاص اہمیت ہو۔ نواب وقار الملک اپنے خیالات کو عملی جامہ نہ پہنا سکے۔ لیکن جامعہ اسلامیہ کے متعلق انہوں نے جو مفصل مضمون لکھا تھا۔ اُسے پڑھکر اس بات کا اندازہ ہو سکتا ہے کہ اُن کی اسکیم اور جامعہ ملیہ کی عملی صورت میں کوئی خاص فرق نہیں۔ اور یہ حقیقت بھی بہت اہم ہے۔ کہ جامعہ ملیہ کی بنا میں سب سے اہم حصہ اس بزرگ کا ہے جو علیگڈھ کا اولڈ بوائے تھا۔ اور جس کا بیان ہے۔ کہ "تقریباً جو کچھ میں نے حاصل کیا ہے۔ وہ اسی علیگڈھ کا طفیل ہے[1]"

مندرجہ بالا حالات کی بنا پر ہم جامعہ ملیہ کو سر سید کی دلی خواہشات کی تکمیل سمجھتے ہیں۔ اس کی کوششوں کے خلاف ردِ عمل نہیں سمجھتے۔ جامعہ اس بنیادی الجھن سے آزاد ہے۔ جس کی وجہ سے علیگڈھ کے کئی اہم مقاصد پُورے نہ ہو سکے۔ اور امید ہے کہ جامعہ میں ان مقاصد کی تکمیل بڑے احسن طریقے سے ہوتی رہیگی۔ لیکن اس عملی فرق کے باوجود یہ نہیں کہا جا سکتا۔ کہ سر سید کو یہ مقاصد عزیز نہ تھے۔ یا ان مقاصد کی تکمیل سر سید کے مقاصد کی مخالفت ہے۔

---

[1] ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب نے خود علیگڈھ کالج چھوڑتے وقت علیگڈھ کے متعلق جس عقیدت کا اظہار کیا۔ اُسے دیکھنے کے لئے پروفیسر رشید احمد صدیقی کا مضمون "مرشد" پڑھیں (مضامینِ رشید صفحہ ۱۱)

ایک لحاظ سے ہم جامعہ ملیہ کو سر سید کے خواب کی ایک تعبیر سمجھتے ہیں۔ لیکن اس سے کارکنانِ جامعہ کے کام کی قدر و منزلت کم نہیں ہو جاتی۔ ایک تعلیمی اسکیم مرتب کرنا آسان ہے۔ اور اسے عملی جامہ پہنانا بہت مشکل ہے۔ اس کے علاوہ جامعہ میں کئی امتیازی باتیں بھی ہیں۔ جن کی اہمیت شاید سر سید نے نظری طور پر بھی محسوس نہ کی ہو۔

جامعہ کی پہلی امتیازی خصوصیت اساتذہ کا ایثار اور قربانی ہے۔ جس شخص نے ہمسایہ قوموں کی ترقی کے اسباب پر غور کیا ہے۔ اسے اس ترقی کا ایک اہم باعث تعلیم یافتہ افراد کا ایثار نظر آئے گا۔ ان قابل عزت لوگوں نے کثیر رقمیں خرچ کر کے ہندوستان اور یورپ کی بہترین یونیورسٹیوں میں تعلیم حاصل کی ہے۔ اور اس کے بعد نہایت معمولی مشاہروں پر قومی خدمت کے لئے اپنی زندگیاں وقف کر رکھی ہیں۔ حالانکہ انہیں اعلیٰ سے اعلیٰ ملازمتیں مل سکتی تھیں۔ ہندو یونیورسٹی بنارس۔ "ڈی۔ اے وی کالج لاہور اور سرونٹس اوف انڈیا سوسائٹی پونا میں اس ایثار و قربانی کی بیسیوں مثالیں موجود ہیں۔ مسلمانوں میں اس صفت کا فقدان ہے۔ لیکن خدا کا شکر ہے۔ کہ جامعہ ملیہ کے اساتذہ اور دوسرے کارکنوں نے ان میں بھی اس کے نمونے پیش کر دئے ہیں۔ امید ہے کہ انہیں دیکھکر دوسروں کو انکی پیروی کی ترغیب ہو گی۔

جامعہ کی دوسری صفت اساتذہ اور طلبہ کی سادہ زندگی ہے۔ سادگی کے بغیر کسی طرح کا ایثار ناممکن ہے۔ اور مسرف انسان کو اپنے اخراجات پورے کرنے کے لئے کئی جگہ ضمیر فروشی کرنی پڑتی ہے۔ جامعہ کی یہ خصوصیت قابلِ تعریف ہے کہ کفایت شعاری کی تعلیم کو انہوں نے اپنے مقاصد میں ایک اہم جگہ دے رکھی ہے۔

جامعہ کی تیسری اہم خصوصیت صنعت و حرفت کی تعلیم ہے۔ جامعہ نے سرکاری ملازمت کو اپنے طلبا کا نصب العین نہیں بنایا۔ لیکن طلبا کے اقتصادی مستقبل کا سوال حل کئے بغیر کوئی درسگاہ زندہ نہیں رہ سکتی۔ اربابِ جامعہ اس حقیقت سے پوری طرح آگاہ ہیں۔ چنانچہ انہوں نے دستکاری کو طلبا کے لئے حصولِ معاش کا ذریعہ بنایا ہے۔ اور مختلف مفید پیشوں کی

تعلیم کا انتظام کیا ہے۔ جامعہ کی درسی خصوصیات میں شاید سب سے مفید یہی ہے۔ آج تعلیم عام ہونے کی وجہ سے ملازمت کا حصول اس قدر مشکل ہو گیا ہے۔ کہ اگر ملازمت کے علاوہ حصول معاش کے دوسرے ذریعوں پر توجہ نہ کی گئی۔ تو قوم کا اقتصادی مستقبل تاریک ہو جائے گا۔ خدا کا شکر ہے۔ کہ ارکانِ جامعہ اس پر روز بروز زیادہ توجہ کر رہے ہیں اور نجّاری۔ قفل سازی۔ پارچہ بافی۔ ڈیری فارمنگ اور کیمیاوی صنعتوں میں ایسے طلبا کی نشو و نما کر رہے ہیں۔ جو اپنے فن میں اچھا دا اور کمال پیدا کر سکیں۔ اور بشرط ضرورت معقول روزی کما لیں؛

جامعہ کی ایک اور قابلِ ذکر خصوصیت یہاں کی علمی زندگی ہے۔ قوم کی اہم ترین تعلیمی درسگاہ ہونے کے باوجود علیگڑھ اشاعتِ علم و ادب کا مرکز نہ ہو سکا۔ اور وہاں تصنیف و تالیف کا کوئی ادارہ قائم نہ ہوا۔ جامعہ اس طرف خاص طور پر متوجہ ہے۔ وہاں ایک اردو اکاڈمی قائم ہوئی ہے۔ جسے ڈاکٹر عابد حسین صاحب جیسے صاحب نظر بزرگ کی رہنمائی حاصل ہے۔ اور پچھلے چند سالوں میں دارالاشاعت جامعہ سے بہت سی قابلِ قدر کتابیں شائع ہوئی ہیں؛
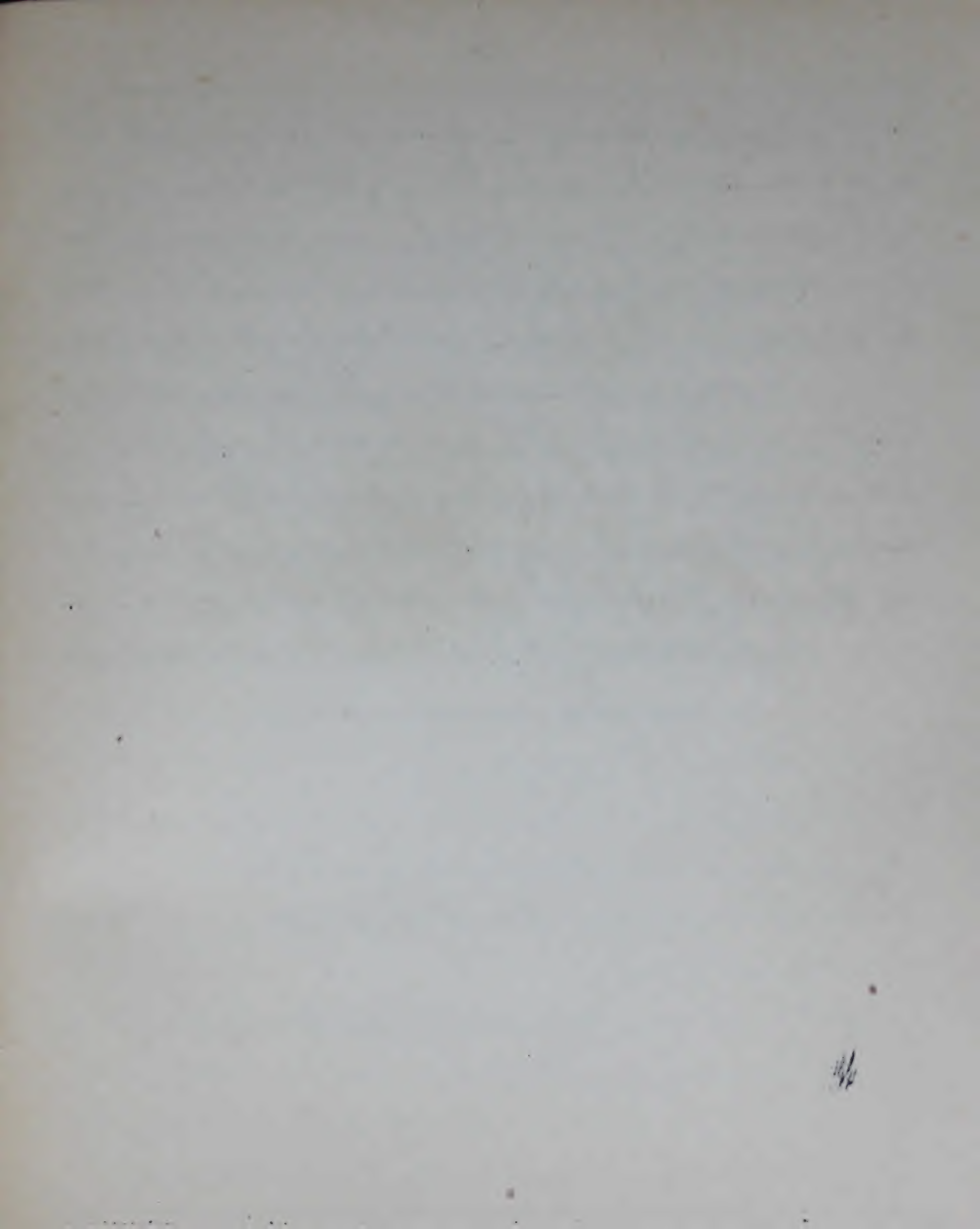
جدید علم الکلام

جدید علم الکلام

سرسید

انیسویں صدی میں بالخصوص غدر کے بعد ہندوستان میں اسلام کو تین خطرے درپیش تھے۔ پہلا خطرہ تو مشنریوں کی طرف سے تھا۔ جو اس امید میں تھے۔ کہ سیاسی زوال کے ساتھ مسلمانوں کا مذہبی انحطاط بھی شروع ہو جائے گا۔ اور توحید کے پیرو تثلیث کو قبول کریں گے۔

دوسرا خطرہ یورپ اور ہندوستان میں ان خیالات کا اظہار تھا۔ جنہیں دیکھ کر بقول سرسید "مر جانے کو جی چاہتا تھا" یہ لوگ اسلام کو عقل کا دشمن' اخلاق کا دشمن اور انسانی ترقی کا مانع ثابت کر رہے تھے۔ ان میں نہ صرف مشنری بلکہ مغربی یونیورسٹیوں کے پروفیسر اور وہ انگریز حاکم بھی شامل تھے۔ جنہیں خدا نے ہندوستانی مسلمانوں کی قسمت سونپ رکھی تھی۔ اسلام اور بانیٔ اسلام کے متعلق غالباً بدترین کتاب سر ولیم میور کی ہے۔ جو صوبجاتِ متحدہ کے حاکم اعلیٰ تھے اور جنہوں نے اپنی کتاب کا خلاصہ دو فقروں میں لکھ دیا۔ (نعوذ باللہ) "انسانیت کے دو سب سے بڑے دشمن محمد کی تلوار اور محمد کا قرآن ہیں۔"

تیسرا بڑا خطرہ جو آئندہ اور بھی بڑھنے والا تھا۔ خود مسلمانوں کے دلوں میں طرح طرح کے شکوک و شبہات کا پیدا ہونا تھا۔ جن لوگوں کی نظروں سے مشنریوں اور دوسرے عیسائی مصنفوں کی کتابیں گزرتیں وہ اسلام کے بعض مسائل کو جو عام علما بیان کرتے تھے۔ خلاف عقل سمجھنے لگے تھے۔ اور یہ ڈر تھا کہ اگرچہ وہ اسلام چھوڑ کر عیسائیت اختیار نہیں کریں گے لیکن مذہب سے ضرور بیگانہ ہو جائیں گے۔ سرسید خود لکھتے ہیں "اگر خدا مجھ کو ہدایت نہ کرتا۔ اور تقلید کی گمراہی سے نہ نکالتا اور میں خود تحقیقات حقیقت پر نہ متوجہ ہوتا۔ تو یقینی مذہب کو چھوڑ دیتا۔"

اِن تینوں خطروں میں سے جہانتک مشنریوں کے خطرے کا تعلق ہے۔ ظاہر ہے کہ اس کا مقابلہ بنگلے کی چار دیواری میں بیٹھ کر کتابیں لکھنے سے نہ ہو سکتا تھا۔ یہ لوگ شاہراہوں اور چوکوں میں کھڑے ہو کر لیکچر دیتے پمفلٹ تقسیم کرتے۔ مناظرے کی دعوتیں دیتے اور وہیں انہیں کوئی شکار مل جاتا۔ ضروری تھا کہ جو ہتھیار یہ لوگ استعمال کرتے تھے۔ انہی سے ان کا مقابلہ کیا جائے۔ چنانچہ مولانا رحمت اللہ مرحوم مولوی آلِ حسن۔ ڈاکٹر وزیر خان۔ مولوی سید ناصر الدین۔ مولانا محمد قاسم اور دوسرے بزرگوں نے اسی طرح ان کا مقابلہ کیا۔ اُن سے بالمشافہ مناظرے کئے۔ ان کے مقابلے میں کتابیں لکھیں۔ پمفلٹ تقسیم کئے۔ اور یہ انہی بزرگوں کی کوششیں تھیں کہ عام مسلمانوں میں مشنری کامیاب نہ ہوئے۔ سر سید نے اُن بزرگوں کی طرح اس زمانے کے مشنری طریقوں کے مطابق مشنریوں کا باقاعدہ مقابلہ تو نہیں کیا۔ لیکن مشنریوں کی مخالفت میں وہ اُن بزرگوں سے پیچھے نہ تھے۔ انہوں نے تمام عمر مشنری اسکولوں اور کالجوں کی مذمت کی۔ ایجوکیشن کمیشن کے سامنے کلکٹر مراد آباد کے رُوبرو اسبابِ غدر بیان کرتے ہوئے ہر جگہ انہوں نے مشنری اسکولوں اور مشنری اشاعت مسیحیت کے طریقوں کے متعلق عام مسلمانوں کی ترجمانی بڑی قابلیت اور بیباکی سے کی اسکے علاوہ جب کہیں مشن اسکولوں کے مسلمان طالب علم اُن سے ملتے تو وہ اسلام اور مذہب کی اہمیت انہیں پوری طرح سمجھاتے۔ لدھیانہ کے ایک جلسے میں مشن اسکول کے ایک طالب علم نے سر سید کی تعریف میں تقریر کی تو سر سید نے اس وقت جو الفاظ کہے وہ یاد رکھنے کے قابل ہیں۔ انہوں نے فرمایا "یاد رکھو کہ اسلام جس پر تم کو جینا ہے۔ اور جس پر تم کو مرنا ہے۔ اس کو قائم رکھنے سے ہماری قوم قوم ہے۔ اے عزیز بچے! اگر کوئی آسمان کا ستارہ ہو جائے مسلمان نہ رہے۔ تو ہم کو کیا[1]۔ وہ تو ہماری قوم میں نہ رہا"۔

سر سید کی مذہبی تصنیفات کا مقصد مشنریوں کے مقابلے سے زیادہ ان اعتراضات کی تردید تھا۔ جو سر ولیم میور دوسرے مصنف اور خود مشنری اسلام پر کیا کرتے تھے۔ اس مقصد کے لئے سر سید نے اسلام کی ایسی ترجمانی کی۔ جس پر نیچرل سائنس اور فلسفے کی رُو سے کوئی اعتراض نہ ہو سکے اور جس کے مطابق

---

[1] اقبال "ہمیں بھلا اُن سے واسطہ کیا جو تجھ سے ناآشنا رہے ہیں۔"

مسلمانوں کو موجودہ زمانے میں اپنے عیسائی حاکموں کے ساتھ بالخصوص ربط ضبط رکھنے میں کوئی امر مانع نہو۔ رسالہ "طعام اہلِ کتاب" میں انہوں نے ثابت کیا کہ عیسائی یا دوسرے اہلِ کتاب لوگوں کا پکا ہوا کھانا مسلمان شرعاً کھا سکتے ہیں۔ اکثر مسلمان انجیل میں تحریف لفظی کے قائل ہیں۔ لیکن عام طور پر انہوں نے اسلامی مآخذ کے علاوہ عیسائیوں کی اپنی کتابوں سے تحریف لفظی ثابت کرنے کی کوشش نہ کی تھی۔ سر سید نے اپنی کتاب "تبئین الکلام" میں اناجیل کی تفسیر اس طرح کرنی شروع کی۔ کہ اگر موجودہ اناجیل کو صحیح بھی مان لیا جائے۔ پھر بھی اُن سے حضرتِ عیسےٰ اور عیسائیت کے متعلق وہی عقائد اخذ ہوں جنہیں اسلام صحیح سمجھتا ہے۔ ایک رسالہ "ابطالِ غلامی" کے نام سے شائع کیا۔ جس میں ثابت کیا کہ اسلام نہ صرف غلاموں کے ساتھ نیک سلوک کی "ملقین" کرتا ہے۔ بلکہ بردہ فروشی کی موجودہ صورت کے بھی خلاف ہے:۔

اِن تین کتابوں کے علاوہ سر سید کی ایک اہم کتاب "خطباتِ احمدیہ" ہے۔ جو انہوں نے سر ولیم میور کی "لائف آف محمد" کے جواب میں لکھی۔ اور سید محمود سے ترجمہ کروا کر انگریزی میں شائع کروائی۔ اِن تمام کتابوں میں انہوں نے کئی باتوں میں جمہور علما سے تھوڑا بہت اختلاف کیا۔ لیکن جمہور علما اور ان کے درمیان سب سے بڑی خلیج اس وقت حائل ہوئی۔ جب انہوں نے "تہذیب الاخلاق" میں اپنی تفسیر القرآن شائع کرنی شروع کی۔ اس تفسیر سے انہوں نے اس "جدید علم کلام" کی بنیاد ڈالی جس کے متعلق انہوں نے ایک مفصل تقریر میں کہا تھا۔ "اس زمانے میں ...... ایک جدید علم کلام کی حاجت ہے جس سے یا تو ہم علوم جدیدہ کے مسائل کو باطل کر دیں یا مشتبہ ٹھیرا دیں یا اسلامی مسائل کو اُن کے مطابق کر کے دکھائیں۔" یہ تفسیر اب چھ سات جلدوں میں ملتی ہے۔ اور اس کے مضامین کا ایک نہایت جامع خلاصہ حالی نے "حیاتِ جاوید" میں درج کیا ہے۔ اس تفسیر میں سر سید نے قرآن کے تمام اندراجات کو عقل اور سائنس کے مطابق ثابت کیا ہے اور جہاں کہیں سائنس کی معلومات اور کلام مجید کے درمیان اختلاف معلوم ہوتا ہے۔ وہاں معتزلہ طریقے کے مطابق آیات کی نئی تاویل اور تشریح کر کے اس اختلاف کو دور کیا ہے۔ سر سید نے معراج وشقِ صدر کو رویا کا فعل مانا ہے۔ حساب کتاب، میزان، جنّت دوزخ کے متعلق تمام قرآنی ارشادات کو بہ طریق مجاز و استعارہ وتمثیل قرار دیا ہے۔ ابلیس اور ملائکہ سے کوئی خارجی وجود مراد نہیں لیا۔ حضرت عیسےٰؑ کے متعلق کہا ہے کہ

قرآن مجید کی کسی آیت سے ثابت نہیں ہوتا کہ وہ بن باپ کے پیدا ہوئے یا زندہ آسمان پر اٹھائے گئے۔ نسخ قرآنی کے نظریے سے قطعی انکار کیا ہے۔ یہ تو وہ مسائل تھے۔ جن کی اس ترجمانی میں "سرسید منفرد نہیں ہیں۔ بلکہ ہر ایک مسئلے میں کم یا زیادہ لوگ اکابر علمائے اسلام ہی سے سرسید کے ساتھ متفق الرائے ہیں۔ جیسے امام غزالی۔ امام رازی۔ شاہ ولی اللہ وغیرہ"۔ ان کے علاوہ چند اختلاف سرسید نے علمائے سلف سے ایسے بھی کئے ہیں جن میں ظاہراوہ منفرد معلوم ہوتے ہیں مثلاً یہ خیال کہ سورۂ محمدؐ کی آیۂ من و فدا" سے اسلام نے غلامی کو ہمیشہ کے لئے موقوف کر دیا۔ یا یہ کہ حضرت عیسٰیؑ کی نسبت جو یہودی کہتے ہیں کہ ہم نے انکو سنگسار کر کے قتل کیا۔ اور عیسائی کہتے ہیں کہ یہودیوں نے ان کو صلیب پر قتل کیا تھا۔ یہ دونوں قول غلط ہیں۔ بلاشبہ وہ صلیب پر چڑھائے گئے۔ مگر صلیب پر موت واقع نہیں ہوئی"۔ یا یہ کہ قرآن میں جن واجنہ کے الفاظ سے چھپے ہوئے پہاڑی اور صحرائی لوگ مراد ہیں نہ کہ وہ وہمی مخلوق جو دیو اور بھوت کے الفاظ سے مفہوم ہوتی ہے "۔

حالی نے سرسید کی تفسیر القرآن کے باون ۵۲ ایسے مسائل کا ذکر کیا ہے۔ جن میں انہوں نے عام علما سے اختلاف کیا ہے۔ ان میں سے اکتالیس مسائل تو ایسے ہیں جن میں علمائے کبار میں سے کوئی نہ کوئی بزرگ سرسید کے ہمخیال تھے۔ اور گیارہ مسائل ایسے ہیں جن کے متعلق کہا نہیں جاسکتا کہ ان میں سرسید کا کوئی ہمخیال تھا یا نہیں۔ اگرچہ انہوں نے اپنی رائے کی تائید میں احادیث اور آیات درج کی ہیں۔ مولٰنا حالی ان مسائل کے متعلق لکھتے ہیں" اگر غور کر کے دیکھا جائے"۔ تو سرسید نے "شاید اس کے سوا کچھ نہیں کیا کہ جو صداقتیں اہلِ اسلام کی تصنیفات میں فرداً فرداً صرف ضبطِ تحریر میں آئی تھیں۔ اور اکابر علما کے سوا اُن سے کسی کو اطلاع نہ تھی۔ سرسید نے ان سب کو ایک ہی بار خاص و عام پر علے الاعلان ظاہر کیا"۔ اس کے علاوہ جب بیشتر مسائل پر علمائے کبار سے اختلاف کرنے سے کفر لازم نہیں آتا۔ اور اُن سے اسلام کے اصول عقائد توحید اور رسالت نبوی اور فرائض منصوصہ یعنی نماز۔ حج۔ روزہ۔ زکوٰۃ کے ادا کرنے میں کچھ نقص پیدا نہیں ہوتا تو پھر سرسید کی اتنی مخالفت کیوں ہوئی۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ "عدم تکفیر اہلِ قبلہ" کا مسئلہ جو اکابر فقہا میں مسلّم تھا اور جس کے بغیر ذہنی آزادی اور ترقی و اصلاح کا دروازہ

بالکل بند ہو جاتا ہے۔ اس کی اہمیت آج ہر ایک عالم نہیں سمجھتا۔ اس کے علاوہ یہ بھی صحیح ہے کہ عام تفسیروں اور سرسید کی تفسیر میں بڑا فرق ہے ۔ سرسید تکفیر کے سزاوار نہ سہی لیکن اُن سے جمہور علما کا اختلاف قدرتی تھا۔

آج اس تفسیر کو شائع ہوئے قریباً پچاس سال گزر چکے ہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بعض مسلمانوں نے کئی اہم مسائل میں سرسید کی رائے اختیار کر لی ہے ۔ مولوی محمد علی امیر جماعت احمدیہ کی تفسیرِ قرآن بیشتر سرسید ہی کی ترجمانی ہے ۔ حضرتِ عیسٰے کے متعلق سرسید کے جو عقائد تھے ۔ وہ مرزا غلام احمد نے اختیار کر لئے ۔ اور جیسا کہ "نظام المشائخ" میں ڈاکٹر محمد اسمٰعیل کے مضامین سے ظاہر ہوتا ہے اور بھی کئی مسلمان ان سے متفق ہو گئے ہیں ۔ اسی طرح مسئلہ نسخ کے متعلق کئی علما سرسید سے متفق ہیں ۔ کسی زمانے میں قرآن شریف کی پانسو آیات منسوخ سمجھی جاتی تھیں ۔ شاہ ولی اللہؒ نے انہیں گھٹا کر پانچ قرار دیا ۔ سرسید نے سرے سے نسخ کا انکار کیا ۔ اور آج ہم دیکھتے ہیں ۔ کہ مفتی محمد عبدہٗ نے بھی جو سید جمال الدین الافغان کے دست راست رہے ہیں ۔ اور مصر کے مفتیٔ اعظم تھے ۔ اپنی تفسیر میں نسخ سے بالکل انکار کیا ہے ۔ اسی طرح نواب صدیق حسن خاں نے شاہ ولی اللہ کی "بیان کردہ پانچ آیات کو غیر منسوخ قرار دیا ہے" ۔ اور اگرچہ انہوں نے اپنی طرف سے چند آیات پیش کر دی ہیں ۔ جو اُن کے نزدیک منسوخ ہیں ۔ لیکن نواب صاحب اور شاہ صاحب کے اختلاف ہی سے اندازہ کیا جا سکتا ہے ۔ کہ اس معاملے میں سرسید کی رائے اصولی طور پر کس قدر صحیح ہے ۔ اسی طرح قرآن میں پرانے انبیا کا جو کنایۃً ذکر ہے اس کے متعلق اسرائیلی روایات سے تفصیلات لے کر "قصص الانبیا" مرتب کرنے اور انہیں جزوِ اسلام سمجھ لینے کا جو مرض پرانے مفسرین میں تھا ۔ اور جس کے خلاف ابن خلدون ، شاہ ولی اللہؒ اور سرسید نے صدائے احتجاج بلند کی اس سے آج کئی سمجھدار علما نالاں ہیں ۔ کلکتہ میں اہلحدیث کی مسجد کے خطیب مولٰنا ابو سعید عبدالرحمٰن صاحب فریدکوٹی اخبار ہند میں تفسیر کے متعلق مضامین کا ایک سلسلہ شائع کر رہے ہیں ۔ اُن کے مطالعہ سے بھی معلوم ہوتا ہے ۔ کہ عام علما اب سرسید کے خیالات سے کس قدر قریب آ رہے ہیں ۔ مولٰنا ابو سعید نے نہ صرف ناسخ و منسوخ کے مسئلے میں سرسید کی رائے سے اتفاق کیا ہے ۔ بلکہ نہایت مدلل مضامین میں "تفسیر کبیر" "تفسیر خازن" "تفسیر فتح البیان" وغیرہ سے مثالیں درج کی ہیں

جن میں مفسرین نے قرآن کے سادہ "الفاظ کا معنی و مطلب بیان کرنے میں بڑا" تصرّف "کیا ہے - یا زیبِ داستاں کی غرض سے ایسی اسرائیلی روایات تفسیر میں درج کر دی ہیں - جن کے بیان کرنے پر حضرت علیؓ نے دُرّے لگانے کا حکم دیا تھا - اسی طرح اگر ہندوستان سے باہر کے علما کو دیکھیں تو معلوم ہوگا - کہ ان میں سے کئی سر سید کے ہمخیال ہیں - سر سید نے اہلِ کتاب کا ذبیحہ جائز قرار دیا تو ہندوستان کے علما نے اس کی بڑی مخالفت کی - لیکن اس کے تیس برس بعد مصر کے مفتیٔ اعظم نے اسکے حق میں فتویٰ دیا - سر سید نے کہا گورنمنٹ یا بنکوں کے قرضے پر سود لینا جائز ہے - اور علما نے نہ مانا لیکن مصر میں مفتیٔ اعظم نے اسے جائز قرار دیا ہے ۔۰

مصر میں "المنار" غالباً عربی کا سب سے موقر اسلامی رسالہ ہے - اس نے بہت حد تک مصر کو ترکی کی تقلید سے بچایا ہے - اور اسلام کے مخالفوں کے مقابلے میں ڈھال کا کام دیا ہے - اس کے ایڈیٹر علامہ رشید رضا کو "حجتہ الاسلام" کہتے ہیں[1] - انہوں نے اپنے رسالے میں قرآن مجید کی ایک اہم تفسیر شائع کی ہے - جس کا کچھ حصہ مفتی محمد عبدہٗ کے خطبات سے ماخوذ ہے اور کچھ حصہ سید رشید رضا کا اپنا لکھا ہوا ہے - اس تفسیر کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ بالآخر اکثر مسائل میں "جامعہ الازہر" کے تعلیم یافتہ فقیہہ اور مصر کے سب سے بڑے عالم اُسی رستے پر چل رہے ہیں - جو سر سید نے آج سے پچاس سال پہلے دکھایا تھا - چند اہم مسائل کا ذکر ہم اوپر کر چکے ہیں - تعدادِ ازدواج کے مسئلے میں بھی "المنار" نے وہی طرزِ عمل اختیار کیا ہے - جو سر سید نے شروع کیا تھا - اسلام کو سائنس کے مطابق ثابت کرنے کی کوشش اسی طرح جاری ہے - جس طرح سر سید کی تفسیر القرآن میں تھی - سر سید نے بھی اجنہ کو بشریت کی قسم کی ہستیاں ماننے سے انکار کیا تھا - "المنار" بھی اس خیال سے متفق ہے - بلکہ اس کے مطابق جنّ جراثیم کی قسم کی کوئی چیز ہیں جو نظر نہیں آتے مگر بیماریاں پھیلاتے رہتے ہیں !

---

[1] مولانا لطیف الدین ندوی نے اُن کے خیالات اردو میں قلمبند کئے ہیں - ان کی تفسیر کا اردو ترجمہ مجوزہ کے مشہور رسالہ "فاران" میں شائع ہو رہا ہے - اور وہاں انہیں "امامِ جلیل" کے خطاب سے مخاطب کیا جاتا ہے - "الہلال" "فاران" اور "معارف" کے ناظرین ان سے اور مفتی محمد عبدہٗ سے خوب واقف ہیں - جو لوگ انگریزی جانتے ہیں - انہیں قاہرہ کے پروفیسر (C.C. Adams) کی کتاب (Islam & Modernism in Egypt) کا مطالعہ کرنا چاہیے ۔

مندرجہ بالا کئی مسائل ایسے ہیں۔ جنہیں دیکھ کر خیال ہوتا ہے کہ سرسید نے تفسیرِ قرآن میں جو طریقہ اختیار کیا تھا۔ اس کی کئی باتیں ہندوستان بلکہ دوسرے اسلامی ممالک کے علما اختیار کر رہے ہیں اور شاید اس کے سوا سرسید کا کوئی قصور نہ تھا۔ کہ وہ دوسرے علما کی بہ نسبت زیادہ دُور اندیش اور دُور بین تھے۔ لیکن جیسا کہ ہم نے گذشتہ باب میں بیان کیا ہے۔ تفسیر کی اشاعت نے سرسید کے کاموں کو نقصان بہت پہنچایا اور فائدہ بہت کم۔ ان کا اصل مقصد مسلمانوں میں تعلیم عام کرنا اور ان کی دنیوی ترقی کا انتظام کرنا تھا۔ اسلام اور تفسیرِ قرآن کے متعلق بالخصوص ان مسائل کے متعلق جن کا نہ تعلیم سے خاص تعلق ہے نہ دنیوی ترقی سے عام مسلمانوں سے گہرا اختلاف پیدا کر کے سرسید نے اپنی مخالفت کا سامان آپ پیدا کر لیا اور بعض لوگوں کو انگریزی تعلیم سے عقائد متزلزل ہو جانے کا جو ڈر تھا۔ اس کا بدیہی ثبوت خود بہم پہنچا دیا۔

اس کے علاوہ سرسید نے اپنی رائے اور قیاس کے زور سے قرآنی آیات کو نیا مفہوم دیکر ایک ایسی مثال قائم کر دی۔ جس کی پیروی بعضوں نے بری طرح کی ہے۔ اور ہر آیت یا حدیث کی تاویل کر کے حسب خواہش معنی مُراد لیتے ہیں۔ یو تپ سے کوئی بھی آواز اُٹھے۔ لوگ فوراً یہ کہنے کو تیار ہو جاتے ہیں۔ کہ ہمارے ہاں بھی یہی ہے۔ پچھلے دنوں ایک ایل ایل بی صاحب نے ایک رسالہ اس مضمون کا شائع کیا تھا۔ کہ اسلام میں مغربی طریقہ رقص یعنی "بال روم ڈانسنگ" کی اجازت ہے۔ اور اس خیال کی تائید احادیث اور روایات سے کی تھی۔ اس طریقے سے ایک تو مخالفین کی نظروں میں جن کے اعتراضات رفع کرنے کے لئے علم کلام کی ضرورت بنائی جاتی ہے۔ اسلام کی کوئی وقعت اور عزت نہیں رہتی۔ اور دوسرے قوم میں خود نیک و بد اور موزوں اور غیر موزوں کی تمیز اٹھ جاتی ہے۔ اور ایمان و یقین سے عاری لوگوں کے ہاتھوں میں مذہب ایک کھلونا بن جاتا ہے۔

جدید علم الکلام کی ناکامی کی ایک اصولی وجہ یہ ہے۔ کہ متکلمین عقل کو ہر چیز پر مقدم رکھ کر دلائل اور قیاسات کے ذریعے سے اسلام کی حقیقت واضح کرتے ہیں۔ بظاہر تو یہ طریق کار ٹھیک ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ عقائد اور ایمان کی بنیاد عقل پر اتنی نہیں ہوتی جتنی قلبی مشاہدے اور ذاتی تجربے پر

جب آدمی اپنے تجربے اور مشاہدے یا بقول غزالیؒ باطن کی آنکھوں سے اللہ کی قدرت دیکھ لیتا ہے۔ تو اس مشاہدے کی وجہ سے اُسے مصائب میں تسکین ملتی ہے اور زندگی کی جد وجہد میں تقویت پہنچتی ہے۔ پھر اُسے اس بات کی ضرورت نہیں رہتی کہ جزوی مسائل کو سائنس یا عقل کے ترازو میں تولے جیسا کہ اقبال نے "تشکیل الٰہیات" اور غزالیؒ نے "احیاء العلوم" میں واضح کیا ہے۔ مذہبی زندگی کی بنا روحانی تجربہ اور مشاہدہ ہے۔ عقل و قیاس نہیں۔ متکلمین خشتِ اوّل ہی ٹیڑھی رکھتے ہیں۔ اور یہی وجہ ہے۔ کہ اُن کے دلائل خواہ کس قدر موثر ہوں۔ اُن سے متشککین کی رُوحانی تسکین نہیں ہوتی اور سر سید کی قابلیت محنت اور مذہبی ہمدردی کے باوجود یہ نہیں کہا جا سکتا۔ کہ اُن کے علم کلام نے تعلیم یافتہ طبقے یا اربابِ شک والحاد کو ایمان کی دولت بہم پہنچائی ہے؏

لیکن علم کلام میں سب سے بڑی کمزوری وہی ہے۔ جسے ہم نے متکلمین سے اقبال کا مقابلہ کرتے ہوئے واضح کیا ہے۔ یعنی یہ لوگ انفرادی یا اجتماعی زندگی کی نشو و نما کے اصولوں پر اتنی توجہ نہیں دیتے جتنی معترضین کے اعتراضوں کے مطابق قطع و برید پر۔ اور اس طرح اصلاح و ترقی کا اصل راز اُن کی نظروں سے چھپ جاتا ہے ؎

دانش اندوختہ۔ دل زکف انداختہ
وائے زاں گوہرِ بے مایہ کہ درباختہ

حقیقت یہ ہے کہ کسی فرد یا کسی قوم کی ترقی کے لئے جزوی عقائد یا مسائل کو سائنس کے مطابق ناقابل اعتراض ثابت کرنے کی اتنی ضرورت نہیں ہوتی۔ جتنی ایمان بالغیب و یقین کامل اور اُن اخلاقی و رُوحانی خوبیوں کی جو مذہبِ حقہ کا عطیہ ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام کی تاریخ میں علم کلام یا معتزلہ عقائد کو کبھی نمایاں کامیابی نہیں ہوئی۔ جب کبھی عالم اسلام اور معتزلہ عقائد میں مقابلہ ہوا ہے۔ معتزلین تو قیاسی اور غیر ضروری گتھیاں سلجھانے میں مصروف رہے۔ لیکن اُمّت نے ابنِ تیمیہؒ اور امام حنبلؒ جیسی ہستیاں پیدا کر دیں جنھوں نے اپنے زورِ ایمان۔ جرأت۔ استقلال۔ اخلاص اور رُوحانی و اخلاقی عظمت سے معترضین کا منہ بند کر دیا۔ لوگوں نے دیکھا کہ معتزلین تو غیر ضروری اور لامتناہی بحثوں کے سوا کچھ نہیں کر سکتے۔ لیکن جو علما معتزلین کی طرح ضروری اور غیر ضروری۔ اصولی اور جزوی کا فرق سمجھنے سے عاری نہیں۔ اُن کے پاس

قرآن۔ توحید۔ اور رسالت کی صورت میں ایک ایسی دولت موجود ہے۔ جس کی وجہ سے وہ ابوبکرؓ صدیق اور عمرؓ فاروق کے نقشِ قدم پر چلنے والی ہستیاں پیدا کر سکتے ہیں۔ اور قوم کی نجات انہی ہستیوں کی پیروی میں ہے۔ متشکّکین اور متکلمین کی غیر ضروری بحثوں میں نہیں!

سر سید کے جدید علمِ کلام پر اس طرح کے کئی اعتراض ہو سکتے ہیں۔ لیکن اس امر کا اعتراف ضروری ہے۔ کہ سر سید نے جو کچھ کیا۔ قوم کی بہتری کے خیال سے کیا۔ شکوک و شبہات ایک نہ ایک دن پیدا ہونے ہی تھے۔ اس وقت تمام اسلامی ممالک میں جدید علم کلام کی ضرورت محسوس ہو رہی ہے۔ اور ایک طرح سے یہ اچھا ہوا۔ کہ جو منزل قوم کو آج بالکل ضرور طے کرنی تھی۔ وہ سر سید ایسی ہستی کی رہنمائی میں پہلے ہی طے ہو گئی۔ اس کے علاوہ سر سید نے جدید علم کلام کی ضرورت سمجھی ہے تو فقط اس وجہ سے کہ انہیں اسلام کی صداقت کا یقین کامل تھا۔ دنیا کی کئی قومیں ہیں۔ جن کے عقائد عقل کے خلاف ہیں۔ لیکن وہ مذہبی عقائد اور سائنس یا دنیاوی ترقی کو زندگی کے دو علیحدہ علیحدہ دائرے سمجھ کر کام کر رہی ہیں۔ مسلمان بھی ایسا ہی کر سکتے تھے لیکن سر سید کو پورا یقین تھا۔ کہ اسلام اور سائنس یا دنیوی ترقی میں کوئی تناقض نہیں۔ اس کے علاوہ یہ بھی صحیح ہے۔ کہ اگرچہ سر سید نے کئی مسائل میں جمہور سے اختلاف کیا۔ لیکن کئی باتوں میں ایسا اختلاف بڑے بڑے مسلمان علما و مشائخ نے کیا ہے۔ اور ان اختلافات سے اگر آدمی کافر ہو جائے۔ تو پھر اسلام میں قابلِ ذکر ہستی ہی کونسی باقی رہ جاتی ہے۔ جہاں تک اسلام کے اہم مذہبی اصولوں یعنی توحید و رسالت وغیرہ کا تعلق ہے۔ اُن پر سر سید کا پورا ایمان تھا۔ ظاہری باتوں میں بھی وہ شعائرِ اسلامی کا پورا خیال رکھتے تھے۔ اور جس طرح قرآن مجید کی آیات پڑھتے ہوئے اُن کا خاتمہ ہوا ہے۔ خدا کرے سب مسلمانوں کا ہو!

مولوی چراغ علیؒ

مذہبی بحثوں میں سر سید کے دستِ راست مولوی چراغ علی تھے۔ وہ صوبجاتِ متحدہ میں سرکاری ملازم تھے۔ پھر حیدر آباد بلا لئے گئے۔ اور نواب اعظم یار جنگ کے خطاب سے سرفیاب ہوئے۔ اُن کی وفات ۱۸۹۵ء میں بمقام بمبئی ہوئی۔

مولوی صاحب ہندوستان کے فاضل ترین علما میں سے تھے اُن کے علم و فضل پر سر سید ایک مضمون میں لکھتے ہیں۔ "متعدد علوم میں نہایت اعلیٰ درجے کی دستگاہ تھی۔ عربی علوم کے عالم تھے۔ فارسی نہایت عمدہ

جانتے تھے اور بولتے تھے۔ عبری و کالڈی میں نہایت اچھی دستگاہ رکھتے تھے۔ لیٹن اور گریک بقدر کارروائی جانتے تھے۔ اعلیٰ درجے کے مصنف تھے۔ انگریزی زبان میں بھی انہوں نے کتابیں تصنیف کی ہیں۔ مذہب اسلام کے ایک فلاسفر حامی تھے "۔

متعدد اردو رسائل و مضامین کے علاوہ جو "رسائل چراغ علی" کے نام سے شائع ہوئے ہیں۔ مولوی صاحب نے دو اہم کتابیں انگریزی میں لکھیں جن کا ترجمہ "تحقیق جہاد" اور "اعظم الکلام فی ارتقائے الاسلام" کے نام سے اردو میں شائع ہوا ہے۔

ان کتابوں میں جو چیز سب سے نمایاں ہے وہ مولوی صاحب کی وسعتِ علمی ہے۔ "رسائل چراغ علی" کی پہلی جلد کے آخیر میں جو فہرست ماخذات شائع ہوئی ہے۔ اس میں قریباً ایک سو چونسٹھ کتابوں کے نام درج ہیں۔ جن سے مولوی صاحب نے اپنے مضامین اخذ کئے ہیں۔ اور جن میں سے بیشتر عربی میں ہیں۔ اسی طرح "اعظم الکلام فی ارتقائے اسلام" میں جس میں انہوں نے ایک پادری کے اس خیال کی تردید کی ہے کہ اسلام انسانی ترقی کا مانع ہے۔ انہوں نے مغربی مصنفین کے اتنے حوالے دئے ہیں۔ کہ حیرانی ہوتی ہے کہ ہندوستان میں بیٹھ کر مولوی صاحب کو مغربی لٹریچر اور مغربی رسائل پر اتنا عبور کس طرح حاصل ہو گیا۔ انہوں نے اپنے دعوے کی تائید میں غالباً کوئی مفید مطلب بات نہیں چھوڑی۔ اور آج بھی ہندوستان میں شاید ہی کوئی ایسا عالم ہوگا۔ جسے اس مسئلے کی تفصیلات اور باریکیوں سے اتنی واقفیت ہو جتنی مولوی صاحب مرحوم کو تھی۔

"تحقیق جہاد" میں مولوی صاحب نے ثابت کیا ہے۔ کہ رسولِ کریم کی تمام جنگیں مدافعانہ تھیں۔ اور صرف مدافعت ہی کے لئے جہاد جائز ہے۔ آج کئی مسلمان اس رائے سے متفق نہیں لیکن مولوی صاحب کی کتاب پر تبصرہ کرتے وقت ایک تو ہمیں ان ٹھوس علمی اور مذہبی دلائل کا خیال کرنا چاہئے جن پر مولوی صاحب نے اپنے دعوے کی بنا رکھی ہے۔ اور دوسرے اس زمانے کے حالات کا اندازہ لگانا چاہئے۔ جب یہ کتاب لکھی گئی۔ اس وقت وہابیوں کے مقدمات کی وجہ سے "صادق پور" پٹنہ کا وہ محلہ جو ہندوستان میں ردِ بدعت کا ایک سرچشمہ تھا کھدوا ڈالا گیا تھا۔ کئی مخلص اور قابل آدمی جیلوں اور کالے پانی میں زندگی کے دن کاٹ

رہے تھے۔ ہزاروں آدمی جہاد کے متعلق عام خیالات سے متاثر ہو کر اپنی جانیں ہلاکت میں ڈال رہے تھے
نتیجہ یہ تھا کہ ایک تو کئی مخلص آدمی وہ طریقہ اختیار کر رہے تھے جس میں سراسر نقصان تھا۔ فائدے کا
کوئی امکان نہ تھا۔ اور دوسرے حکام مسلمانوں سے بدظن ہو رہے تھے۔ مولوی صاحب نے یہ کتاب لکھ کر ایک
ایسا راستہ بتایا جو قوم کے لئے مفید تھا۔ جو لوگ مولوی صاحب کے خیالات سے اختلاف رکھتے ہیں انہیں
یاد رکھنا چاہیئے۔ کہ علما کا باہمی اختلاف جو نیک نیتی پر مبنی ہوتا ہے۔ شرعاً باعث رحمت ہے"۔

"ریفارمز انڈر دی مسلم رُول" جو خلیفۃ المسلمین سلطان عبدالحمید خان کے نام معنون ہے۔ ایک اعلیٰ درجے
کی کتاب ہے۔ اس میں انہوں نے نہ صرف یہ ثابت کیا ہے۔ کہ اسلام دنیاوی ترقی کا مانع نہیں۔ بلکہ وہ
طریقے بتائے ہیں جن سے احکام اسلامی کے ماتحت مسلمان ہر طرح کی ترقی کر سکتے ہیں اور ترکی کی تاریخ
سے ثابت کیا ہے۔ کہ مسلمان ترکوں کے زمانے میں رواداری۔ سیاسی اور سوشل اصلاح کی وہ صورتیں
جاری رہی ہیں۔ جو کسی اور حکومت نے روا نہیں رکھیں۔ اس کتاب سے نہ صرف معترضین کے اعتراض
رفع ہوتے ہیں۔ بلکہ مصنف نے ان اسلامی حکومتوں اور مقننوں کو ایسے طریقے بتا دئے ہیں۔ جن سے
وہ اسلام کے دائرے میں رہ کر ہر طرح کی ترقی اور اصلاح کر سکتے ہیں۔ اور اگرچہ ان مسائل کے متعلق کسی
کتاب کو مکمل اور "لفظِ آخر" نہیں کہا جا سکتا لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ اس موضوع پر غالباً بہترین
کتاب یہی ہے۔ اور آج بھی جو لوگ مذہب اسلام کے مطابق ترقی اور اصلاح کرنا چاہتے ہیں۔ وہ اس
کتاب کو بہت مفید پائیں گے۔

سید امیر علی رح

سر سید اور اُن کے رفقا کی ایک نمایاں خصوصیت مدافعانہ اور معذرت آمیز
اندازِ بیان تھا۔ اُن کی تمام کوششیں دوسروں کے اعتراضات کا جواب دینے
میں صرف ہوئیں۔ اور ان کی مذہبی تحریروں کا نصب العین یہی تھا۔ کہ کسی طرح مذہبِ اسلام کو مغربی
علوم اور مغربی خیالات کے مطابق ثابت کر دیں یا بنا دیں۔ کسی حد تک تو یہ اسلوبِ خیال سیاسی حالات
کا نتیجہ تھا لیکن یہ بھی صحیح ہے کہ سر سید کو اگرچہ مسلمانوں کے نقائص سے پوری واقفیت تھی۔ لیکن یورپ
اور عیسائیت کے تاریک پہلو انہوں نے اچھی طرح نہ دیکھے تھے۔ اور اُن پر انہوں نے بہت کم نظر کی تھی۔

اب اسلام کی صحیح ترجمانی کے لئے ایسے شخص کی ضرورت تھی۔ جو اسلام سے بھی پوری طرح واقف ہو۔ سر سید سے کم دماغی قابلیت نہ رکھتا ہو۔ اس کے علاوہ دوسرے مذاہب اور یورپ کے ازمنۂ ماضیہ کی تاریخ اور موجودہ حالات سے پوری طرح واقف ہو۔ اور ان سب باتوں کو پیشِ نظر رکھ کر دوسرے مذاہب کے ساتھ اسلام کا موازنہ کرے اور اسلام کی صحیح تصویر دنیا کے سامنے پیش کرے۔

جس شخص میں اللہ نے یہ سب خوبیاں جمع کر دی تھیں اور جس نے ان خوبیوں کا پوری طرح فائدہ اٹھایا۔ اس کا نام سید امیر علی تھا۔ رائٹ آنریبل سید امیر علی ۶؍ اپریل ۱۸۴۹ء کو بنگال کے ایک گاؤں چنورہ میں پیدا ہوئے۔ اُن کے والد سید سعادت علی ایک دور اندیش بزرگ تھے۔ انہوں نے ہونہار بچے کو پوری تعلیم دی۔ سید امیر علی نے ۱۸۶۷ء میں یعنی علیگڑھ کالج کے قیام سے قریباً آٹھ سال پہلے بی اے کی ڈگری حاصل کی۔ تعلیم کے دوران میں اُن کے مربی بنگال کے قابلِ عظمت بزرگ نواب محمد لطیف تھے۔ جنہوں نے ۱۸۶۳ء میں "محمڈن لٹریری سوسائٹی کلکتہ" کا آغاز کر کے مسلمانوں کی اصلاح کے لئے وہ کوشش شروع کی تھی جسے سر سید اور اُن کے رفقا نے زیادہ زرخیز زمین میں کامیابی کے زینے تک پہنچایا۔ نواب صاحب نے سید امیر علی میں خاص دلچسپی لی اور "محسن فنڈ" سے جس کے ٹرسٹی مولوی کرامت علی تھے۔ سید صاحب کو اثنائے تعلیم میں مدد دلوائی۔ اور یہ صحیح ہے۔ کہ محسن فنڈ کے وظائف کے لئے سید امیر علی سے زیادہ موزوں طالب علم کبھی نہیں ہوا ہو گا۔ وہ اس زمانے میں بھی جب مسلمان تعلیم میں بہت پیچھے تھے۔ ہر امتحان میں اوّل رہتے اور بالآخر کلکتہ یونیورسٹی سے ایم اے۔ بی۔ ایل کی ڈگری خاص کامیابی کے ساتھ حاصل کر کے کامیاب ہوئے۔

اختتامِ تعلیم پر انہوں نے پریکٹس شروع کی لیکن تھوڑے عرصے کے بعد انہیں ولایت جانے کا موقعہ مل گیا۔ اُن دنوں گورنمنٹ آف انڈیا نے مختلف صوبوں میں اعلیٰ تعلیم کے لئے چند وظائف دینے شروع کئے تھے۔ صوبجاتِ متحدہ میں یہ وظیفہ سید محمود کو ملا جن کے ساتھ سر سید بھی ولایت ہو آئے۔ بنگال گورنمنٹ نے اس وظیفے کے لئے سید امیر علی کو چنا۔ جنہوں نے مسلمانوں کی وہ ساری اُمیدیں پوری کر دیں جو سید محمود نہ کر سکے۔

سید امیر علی ۱۸۷۳ء میں بیرسٹری کا امتحان پاس کر کے ہندوستان واپس آئے اور کلکتہ میں پریکٹس شروع

کی۔ ۱۸۷۷ء میں وہ کلکتہ یونیورسٹی کے فیلو منتخب ہوئے۔ اور اس سے اگلے سال پریذیڈنسی کالج میں محمڈن لا (شرع اسلامی) کے پروفیسر ہو گئے۔

۱۸۷۶ء میں انہوں نے "سنٹرل نیشنل محمڈن ایسوسی ایشن" کی بنیاد رکھی جس کے وہ پچیس سال سیکرٹری رہے ۱۸۷۸ء میں گورنمنٹ نے انہیں پریذیڈنسی مجسٹریٹ متعین کیا اور جلد ہی وہ اپنی قابلیت کی وجہ سے عارضی طور پر چیف پریذیڈنسی مجسٹریٹ ہو گئے۔ لیکن یہ کام ان کے دوسرے مشاغل میں حارج تھا۔ ۱۸۸۱ء میں انہوں نے استعفےٰ دے دیا اور پھر پریکٹس شروع کی۔ ۱۸۸۳ء میں بنگال لیجسلیٹو کونسل کے ممبر نامزد ہوئے اور اس کے بعد بہت جلد امپریل لیجسلیٹو کونسل کے رکن بنا دئے گئے۔ وہاں انہوں نے بڑی محنت اور قابلیت سے کام کیا۔ مختلف معزز اسامیوں پر مامور رہنے کے بعد ۱۸۹۰ء میں ہائی کورٹ کے جج بنائے گئے۔ سید محمود کے بعد وہ پہلے مسلمان تھے۔ جنہیں اس معزز عہدے کے لئے چنا گیا۔ ۱۹۰۰ء تک وہ ہائیکورٹ کے جج رہے۔ اور پچپن سال کی عمر میں ملازمت ختم کر کے انگلستان جا مقیم ہوئے۔ جو ان کی ادبی۔ مذہبی اور سیاسی سرگرمیوں کے لئے زیادہ موزوں جگہ تھی۔ لیکن جلد ہی گورنمنٹ نے ان کو پریوی کونسل کے لئے چن لیا۔ وہ پہلے ہندوستانی تھے۔ جو اس بلند ترین قانونی عہدے پر مامور ہوئے۔ ۲۳ نومبر ۱۹۰۹ء سے لے کر اپنی وفات تک وہ اس عہدے پر فائز رہے۔

رائٹ آنریبل سید امیر علی کی زندگی بڑی کامیاب زندگی تھی۔ انہوں نے ذاتی قابلیت کے سہارے وہ بلند مدارج حاصل کئے۔ جن پر ابھی تک کوئی ہندوستانی نہ پہنچا تھا۔ اور اس عام غلط فہمی کو دُور کیا۔ کہ مسلمان دوسری قوموں سے کم قابل ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ ان کی اپنی شخصی زندگی بڑی پاکیزہ اور قابلِ تقلید تھی۔ ایک امریکن جس نے انیسویں صدی کے آخر میں ہندوستان کا سفر کیا اور جسے سید صاحب سے ملنے کا اکثر اتفاق ہوا۔ اپنی کتاب میں لکھتا ہے کہ "اس شخص کی زندگی اور سیرت دیکھکر ایک منصف مزاج انسان ان باتوں پر شک کرنے لگتا ہے جو عام مسلمانوں کے متعلق یورپ اور امریکہ میں پھیلائی جاتی ہیں اور اس مذہب کو بہ نظرِ احترام دیکھنے لگتا ہے۔ جس کا ایک فرد اس قدر پاکیزہ سیرت اور روحانی و اخلاقی خوبیوں کا مجموعہ ہو"۔ سید صاحب شیعہ تھے۔ لیکن جس طرح ہندوستان کے سُنّی مسلمانوں نے اپنی تمدنی

اور سیاسی زندگی میں شیعہ سُنی کا کوئی خیال نہیں رکھا۔ اور اپنی قسمت کی باگ آغا خان۔ مسٹر جناح۔ مہاراجہ صاحب محمود آباد اور دوسرے شیعہ حضرات کے ہاتھ میں دے رکھی ہے۔ اسی طرح شیعہ طبقے کی بہترین اور قابلِ فخر ہستیوں نے اپنی زندگی اور اپنے سیاسی و تمدنی مشاغل میں فرقہ وارانہ اختلافات کو کوئی جگہ نہیں دی۔ سید امیر علی ان حضرات میں ایک نمایاں حیثیت رکھتے تھے۔ انہوں نے اپنی "تاریخ اسلام" میں جہاں حضرت علی کے حالات جوش اور عقیدت سے لکھے ہیں۔ وہاں حضرت عمرؓ کی تعریف میں بھی کمی نہیں کی۔ ہندوستانی مسلمانوں کے عام قومی مسائل میں تو شیعہ سُنی کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ لیکن سید صاحب نے کئی ان نیم مذہبی مسائل (مثلاً خلافت کا مسئلہ) میں جن سے بطور ایک شیعہ کے انہیں کوئی دلچسپی نہ تھی۔ ہندوستان کے سُنی مسلمانوں کی ترجمانی سُنیوں سے بڑھکر کی۔ جب ترکوں نے خلافت کا خاتمہ کر دیا۔ اور سید صاحب اور ہز ہائی نس آغا خان نے ایک مؤدبانہ مگر مدلل خط میں ہندوستانی مسلمانوں کے خیالات حکومتِ ترکی تک پہنچائے تو عصمت پاشا نے ان دونوں خادمانِ اسلام کو یہ کہکر ڈانٹا۔ کہ تم دونوں شیعہ ہو۔ سُنیوں کی ترجمانی کیا کر سکتے ہو۔ سید صاحب کو اس کا بہت رنج ہوا۔ انہوں نے لندن میں بیٹھ کر مدت العمر ترکوں کے خلاف غلط فہمیاں دور کرنے کی کوشش کی تھی۔ "انجمنِ ہلال احمر" کے سرگرم کارکن تھے۔ اور انہی کی وساطت سے خلافت کے چندے ترکوں تک جاتے تھے۔ اب انہی ترکوں نے ان کو اس طرح اہانت آمیز جواب دیا۔ لیکن سید صاحب کہتے تھے۔ کہ مجھے یک گونہ خوشی ہے کہ اگرچہ میں شیعہ ہوں میں نے سُنی بھائیوں کی ترجمانی کے لئے ڈانٹ کھائی ہے۔ یہ رائٹ آنریبل سید امیر علی۔ ہز ہائی نس آغا خان اور مسٹر جناح ہی کی سمجھ اور حمیتِ اسلامی ہے کہ ہندوستان میں شیعہ سُنی کا سوال اہم معاملات میں پیدا نہیں ہوا۔ اور بالعموم رواداری اور بے تعصبی کا ایک ایسا طریقہ اختیار ہو گیا ہے۔ جس پر دوسری قوموں کو حیرت ہوتی ہے۔ اور جس پر مسلمانانِ ہند جتنا بھی فخر کریں کم ہے ❊

سید امیر علی کی قومی زندگی کے کئی پہلو تھے۔ انہوں نے "سنٹرل محمڈن ایسوسی ایشن" ۱۸۷۶ء میں قائم کی۔ جو مسلم لیگ کے قیام سے پہلے مسلمانوں کی اہم ترین سیاسی انجمن تھی۔ لارڈ منٹو کے شہرۂ آفاق اعلان سے پہلے ہندوستانی مسلمانوں کے تحفظ کے متعلق سب سے اہم اعلان جو کسی وائسرائے نے

کیا وہ لارڈ ڈفرن کا اعلان تھا اور یہ اُنہوں نے "سنٹرل محمڈن ایسوسی ایشن" ہی کے میموریل کے جواب میں گورنمنٹ ریزولیشن کی صُورت میں شائع کیا تھا۔ اسی طرح جب لارڈ منٹو کے اعلان کے بعد یہ کوشش ہوئی کہ لارڈ مارلے کے وزیر ہند اِن مواعید کو قبول نہ کریں جو وائسرائے نے مُسلم وفد سے کئے تھے۔ تو سید امیر علی لارڈ مارلے کے پاس ایک وفد لے کر لندن گئے اور ان مواعید کو پورا کرنے کی ضرورت بڑی قابلیت سے سمجھائی۔ ایسی کوششیں اُنہوں نے ساری عمر جاری رکھیں۔ اور بعض لوگ انہیں ہندوستانی مُسلمانوں کا غیر سرکاری سفیر کہتے تھے۔ سید صاحب کی ان کوششوں کے علاوہ اُن کے قانونی مشاغل کا تذکرہ بڑا دلچسپ ہے۔ لیکن یہاں تفصیلات کی گنجائش نہیں۔ دوست دشمن سب ان کے قانونی فیصلوں کے مدّاح تھے اور شرعِ اسلامی پر تو ان سے بہتر فیصلے کسی کے نہیں۔ ہائی کورٹ کے جج کی حیثیت سے اُنہوں نے اوقاف کے متعلق ایک ایسا فیصلہ کیا تھا جس سے بنچ کے باقی ارکان متفق نہ تھے۔ لیکن پریوی کونسل نے اُسی کو صحیح پایا۔ قانونِ شہادت۔ قانونِ مزارعان بنگال وغیرہ پر اُن کی کتابیں اب تک بہترین سمجھی جاتی ہیں۔ لیکن اُنہوں نے سب سے زیادہ محنت غالباً شرع اسلامی کی تدوین اور اصلاح میں کی۔ اس موضوع پر اب تک جو فقہ کی کتابیں تھیں ان کے مسائل ان کی طرزِ تحریر اور عام نقطۂ نظر زمانۂ حال کی ضروریات کے لئے کافی نہ تھا۔ سید صاحب نے فقہ پر دو ضخیم جلدیں لکھ کر اسے زمانۂ حال کی ضرورتوں کے مُطابق مرتّب کیا۔ اس موضوع پر اُنہوں نے طُلبا کے لئے جو مختصر سی کتاب لکھی ہے وہ تقریباً سب یونیورسٹیوں میں رائج ہے۔ "پرسنل محمڈن لا" پر بھی اُنہوں نے ایک مفید کتاب لکھی۔ قانونی تصنیفات میں اُنہوں نے ضروریاتِ زمانہ اور فقہ اسلامی کی سپرٹ کا خاص طور پر خیال رکھا ہے۔ چند معاملات میں بعض قدامت پسند لوگوں کو اُن کی رائے سے اختلاف ہے لیکن اگر فقہ اسلامی کو اُن دقیانوسی اصولوں پر نہیں چلنا۔ جن سے تنگ آکر ترکوں نے شرع کا قانون ہی سرے سے اُڑا دیا' اور اگر اسے قومی ضروریات کے مُطابق بتدریج ترقی اور توسیع پانا ہے تو فقہ اسلامی کی اِس ترجمانی سے گریز نہیں جو سید امیر علی نے کی +

قانونی کتب کے علاوہ سید امیر علی نے تاریخی مباحث پر بھی کتابیں لکھیں۔ زندگی کے آخری ایام میں وہ ہندوستان کے اسلامی تہذیب و تمدن کی تاریخ لکھ رہے تھے۔ بدقسمتی سے یہ کتاب مکمل نہ ہوسکی۔ فقط ایک مضمون رسالہ "اسلامک کلچر" حیدرآباد میں دو قسطوں میں شائع ہوا ہے۔ لیکن تاریخ اسلام پر انہوں نے جو کتاب لکھی ہے وہ اپنے موضوع پر نہایت اہم کتاب ہے۔ اس میں انہوں نے خلافتِ راشدہ۔ بنو امیہ اور بنی عباس کی خلافت کے حالات بغداد کی تباہی تک اس طرح لکھے ہیں کہ تاریخی واقعات کے ساتھ ساتھ اسلام کی معاشرتی۔ ذہنی اور اقتصادی ترقی بھی نظر آجاتی ہے۔ یہ کتاب انگریزی میں تھی۔ لیکن جلد ہی اُردو میں اُس کا ترجمہ ہوگیا۔ اِس ترجمے سے پہلے تاریخ اسلام پر اُردو میں کوئی قابلِ ذکر کتاب نہ تھی۔ اس کی اشاعت نے دوسروں کا کام بہت آسان کردیا اور اب اِس موضوع پر اُردو میں کئی کتابیں ہیں۔ اس کتاب کی اہمیت کا اندازہ اِس امر سے ہوسکتا ہے کہ بغداد کی تباہی تک کے حالات بعد کی کتابوں میں بھی مکمل ہیں۔ لیکن بغداد کی تباہی سے زمانۂ حال تک کے واقعات کسی کتاب میں صحیح طور پر درج نہیں۔ اور اسلام کے دَورِ جدید کی تاریخ جس کی واقفیت روزمرہ کے سیاسی مسائل کو سمجھنے اور اُن میں عملی دلچسپی لینے کے لئے ازبس ضروری ہے ابھی تک لکھی نہیں گئی۔ مثلاً جاوا کے چار کروڑ مسلمانوں اور نائجیریا کی ان بلند ہمت ہستیوں کے حالات سے عام اُردو دان بالکل بے خبر ہیں جنہوں نے اُنیسویں صدی میں مغربی افریقہ کے ایک وسیع خطے میں علمِ اسلام بلند کیا۔ اور وہ بھی اس زمانے میں جب اسلام ہر طرف شکست کھا رہا تھا۔ غرض اُردو ادب ایک دوسرے امیر علی کا منتظر ہے۔ جو مغربی اور مشرقی کتابوں کی مدد سے اِس دَورِ جدید کی مکمل اور صحیح تاریخ لکھ دے۔ اس سے ایک تو قوم کی واقفیت میں اضافہ ہوگا۔ دوسرے مُستقبل کے متعلق سوچنے میں مدد ملے گی +

سید امیر علی کی قانونی اور تاریخی کتابیں بہت قابلِ قدر ہیں۔ لیکن اس میں شک و شبہ کی کوئی گنجائش نہیں کہ اُن کا شاہکار اُن کی مشہور کتاب

"سپرٹ آف اسلام" ہے۔

سیّد صاحب نے اِس موضوع پر ایک کتاب اُسی زمانے میں لکھی تھی جب وہ حصولِ تعلیم کے لئے انگلستان میں مقیم تھے۔ یہ کتاب ۱۸۷۳ء میں انگریزی زبان میں شائع ہوئی۔ لیکن بعد میں انہوں نے بہت اضافہ کیا اور انتقال سے چند سال پہلے "سپرٹ آف اسلام" کا ایک نیا ایڈیشن شائع کیا جو قریباً پانچ سو صفحات پر مشتمل ہے۔ سیّد صاحب نے اسلام کے متعلق کئی کتابیں لکھیں مثلاً ایک مختصر رسالہ "اسلام" اور "اخلاقیاتِ اسلام"۔ لیکن ان کی شہرت زیادہ تر سپرٹ آف اسلام[1] پر ہی مبنی ہے جو رسُولِ کریمؐ کی زندگی اور تعلیمات پر بہترین کتاب سمجھی جاتی ہے۔

سیّد امیر علی نے اس کتاب میں سرسیّد کی طرح اسلام کی آزادانہ ترجمانی کی ہے اور کئی اہم مسائل مثلاً غلامی۔ تعدادِ ازدواج اور معجزات وغیرہ کے متعلق وہی رائے ظاہر کی ہے جو سرسیّد کی تھی۔ لیکن سیّد امیر علی کی کتاب کو سرسیّد کے "انگریزی خطبات" پر کئی لحاظ سے فوقیت حاصل ہے۔ پہلا امتیاز تو یہ ہے کہ سرسیّد کی کتاب نامکمل ہے اور "سپرٹ آف اسلام" ایک جامع اور مکمل کتاب ہے۔ اِس کے علاوہ سرسیّد کے خطبات اُردو سے انگریزی میں ترجمہ ہوئے ہیں۔ اِس لئے زورِ عبارت اور طرزِ تحریر کے لحاظ سے وہ "سپرٹ آف اسلام" سے کسی قدر پست ہیں۔ لیکن اہم ترین فرق جو سیّد امیر علی کی تصنیفات کو سرسیّد کی تصنیفات پر فوقیت دیتا ہے۔ اوّل الذکر کی وہ واقفیت ہے جو انہیں عیسائی۔ یہودی و ہندو مذاہب اور مسیحی ممالک کی تاریخ سے تھی۔ اسلام اور عیسائیت کا موازنہ کرتے ہوئے اس واقفیت کا استعمال اُنہوں نے بڑی قابلیت سے کیا ہے۔ سرسیّد میں قابلیت اور حمیّتِ اسلامی کی کوئی کمی نہ تھی۔ لیکن مسیحیت اور یورپ کی تاریخ سے اُنہیں پُوری

---

[1] اس کتاب کے پہلے حصّے کا ترجمہ "سرورِ کائنات" کے نام سے قومی کُتب خانہ ریلوے روڈ لاہور نے شائع کیا ہے۔ جو لوگ انگریزی نہیں جانتے۔ وہ اسے ضرور پڑھیں۔

واقفیت نہ تھی۔ وہ یورپ کی کوئی زبان نہ جانتے تھے اور قیامِ انگلستان کے دوران میں انہیں وہاں کی اچھی چیزیں ہی نظر آئیں۔ سید امیرؔ علی کو مسیحیت اور یورپ کی تاریخ سے خوب واقفیت تھی۔ اُن کی زندگی کا اہم حصہ یورپ میں گذرا تھا۔ وہ خوب جانتے تھے کہ اگر عیسائی مورخین اسلام پر بزورِ شمشیر پھیلنے کا غلط الزام لگاتے ہیں تو مسیحیت کی خونیں تاریخ کو بھی چھپایا نہیں جا سکتا۔ کانسٹنٹائن نے مسیحیت کی حمایت میں جس طرح تلوار اُٹھائی اور اُندلس کے مسلمان، یا بیت المقدس کے شہری مختلف وقتوں میں جس بے رحمی سے تلوار کے گھاٹ اُتارے گئے وہ بھی دُنیا کو خوب معلوم ہے۔ اسی طرح اگر رسولِ کریمؐ کے چند مُبیّنہ مُعجزات کو خلافِ عقل کہا جا سکتا ہے تو مسیحیت کی تو بنیاد ہی ایسے عقائد پر ہے جو عقل سے بعید ہیں۔ سید امیرؔ علی نے تقلیدِ سلف سے آزاد ہو کر اسلام کی ترجمانی کی۔ رسولِ اکرمؐ کی زندگی کے واقعات میں فقط معتبر روایات کو لیا۔ اور اسلام کی رُوح کو آشکار کرنے کے لئے سب سے زیادہ زور قرآن پر دیا اور پھر مسیحیت اور دوسرے مذاہب سے اسلام کی تعلیمات کا مقابلہ کر کے اسلام کی فوقیت اس ناقابلِ تردید طریقے سے بتائی کہ مخالفین کو بھی اس کی صحت کا اقرار کرنا پڑا۔ ایک انگریز مستشرق نے "سپرٹ آف اسلام" کے متعلق لکھا ہے کہ اسلام کی اس سے بہتر تصویر کھینچنا ناممکن ہے۔ اور جو کچھ اسلام کے حق میں کہا جا سکتا تھا امیرؔ علی نے کہہ دیا ہے۔ اس بات سے تو ہم متفق نہیں کہ مُستقبل میں بھی اس موضوع پر اس سے بہتر کتاب نہیں لکھی جائے گی۔ لیکن یہ صحیح ہے کہ آج تک اِس موضوع پر اِس پائے کی اور کتاب کوئی نہیں لکھی گئی۔ اور جہاں تک اسلام اور دوسرے مذاہب کے مقابلے اور اسلام کے خلاف اعتراضات کے جوابات کا تعلق ہے۔ اِس سے زیادہ جامع اور مدلّل کتاب آج تک نہ کسی عربؔ نے لکھی ہے نہ تُرکؔ نے نہ مصریؔ نے۔ اور سید امیرؔ علی کا یہ علمی کارنامہ ایسا ہے جس پر ہندوستان کے تمام مُسلمان فخر کر سکتے ہیں +

مرزا غلام احمد اور قادیانی جماعت

سرسید۔ مولوی چراغ علی اور سید امیر علی نے کئی مذہبی امور کی ترجمانی میں عام مسلمانوں سے اختلاف کیا۔ لیکن اُنہوں نے کوئی نیا فرقہ نہیں قائم کیا۔ اُن کے طریقِ کار کو "جدید علم الکلام" یا "نو معتزلہ" کہا جاسکتا ہے۔ کیونکہ اُنہوں نے مسائل اسلامی کو جدید فلسفے اور علوم کے مُطابق ثابت کرنے کے لئے وہی طریقے اختیار کئے جو اسلامی علوم کو فلسفۂ یونانی کے مطابق ثابت کرنے کے لئے دورِ عباسیہ میں معتزلین یا متکلمین نے اختیار کئے تھے۔ لیکن اس کے باوجود سرسید یا اُن کے ہم خیال حضرات نے کوئی علیحدہ فرقہ نہیں قائم کیا۔ اُن کا مقصد اپنی سمجھ کے مطابق عام مسلمانوں کے خیالات کی اصلاح تھا اور اسی لئے اُنہوں نے اپنے خیالات قوم کے سامنے پیش کئے۔ لیکن ان میں کوئی مجدّدیت یا نبوت یا ولائت کا دعوے دار نہ تھا۔ اور اُنہوں نے کوئی علیحدہ جماعت بنانے کی کوشش نہیں کی۔ اِسی زمانے میں ایک صاحب پیدا ہوئے جنہوں نے جدید متکلمین کی بعض باتیں اخذ کرلیں لیکن جن کی تعلیمات کی امتیازی خصُوصیت ان کے ذاتی اور شخصی دعوے ہیں۔ یہ صاحب قادیانی فرقہ کے بانی مرزا غلام احمد تھے +

مرزا غلام احمد ۱۸۳۷ء میں پنجاب کے ایک گاؤں قادیاں ضلع گورداسپور میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم کے بعد والد نے اُنہیں ڈپٹی کمشنر سیالکوٹ کے دفتر میں ملازم کرادیا۔ لیکن وہاں اُن کا دل نہ لگا اور چند سال کی ملازمت کے بعد اُنہوں نے استعفےٰ دے دیا۔ سیالکوٹ میں قیام کے دوران میں مذہبی امور سے اُن کی دلچسپی بہت بڑھ گئی اور "اسکاٹلینڈ چرچ" کے مشنریوں کے ساتھ وہ اکثر بحثیں کیا کرتے تھے۔ ۱۸۷۶ء میں اُن کے والد کی وفات ہوگئی اور وہ ایک طرح سے بالکل آزاد ہوگئے۔ ان دنوں اُن کی حالت نیم مجذوبانہ سی رہتی تھی۔ تذکرہ نگار لکھتے ہیں کہ اُنہیں مٹی چوسنے اور مٹھائیاں کھانے کی بڑی عادت پڑ گئی تھی۔ اور جب وہ بازاروں میں اپنے خیالات میں مگن پھرا کرتے تھے تو گلیوں کے چھوکرے اُن کی جیبوں سے

مٹھائی نکال کر کنکر ڈال دیا کرتے تھے اور انہیں خبر تک نہ ہوتی تھی۔ لیکن ایسی حالت کے باوجود اُنہوں نے عربی۔ فارسی اور اُردو لکھنے کی مشق جاری رکھی اور ۱۸۸۰ء میں "براہینِ احمدیہ" شائع کی۔ جس میں اختلافی مسائل بہت کم تھے اور جسے بالعموم مسلمانوں نے بہت پسند کیا لیکن ۱۸۹۱ء میں اُنہوں نے اپنے مسیح موعود اور مہدی ہونے کا دعوےٰ کیا۔ جس کی وجہ سے اُن میں اور عام مسلمانوں میں اختلاف اور مخالفت کا دروازہ کھلا۔ مولوی محمد حسین نے جو اب تک اُن کے دوست تھے اُن کے خلاف کفر کا فتوےٰ دیا اور علماءِ اسلام۔ آریہ سماجی اپدیشک اور عیسائی پادری سب اُن کے خلاف ہو گئے۔ ۱۸۹۲ء میں اُنہوں نے قادیاں سے "ریویو آف ریلیجنز" شروع کیا۔ جسے انہوں نے اپنے خیالات کی اشاعت کا ذریعہ بنایا۔ ان کا بیشتر وقت مباحثوں مباہلوں۔ پیش گوئیوں اور تصنیف کتب میں گذرتا۔ ۱۹۰۵ء میں اُنہوں نے اپنی وصیت لکھی۔ اور اپنی جماعت کے مستقبل کے متعلق ہدایتیں دیں۔ ۲۶ مئی ۱۹۰۸ء کو جب ایک کانفرنس میں شرکت کے لئے لاہور آئے ہوئے تھے۔ اُن کا انتقال ہو گیا۔ نعش قادیاں میں دفن ہوئی +

مولوی چراغ علی صاحب سے مرزا صاحب کی خط و کتابت تھی جہاد کے متعلق اُنہوں نے مولوی صاحب ہی کی رائے اختیار کی۔ اسی طرح حضرتِ عیسےٰ کے متعلق اُنہوں نے بیشتر سر سید کے خیالات کی پیروی کی۔ اگرچہ اُن کی تعلیمات میں کئی باتیں نو مُعتزلہ خیالات سے قریب تھیں۔ لیکن اکثر اصولی باتوں میں وہ قدامت پسند تھے۔ اور عام مسلمانوں سے اُن کے فرقے بالخصوص قادیانی گروہ کا اختلاف بیشتر مرزا صاحب کے اپنے دعاوی کے متعلق ہے۔ اُنہوں نے مسیحِ موعود۔ مہدیٔ مُنتظر اور کرشن اوتار ہونے کا دعوےٰ کیا۔ اور یہ ایسے دعوے ہیں جن کو عام مسلمان جھوٹا مانتے ہیں۔ نبوّت کا دعوےٰ کر کے اور ایک نیا فرقہ کھڑا کر کے اُنہوں نے مسلمانوں میں جو اختلاف پیدا کیا ہے اُسے بھی مسلمان ناپسند کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ اُن کی زندگی کے کئی واقعات ایسے ہیں جنہیں عام مسلمان پیغمبرانہ شان کے منافی سمجھتے ہیں +

اس کے باوجود اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ اُن کی جماعت میں روز بروز

اضافہ ہو رہا ہے۔ اگرچہ مرزا صاحب کی وفات کے چند ہی سال بعد جماعت میں ایک مسئلے پر اختلاف ہو گیا تھا جس کی وجہ سے کئی قابل اور مخلص لوگ علیحدہ ہو گئے تھے۔ لیکن جماعت کے اعداد و شمار سے ظاہر ہے۔ کہ ان میں کوئی نمایاں کمی نہیں ہوئی۔ شاید اس کی وجہ جماعت کا نظام اور منتظموں کا مذہبی جوش ہے۔ ہندوستانی مسلمانوں میں کوئی مذہبی جماعت ایسی نہیں جو اس قدر منتظم اور سرگرمِ عمل ہو۔ نئے تعلیم یافتہ لوگوں کو تشکک اور مادّیت نے عملی کام کے قابل نہیں چھوڑا۔ اور پرانے علما زمانے کی ضروریات سے ناواقف ہونے کی وجہ سے ایک عالمِ جمود میں ہیں۔ اُن کے مقابلے میں احمدیہ جماعت میں غیر معمولی مستعدی۔ جوش۔ خود اعتمادی اور باقاعدگی ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ تمام دُنیا کے رُوحانی امراض کا علاج اُن کے پاس ہے۔ یہ اعتقاد غلط ہو یا صحیح۔ لیکن اس نے اُن کے کاموں میں ایک رُوح پھُونک دی ہے۔ جو قادیانیوں کے بعض عجیب و غریب عقائد اور بانی کی شخصی خصوصیات کے باوجود کئی لوگوں کو اپنی طرف کھینچ لیتی ہے ÷

اس کے علاوہ شاید یہ بھی صحیح ہے کہ عام مسلمانوں نے جس انداز سے قادیانیوں کی مخالفت کی ہے اُس سے اُس جماعت کو اتنا نقصان نہیں پہنچا جتنا فائدہ۔ قرآن نے مسلمانوں بلکہ مسلمانوں اور دوسری قوموں کے درمیان فوقیت پانے کا طریقہ یہ بتایا تھا۔ کہ وہ نیک کاموں میں ایک دوسرے پر سبقت لے جائیں اور اللہ اُنہیں جزا دے گا۔ انسانی زندگی کا یہ اٹل قانون دورِ حاضر کے بعض مناظرین نے پوری طرح نہیں سمجھا۔ عیب جوئی۔ مخالفت اور تشدّد سے دوسرے فرقوں اور جماعتوں کی ترقی بند نہیں ہو سکتی۔ جو فرد اپنی جماعت کی ترقی چاہتا ہے اُس کے لئے ضروری ہے۔ کہ وہ نیک کاموں میں دوسروں سے بڑھ چڑھ کر حصّہ لے۔ ان بزرگوں نے عام مسلمانوں کو نظم و نسق۔ مذہبی جوش اور تبلیغ اسلام میں مرزائیوں پر فوقیت حاصل کرنے کی ضرورت نہیں سمجھائی۔ بلکہ بیشتر فتووں اور عام مخالفت سے "فتنۂ" قادیاں کا سدِّ باب کرنا چاہا۔ اور یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ جب کسی قوم کے ساتھ

سختی کی جائے تو اکثر اُس میں ایثار اور قربانی کی خواہش بڑھ جاتی ہے۔ چنانچہ جب کبھی عام مُسلمانوں نے قادیانیوں کی مخالفت میں معمولی اخلاق۔ اسلامی تہذیب اور رواداری کو ترک کیا ہے تو اُن کی مخالفت سے قادیانیوں کو فائدہ ہی پہنچا ہے۔ اُن کی جماعت میں ایثار اور قربانی کی طاقت بڑھ گئی ہے۔ اور ان کے عقائد اور بھی مستحکم ہو گئے ہیں +

احمدیہ جماعت لاہور

مرزا غلام احمد کی وفات ۱۹۰۸ء میں ہوئی۔ اُن کے بعد حکیم نور الدین پہلے خلیفہ منتخب ہُوئے۔ لیکن جماعت کا انتظام بیشتر 'صدر انجمن احمدیہ' کے ہاتھ میں رہا۔ اگرچہ حکیم صاحب کی خلافت کے دوران میں اُن کے اثر کی وجہ سے جماعت میں نفاق پیدا نہ ہُوا۔ لیکن اختلاف کا آغاز ہو گیا تھا۔ یہ اختلاف ۱۹۱۲ء کے قریب بہت نمایاں ہُوا۔ جب خواجہ کمال الدین نے لندن سے ایک رسالہ "مُسلم انڈیا اینڈ اسلامک ریویو" نکالنا شروع کیا۔ اس رسالے میں اُنہوں نے مولانا ظفر علی خان کے سیاسی خیالات کی پُوری طرح اشاعت کی۔ اور اس کے بعد کانپور کی مسجد کے حادثے کے متعلق جو شورش ہُوئی اس میں پُوری طرح حصّہ لیا۔ بعض قادیانیوں کو یہ بات ناگوار گذری۔ مرزا صاحب نے اپنی جماعت کو سیاسیات سے الگ تھلگ رہنے کی تلقین کی تھی۔ اور خواجہ صاحب کا کام بظاہر اس تلقین کے خلاف تھا۔ چنانچہ مرزا بشیر الدین محمود نے اخبار "الفضل" میں اس کے خلاف مضامین لکھنے شروع کئے۔ وائسرائے کے مصالحانہ فیصلے سے یہ مباحثہ تو بہت دیر جاری نہ رہا۔ لیکن اختلافات کا آغاز ہو گیا۔ کچھ لوگ مرزا بشیر الدین محمود کے ساتھ تھے اور کچھ لوگ یہ کہتے تھے کہ مرزا محمود مرزا غلام احمد کے صاحبزادہ ہونے کی وجہ سے جماعت کا سارا انتظام اپنے ہاتھ میں لینا چاہتے ہیں۔ چنانچہ جب حکیم نور الدین بیمار پڑے تو ایک جماعت نے یہ پروپیگنڈا شروع کیا کہ حکیم صاحب کے بعد کسی خلیفہ کی ضرورت نہیں۔ 'صدر انجمن احمدیہ' ہی احمدیہ جماعت کا انتظام چلا سکتی ہے۔ لیکن

فریقِ ثانی نے حکیم صاحب کی وفات کے بعد مرزا البشیر الدین محمود کو خلیفۃ المسیح ثانی چُن لیا۔ اور خواجہ کمال الدین۔ مولوی محمد علی۔ مولوی صدر الدین اور اُن کے ہم خیال حضرات قادیانی جماعت سے علیحدہ ہو گئے اور اس طرح لاہوری جماعت احمدیہ کا آغاز ہُوا +

لاہوری اور قادیانی جماعتوں کی تفریق بظاہر ذاتیات کے ایک مسئلے پر پڑی۔ لیکن اُس ذاتی اختلاف کی بنا بھی ایک اہم اصولی اختلاف تھا۔ لاہوری جماعت مرزا صاحب کی مُعتقد ہے۔ لیکن اس کے ساتھ حتےّ الوسع اپنے آپ کو عام مسلمانوں سے وابستہ رکھنا چاہتی ہے۔ اُن کے دُکھ سکھ میں اُن کا ہاتھ بٹانا چاہتی ہے۔ لاہوری احمدی غیر احمدیوں کو کافر نہیں کہتے۔ غیر احمدیوں کے پیچھے نماز پڑھتے ہیں۔ مرزا صاحب کی نبوت کے قائل نہیں۔ بلکہ اُنہیں حضرت مجددؒ الف ثانی اور دوسرے بزرگوں کی طرح ایک مجدد مانتے ہیں اور احمدیہ عقائد اور عام مسلمانوں کے عقائد میں جتنا کم اختلاف ہو اُسے بہتر سمجھتے ہیں۔ حقیقتاً مرزا محمود اور خواجہ کمال الدین کے درمیان ذاتی اختلاف بھی اسی مسئلے پر شروع ہُوا تھا۔ کہ خواجہ کمال الدین نے حادثہ کانپور کے متعلق عام مسلمانوں کے ساتھ اتفاق کیا تھا۔ اور بلقان اور طرابلس کے ہنگاموں میں اُن کے نقطۂ نظر کا اظہار کرنے میں پوری قوت صرف کر دی تھی۔ قادیانی بھی اگرچہ اب تبدیل حالات کے ساتھ مسلمانوں کے قومی مسائل میں زیادہ دلچسپی لینے لگے ہیں لیکن اسکے باوجود وہ اپنی علیحدہ اجتماعی ہیئت کا بڑا خیال رکھتے ہیں اور اگرچہ غیر مسلموں کی طرح اُن کا تہذیب و تمدن مسلمانوں سے مختلف نہیں لیکن مذہبی اُمور میں وہ اُن سے علیحدہ رہتے ہیں۔ جو شخص مرزا غلام احمد کو نبی نہیں مانتا اُسے کافر سمجھتے ہیں اور عام مسلمانوں کے پیچھے نماز نہیں پڑھتے +

لاہوری جماعت احمدیہ کا نظم و نسق انجمن اشاعتِ اسلام لاہور کے ہاتھ میں ہے۔ مولوی محمد علی ایم۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی جنہوں نے اعلےٰ تعلیم حاصل کرنے کے بعد مذہب کے لئے اپنی زندگی وقف کر دی تھی اُس کے صدر ہیں۔ اس جماعت کی تعداد بہت تھوڑی ہے۔ غالباً دو ہزار سے زیادہ نہیں۔ لیکن اس کے باوجود اس میں قابل اور مخلص حضرات

کی افراط ہے اور اتنی مختصر تعداد میں بھی اُس جماعت نے عملی کام بہت کیا ہے ۔

ایک اہم کام جو یہ جماعت کر رہی ہے قرآن مجید کی اشاعت ہے ۔ بالخصوص انگریزی دان مسلمانوں اور غیر مُسلموں میں ۔ مولینا محمد علی امیر جماعت احمدیہ کا ترجمہ وتفسیر قرآن انگریزی زبان میں پہلا ترجمہ تھا جو کسی مسلمان کے ہاتھوں سرانجام پایا ۔ ترجمے کے علاوہ آپ نے کلام مجید کی مختلف سُورتوں کی تقسیم وترتیب کر کے اور اُن کے مضامین کا خلاصہ دیکر مطالب قرآنی کو واضح کیا ہے اور کوشش کی ہے کہ صرف الفاظ ہی پر توجہ نہ رہے بلکہ کلام مجید کے ارشادات اور خیالات بھی وضاحت سے ذہن نشین ہو جائیں ۔

آج کل کلام مجید کے متعدد انگریزی ترجمے شائع ہو رہے ہیں ۔ لیکن شرف اولیت مولینا محمد علی ہی کو ہے ۔ اور گذشتہ ربع صدی میں انگریزی خوان طبقے کو قرآن سے جو زیادہ دلچسپی پیدا ہوئی ہے ۔ اُس کا ایک بڑا سبب مولینا محمد علی کا "ترجمۃ القرآن" ہے ۔

آج مولینا ابوالکلام آزاد نے مطالب قرآنی کو واضح کرنے کے لئے جو طریقہ اختیار کیا ہے اُس کا نمونہ مولوی محمد علی نے اب سے پچیس سال پہلے پیش کر دیا تھا ۔

انگریزی ترجمے کے علاوہ احمدیہ جماعت اشاعتِ قرآن کے دوسرے مسائل سے بھی غافل نہیں ۔ جرمن موجودہ یورپ کی علمی زبان ہے ۔ اس میں قرآن مجید کے ترجمے موجود ہیں ۔ لیکن غیر مسلموں کے ۔ اب اگر موجودہ یورپ کو اسلام سے صحیح واقفیت دلانی ہے تو ضروری ہے کہ جرمن میں قرآن مجید کا ایک صحیح ترجمہ ہو ۔ اور اس میں ترجمے کے ساتھ ساتھ اُن اعتراضات کا جواب بھی ہو جو عیسائی قرآن مجید کے بعض حوالوں پر کرتے ہیں ۔ چنانچہ انجمن نے یہ کام ہاتھ میں لے رکھا ہے ۔ اسی طرح شائد جرمن ترجمے سے بھی زیادہ ڈچ ترجمے کی ضرورت ہے ۔ جاوا ۔ سماٹرا میں قریباً پانچ کروڑ مسلمان ہیں ۔ اور جس طرح ہندوستان میں اعلٰے تعلیم کی زبان انگریزی ہے ۔ اسی طرح جاوا میں یہ مرتبہ ڈچ زبان کو حاصل ہے ۔ لیکن ڈچ میں کلام مجید کا کوئی ترجمہ کسی مسلمان کا کیا ہُوا نہیں ۔ اور چونکہ وہاں

مسائلِ حاضرہ کو حل کرنے کی ایسی کوئی عملی کوشش نہیں ہوئی جیسی ہندوستان میں سر سید اور سید امیر علی وغیرہ نے کی۔ اس لئے وہاں کا تعلیم یافتہ طبقہ مذہب سے روز بروز بیگانہ ہو رہا ہے۔ اور مشنریوں کو دُنیا کے کسی اسلامی مُلک میں اتنی کامیابی نہیں ہوئی جتنی ڈچ انڈونیشیا (جاوا سماٹرا) میں۔ احمدیہ جماعت اپنی بساط کے مطابق اِس فتنے کا مقابلہ کر رہی ہے۔ ۱۹۲۹ء سے جاوا میں احمدیہ مشن کام کر رہا ہے۔ اور مشنریوں کے مقابلے کے لئے جو ہتھیار ہندوستان میں برسوں کی محنت اور تجربے کے بعد تیار ہوئے تھے۔ وہ اب جاوا کے مسلمانوں کو مل رہے ہیں۔ ڈچ زبان میں دوسری کتب کی اشاعت کے علاوہ کلام مجید کا ترجمہ بھی چھپ گیا ہے۔ اور اُمید ہے کہ مذہب سے تعلیم یافتہ طبقے کی بیگانگی کا کافی سدِباب ہو جائیگا۔

قرآن مجید کے تراجم کے علاوہ حدیث اور اسلامی تاریخ کے متعلق بھی احمدیہ جماعت مختلف کتب شائع کر رہی ہے۔ حال ہی میں مولٰینا محمد علی نے مذہب اسلام پر ایک نہایت مبسوط اور مفصل کتاب لکھی ہے۔ جرمن۔ ڈچ۔ انگریزی۔ جاوی اور اُردو زبان میں کئی رسالے جاری ہیں۔ کچھ عرصہ ہوُا انجمن نے لاہور سے ایک نہایت بلند پایہ سہ ماہی رسالہ "مسلم ریوائول" (احیاءِ اسلام) کے نام سے انگریزی میں جاری کیا تھا۔ جس میں ادبی۔ سیاسی اور مذہبی مسائل پر نہایت بلند پایہ مضامین درج ہوتے تھے۔ علامہ اقبال نے اس کے لئے کئی مضامین لکھے۔ اگرچہ چند نامساعد اسباب کے باعث یہ رسالہ بند ہو گیا ہے۔ لیکن اپنی قلیل مدت حیات کے دوران میں اُس نے اسلامی صحافت کا جو بلند معیار قائم کیا تھا وہ بھی اسلام کی کچھ کم خدمت نہ تھی۔ اُس کے بعض مضامین (مثلاً فرقہ وارانہ نیابت کے متعلق مسٹر راغب حسین ایم۔ اے کا ۷۲ صفحے کا فاضلانہ مضمون۔ جو رسالے کی اشاعت ستمبر ۱۹۳۴ء میں شائع ہوُا) تاریخی حیثیت رکھتے ہیں۔ اور مستقبل کا مؤرخ کئی امور کے متعلق اس رسالے کے فائل مفید پائیگا۔

تبلیغ | یہ صحیح ہے کہ قرآن مجید کی اشاعت اور عام مذہبی خدمت کے علاوہ اہم ترین

کام جو لاہوری جماعت احمدیہ نے انجام دیا ہے۔ وہ ہندوستان کے باہر اشاعتِ اسلام ہے۔ اُن کے کام کی اہمیت کا اندازہ کرنے کے لئے اُس زمانے کو پیشِ نظر رکھنا چاہئے۔ جب یہ کام شروع کیا گیا تھا۔ پھر اس عالمگیر سنسنی کا تصوّر کیجئے جو لارڈ ہیڈلے کے قبول اسلام سے ساری عیسائی دُنیا میں پھیل گئی تھی +

خواجہ کمال الدینؒ کو یہ کامیابی ۱۹۱۳ء میں ہُوئی۔ انیسویں صدی مسلمانوں کے سیاسی زوال کا زمانہ تھی۔ اور غیر مسلم قومیں بالخصوص عیسائی یہ سمجھ رہے تھے کہ سیاسی زوال کے ساتھ ہی مسلمانوں کے مذہب کا بھی خاتمہ ہو جائے گا۔ دنیا کے عیسائی مشنریوں نے مسلمانوں کے متعلق خاص زور دینا شروع کیا۔ لکھنؤ۔ قاہرہ وغیرہ میں بین الاقوامی کانفرنسیں منعقد کیں۔ مُسلمانوں کو عیسائی بنانے کا کام نہایت منظم طریقے سے ہاتھ میں لیا۔ ڈاکٹر زویمر نے "اسلام کی بربادی" (Disintegration of Islam) کے نام سے ایک طویل کتاب تصنیف کی۔ اس میں اسلام کے سیاسی انحطاط کا حال لکھا۔ اور اس کے روحانی مستقبل کی تاریک تصویر کھینچ کر یہ رائے ظاہر کی کہ اب یہ مذہب صرف چند سال کا مہمان ہے۔ یہ رائے صرف مشنریوں ہی کی نہ تھی۔ بلکہ کئی انگریز مدبر مثلاً لارڈ کرومر۔ سر ولیم میور وغیرہ بھی اس خیال کا اظہار کر چکے تھے۔ اور عیسائی دنیا بالعموم انہی خیالوں میں مست تھی۔ کہ یکایک لوگوں نے ۱۶ر نومبر ۱۹۱۳ء کے اخبارات میں لارڈ ہیڈلے کے قبولِ اسلام کی خبر پڑھی۔ اس خبر نے تمام عیسائی دُنیا بالخصوص انگلستان اور برٹش ایمپائر کو چونکا دیا۔ اب ان لوگوں کو پتہ چلا کہ مسلمان نہ صرف اپنے ممالک میں قابلیت اور جرأت کے ساتھ مشنریوں کا مقابلہ کر رہے ہیں۔ بلکہ اُنہوں نے مشنریوں کے اپنے گھر میں اور خاصکر انگلستان میں جو مذہبی جوش اور وضع داری کا سرچشمہ سمجھا جاتا ہے۔ اسلامی مشن قائم کر کے اشاعتِ اسلام کے کام میں وہ نمایاں کامیابی حاصل کی ہے۔ جو عیسائی مشنریوں کو اِس قدر ساز و سامان۔ مالی مدد۔ علمیت اور دوسری سہولتوں کے باوجود اسلامی ممالک میں

حاصل نہ ہوسکی +

خواجہ کمال الدین صاحبؒ مولانا ظفر علی خان کے ساتھ انگلستان تشریف لے گئے تھے۔ انگریزی رسالہ جو اُنہوں نے "مسلم انڈیا اینڈ اسلامک ریویو" کے نام سے شائع کیا۔ اور اب "اسلامک ریویو" کے نام سے جاری ہے۔ سیاسی اور مذہبی معاملات میں اسلامی ہندوستان کی ترجمانی کرتا تھا۔ لیکن آہستہ آہستہ خواجہ صاحب نے یہ اندازہ لگا لیا۔ کہ تبلیغی کام بذاتِ خود اتنا اہم ہے۔ کہ اگر اسی کے لئے زندگی وقف کر دی جائے۔ اور سیاسی مسائل کو تبلیغی کوشش کے ساتھ ساتھ جاری رکھ کر تبلیغ کے راستے میں رکاوٹیں نہ پیدا کی جائیں۔ تو یہ بھی اسلام اور ہندوستانی مسلمانوں کی بڑی خدمت ہوگی۔ چنانچہ اُنہوں نے اس کام پر زیادہ توجہ دینی شروع کی۔ اس کے علاوہ اُنہوں نے دیکھا۔ کہ مغرب میں مبلّغ اسلام کا صرف یہی کام نہیں۔ کہ وہ غیر مسلموں کو مسلمان کرے۔ بلکہ مغرب میں مسلمانوں کے متعلق جو غلط فہمیاں صدیوں کے پروپاگنڈے سے راسخ ہو گئی ہیں۔ انہیں دُور کرنا اس سے بھی زیادہ ضروری ہے[1]+

---

[1] انگلستان اور دوسرے مغربی ممالک میں اسلام کے متعلق جو غلط فہمیاں ہیں۔ ان کا اندازہ ہندوستان میں بیٹھ کر لگانا بہت مشکل ہے۔ قیامِ انگلستان کے دوران میں میرے ایک دوست نے جو اب صوبۂ بہار میں ایک معزز عہدے پر مامور ہیں۔ کالج چیپلن کے ایما پر چند طلبا کے سامنے اسلام پر لیکچر دیا۔ اس کے بعد حاضرین میں بے تکلفانہ بات چیت ہوئی۔ اس دوران میں جب لیکچرار نے حضرتِ عیسٰیؑ کے متعلق اسلامی عقائد کا اظہار کیا۔ تو انگریز طلبا نے ان عقائد کے ساتھ کم و بیش اتفاق کیا۔ لیکن لیکچرار سے پُوچھا۔ کہ "حضرت عیسٰے (علیہ السلام) تو انسان سہی۔ لیکن تم اپنے پیغمبرؐ کو کیوں خدا مانتے ہو؟" (نعوذ باللہ)۔ اور جب اُنہوں نے اس خیال کو خلافِ اسلام ظاہر کیا۔ تو وہ بہت حیران ہوئے۔ یہ واقعہ آکسفورڈ کا ہے۔ جہاں لوگوں کی معلومات کافی وسیع ہوتی ہیں!

خواجہ کمال الدینؒ نے ۱۹۱۳ء میں آل انڈیا مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس کے لئے جو پیغام بھیجا۔ اس میں اُنہوں نے مسلمانوں سے کہا۔ "ممکن ہے ترکی کے موجودہ مصائب (جنگِ بلقان) کا خاتمہ ہو جائے۔ لیکن دنیا میں تمہاری ہستی بطور قوم کے برقرار رکھنے کے لئے ضروری ہے۔ کہ تمہارے متعلق جو غلط فہمیاں یہاں پھیلائی جاتی ہیں۔ ان کو دُور کیا جائے" چنانچہ ووکنگ مشن کا دوسرا اہم کام ان غلط فہمیوں کی تردید ہے۔ جو اسلام کے متعلق مغربی ممالک میں پھیلائی جاتی ہیں۔

احمدیہ مشن کے قیام کے لئے ایک مسجد کی ضرورت تھی۔ انگلستان میں مکانات کی قیمت بہت زیادہ ہوتی ہے۔ لیکن خوش قسمتی سے خواجہ صاحب کو بہت خرچ کئے بغیر ووکنگ میں لندن سے کچھ دُور ایک مسجد موجود مل گئی۔ جو اُن کے مشن کا ہیڈ کوارٹر ہوئی۔ یہ مسجد ڈاکٹر لائٹنر (Leitner) نے بنوائی تھی۔ جو اورنیٹل کالج لاہور کے پرنسپل تھے۔ ڈاکٹر لائٹنر نے ۱۸۷۵ء میں سر ولیم میور کے اعتراضات کا جواب دیتے ہوئے اسلام کے متعلق منصفانہ اور ہمدردانہ لیکچر دئے تھے۔ اور مسلمانانِ ہند کے نظامِ تعلیم پر ایک نہایت فاضلانہ کتاب لکھی۔ جب وہ ترکِ ملازمت کے بعد انگلستان گئے۔ تو وہاں اُنہوں نے ووکنگ میں ایک انسٹی ٹیوٹ کھولا۔ جس میں ہندوستانی طلبا کی رہائش کا انتظام کیا۔ طلبا کی مذہبی سہولت کا خیال کر کے اُنہوں نے ہندوؤں کے لئے ایک مندر اور مسلمانوں کے لئے ایک مسجد بنوائی۔ جب ڈاکٹر لائٹنر فوت ہو گئے۔ اور یہ سلسلہ درہم برہم ہؤا۔ تو اُن کے ورثا نے مندر کو تو آپس میں تقسیم کر لیا۔ لیکن مسجد پر ابھی اُنہوں نے قبضہ نہیں کیا تھا۔ کہ خواجہ صاحب انگلستان جا پہنچے۔ اُنہوں نے اِس بات پر اصرار کیا کہ مسجد جو ایک دفعہ وقف ہو جائے۔ پھر شخصی ملکیت نہیں ہو سکتی۔ اور ہمیشہ کے لئے مسجد رہتی ہے۔ مرزا سر عبّاس علی بیگ نے جو وہاں انڈیا کونسل کے ممبر تھے۔ اور سید امیر علی نے خواجہ صاحب کی بڑی مدد کی اور (غالباً عدالت سے) اُن کے

حق میں فیصلہ ہوگیا۔ چنانچہ یہی مسجد ووکنگ مشن کا مرکز ہے۔ یہاں عیدین کی نماز کے لئے سارے انگلستان سے مسلمان طلبا اور نومسلم انگریز جمع ہوجاتے ہیں اور اخوتِ اسلامی اور اسلامی روحانیت کا ایک روح افروز مظاہرہ ہوجاتا ہے۔ اس مسجد کا انتظام اب ایک ٹرسٹ کے ہاتھ میں ہے۔ اور خواجہ صاحب کی وفات کے بعد ایک اور صاحب امام مسجد ہیں*

خواجہ صاحب کی وفات سے مشن کو بڑا نقصان پہنچا ہے۔ مشن کی کامیابی کی بڑی وجہ خواجہ صاحب کی وجیہ شخصیت۔ علمی قابلیت۔ مذہبی جوش اور اخلاقی جرأت تھی۔ تاہم مشن کا کام خواجہ صاحب کے وضع کئے ہوئے اصولوں پر چل رہا ہے۔ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ ووکنگ مشن ایک اہم اسلامی ضرورت کو پورا کرتا ہے۔ لارڈ ہیڈلے مرحوم۔ سر آرچی بالڈ ہملٹن۔ سر ہیوبرٹ رینکن۔ مسٹر ولیم بشیر پکرڈ بی۔ اے (کینٹب) مسٹر سعید فیلکس ویلائی۔ مسٹر حبیب اللہ لوگرو وغیرہ جن لوگوں نے مشن کی تبلیغ سے متاثر ہو کر اسلام قبول کیا ہے۔ ممتاز اور قابلِ قدر ہستیاں ہیں۔ اور اسلام یہ دعوےٰ کرسکتا ہے کہ اگر مشنریوں نے غریب یا ان پڑھ مسلمانوں میں سے دو چار کو بپتسمہ دے لیا ہے۔ تو اس کے مقابلے میں کئی معزز۔ تعلیم یافتہ اور قابل عیسائیوں نے اسلام قبول کیا ہے*

لیکن مشن کے کام کا اندازہ فقط اِن افراد کے اعداد و شمار سے نہیں ہوسکتا۔ جنہوں نے اسلام قبول کیا ہے۔ مشن کا ایک اہم کام اسلام اور مسلمانوں کے متعلق غلط فہمیاں دُور کرنا ہے۔ اس کے علاوہ انگلستان میں ایک مذہبی اور روحانی مرکز قائم کرکے مشن نے اُن سینکڑوں مسلمان طلبا کو جو حصولِ تعلیم کے لئے انگلستان جاتے ہیں۔ مسیحی اثرات سے متاثر ہونے سے بچالیا ہے۔ مُسلمان طلبا جمعہ کی نماز کے لئے یا کم از کم عید کے موقعے پر اکٹھے ہوجاتے ہیں۔ اور مذہبی جوش تازہ کرلیتے ہیں۔ اگر کسی مسلمان طالب علم کے سامنے کوئی عیسائی طالب علم یا مشنری اسلام پر اعتراض کرتا ہے۔ تو وہ امام مسجد ووکنگ سے ان اعتراضات کے جواب منگاکر تشفی کرسکتا ہے۔ امام صاحب جابجا مُسلم طلبا

میں لیکچر بھی دیتے رہتے ہیں۔ اور اس طرح مسلمان طالب علم اگرچہ غیر مسلموں میں گھرا ہُوا ہوتا ہے لیکن وہ خالص اسلامی اور مذہبی فضا سے دُور نہیں رہتا۔ مشن کے فائدے کا اندازہ اُسی وقت ہوتا ہے۔ جب ہم ووکنگ میں نمازِ عید کا نظارہ دیکھیں۔ جہاں قریباً سارے انگلستان کے مسلمان طلبا کھنچ کر آجاتے ہیں۔ اور پھر اُن کا مقابلہ لائڈن یونیورسٹی کے اُن جاوی مسلمانوں سے کریں۔ جو ہزاروں کی تعداد میں بغرضِ تعلیم ہالینڈ جاتے ہیں۔ لیکن کوئی مذہبی مرکز نہ ہونے کی وجہ سے مذہب سے بیگانہ اور آزاد ہو جاتے ہیں۔

جن انگریزوں نے ووکنگ مشن کی کوششوں سے اسلام قبول کیا ہے۔ اُن کی تعداد پہلے چند سال میں بہت نہیں بڑھی۔ لیکن ظاہر ہے۔ کہ ہتھیلی پر سرسوں نہیں جمائی جا سکتی۔ اور اس کے علاوہ یہ بھی صحیح ہے کہ جب تک اسلام کے قابل ترین اور بہترین فرزند کلرکیوں اور معمولی ملازمتوں پر مرتے رہیں گے۔ اور اپنے آپ کو تبلیغ کے لئے وقف نہ کریں گے۔ کسی نمایاں کامیابی کی توقع بے کار ہے۔ لیکن سب حالات کو دیکھتے ہوئے ووکنگ مشن کا کام تسلّی بخش معلوم ہوتا ہے۔ ایک فائدہ تو مذہبی ہے۔ کہ اتنے لوگ راہِ راست پر آئے۔ اور دوسرا فائدہ اخلاقی ہے۔ یعنی اُن لوگوں کے قبولِ اسلام نے ساری دنیا میں مسلمانوں کے حوصلے بڑھا دئے ہیں۔ اور اُن کا کام آسان کر دیا ہے۔ افریقہ کا ایک حبشی جب لارڈ ہیڈلے کی تصویر جامۂ احرام پہنے دیکھتا ہے۔ تو اُس کے دل میں اسلام کی قدر و منزلت بڑھ جاتی ہے۔ اور وہ عیسائی مشنریوں سے مرعُوب نہیں ہوتا۔ بلکہ مشنری سے ایسے سوالات کرنے لگتا ہے جن کا جواب آسان نہیں۔ ووکنگ مشن کا ایک اور فائدہ یہ ہُوا ہے۔ کہ اُس نے دوسرے مُلکوں کے مسلمانوں سے ہندوستانی مسلمانوں کا واسطہ پیدا کر دیا ہے۔ اور وہ بھی ایسے مقصد کے لئے جس پر کوئی گورنمنٹ مُعترض نہیں ہو سکتی۔ ووکنگ مسجد میں عیدین کی نماز کے لئے یا دوسرے اجتماعی موقعوں پر صرف ہندوستانی مسلمان ہی یکجا نہیں ہوتے۔ بلکہ مصر۔ فلسطین اور دوسرے ممالک کے مسلمان بھی

آجاتے ہیں۔ اور ایک دوسرے کے مسائل سے واقف ہو جاتے ہیں +

اب عیسائی مشنری بھی عام طور پر تسلیم کر رہے ہیں۔ کہ اُن کے کام میں سب سے بڑی رکاوٹ ہندوستانی مسلمان بالخصوص لاہور کے احمدی ہیں۔ اور اس میں کوئی شک نہیں۔ کہ ہندوستان کے مسلمانوں نے اشاعتِ اسلام میں اور اسلام کے متعلق اعتراضات کا جواب دینے میں دنیا بھر کے مسلمانوں سے بڑھ کر کام کیا ہے۔ آج قدیم علماء بھی اس فرض کا احساس کر رہے ہیں۔ جامعہ اسلامیہ ڈابھیل جیسے مولینا شبیّر احمد صاحب عثمانی کی سرپرستی حاصل ہے۔ اس مسئلے پر خاص طور سے توجّہ کر رہی ہے۔ اور مبلّغوں کی ایک کلاس کھولنے کا ارادہ کر رہی ہے۔ لیکن ظاہر ہے۔ کہ اس کام میں اوّلیت کا فخر خواجہ کمال الدین ہی کو حاصل ہے۔ اور ہندوستان کیا۔ تمام عالمِ اسلام کی مذہبی اور روحانی تاریخ میں ان کا نام یادگار رہے گا!

ندوۃ العلماءؔ جدید علم الکلام بالعموم ان شخصوں نے ترتیب دیا۔ جو عربی اور فارسی کے فاضل تھے۔ لیکن عام علما کی جماعت سے انہیں کوئی تعلق نہ تھا۔ اور بالعموم عام علما نے ان کی مخالفت کی۔ مگر آہستہ آہستہ کچھ لوگ ایسے پیدا ہو گئے۔ جنہوں نے اس امر کا احساس کرنا شروع کیا۔ کہ اسلامی مدارس کا نصاب ضروریاتِ زمانہ کے مطابق بنایا جائے۔ اور قدیم علما اور علیگڑھ پارٹی کے بَین بَین ایک تعلیمی اور مذہبی طریقۂ کار تجویز دیا جائے۔ چنانچہ اس مقصد کے لئے ۱۸۹۴ء میں ندوۃ العلما لکھنؤ میں قائم ہُوا۔ اس کے مقاصد حسبِ ذیل تھے :۔

۱۔ نصابِ تعلیم کی اصلاح۔ علومِ دین کی ترقی۔ تہذیبِ اخلاق اور شائستگیٔ اطوار

۲۔ علماء کے باہمی نزاع کا رفع اور اختلافی مسائل کے ردّ و کد کا پورا انسداد

۳۔ عام مسلمانوں کی صلاح و فلاح اور اس کی تدابیر مگر سیاسی اور مُلکی معاملات سے علیحدہ

۴۔ ایک عظیم الشان اسلامی دار العلوم کا قیام جس میں علوم و فنون کے علاوہ عملی صنائع

کی بھی تعلیم ہو۔

۵۔ دینی علوم میں فتوے دینے کے واسطے محکمۂ افتا کا ہونا جس میں بڑے بڑے عالم اور مفتی ہونگے

اس نیک خیال کے محرک مولوی عبدالغفور صاحب ڈپٹی کلکٹر تھے۔ مگر اس کی تکمیل مولوی سید محمد علی صاحب کانپوری خلیفۂ حضرت مولانا فضل الرحمٰن صاحب مراد آبادی کے مبارک ہاتھوں سے ہوئی۔ جو اس کے بانی اور ناظم اوّل تھے۔ مولانا شبلی اور مولوی عبدالحق دہلوی "صاحب تفسیرِ حقانی" نے اس کے قواعد و ضوابط مرتب کئے۔ اکابر قوم مثلاً سر سید۔ نواب محسن الملک اور نواب وقار الملک وغیرہ نے بھی اس کے اغراض و مقاصد کو پسند کیا۔ اور تحریر و تقریر سے اس کا خیر مقدم کیا۔ ۱۸۹۸ء میں دارالعلوم کے کچھ ابتدائی درجے کھولے گئے اور ۱۸۹۹ء میں رؤساءِ شاہجہان پور کی فیاضی سے کچھ زمینداری بطور وقف ندوۃ العلما کو حاصل ہوئی۔ ایک عظیم الشان کتب خانے کی بنیاد بھی ڈالی گئی۔ لیکن اسی زمانے میں ندوہ پر دو طرفوں سے حملے شروع ہوئے۔ ایک تو سر اینٹونی میکڈانل جنہوں نے بہار میں اُردو کا قلع قمع کیا تھا۔ اب صوبجاتِ متحدہ کے گورنر تھے۔ وہ ندوہ کے سخت مخالف ہو گئے اور اس کو سیاسی سازشوں کا ایک آلہ کار سمجھ کر شک سے دیکھنے لگے۔ دوسرے مولوی سید احمد رضا خان بریلوی نے بعض پُر جوش رسائل ندوہ کے خلاف لکھنے شروع کئے۔ اور ندوہ کے مقابلے میں ایک جنگجو جماعت جدوہ قائم کی گئی۔ ندوہ ان دو مخالفوں کے درمیان موت اور زندگی کی کشمکش میں تھا۔ کہ مولانا شبلی حیدر آباد کی ملازمت ترک کر کے ستمبر ۱۹۰۴ء میں لکھنؤ آئے۔ اُنہوں نے کرنیل عبدالحمید کی مدد سے ندوہ کے متعلق حکام کی غلط فہمیاں دُور کیں اور اپنے اثر و رسوخ سے قوم کا اعتماد حاصل کیا۔ مالی حالت بہت خراب ہو گئی تھی۔ اسے درست کیا۔ ہز ہائی نس آغا خان اور بہاولپور و بھوپال کے والیانِ ریاست سے سالانہ عطیئے حاصل کئے۔ گورنمنٹ سے ایک وسیع قطعۂ اراضی دارالعلوم کے لئے لیا۔ معقول گرانٹ بھی حاصل کی۔ چنانچہ ۲۸ر نومبر ۱۹۰۸ء کو سر جان ہیوٹ لیفٹیننٹ گورنر ممالک متحدہ نے

دار العلوم کا سنگِ بنیاد رکھا - اس طرح ندوہ کے ابتدائی مراحل بخوبی طے ہو گئے +
لیکن بدقسمتی سے مولانا شبلی جو ندوہ کے دار العلوم کے معتمد تھے اور ندوہ کے دوسرے اراکین کے درمیان سخت اختلافات رونما ہو گئے - بیشتر اختلافات تو ذاتی تھے - اور شبلی کے خطوط میں اُن قضیوں کا ذکر پڑھ کر جن کی وجہ سے ندوہ پوری طرح کامیاب نہ ہُوا - طبیعت کو بہت خلجان ہوتا ہے - ہر چھوٹی سے چھوٹی بات پر جھگڑا ہوتا تھا - نصاب کا مسئلہ ہو یا انگریزی جاری کرنے کا - ناظم اور نائب ناظم اور مدرسین اور معتمد سب ایک دوسرے کے خلاف صحیح یا غلط افواہیں پھیلاتے رہتے تھے - مولٰینا جو اصلاحیں کرنا چاہتے تھے - اُن کے رفقا اُن کی ضرورت ہی نہ سمجھتے تھے - اس کے علاوہ مولانا شبلی کہتے تھے کہ " منشی احتشام علی صاحب اور مولوی خلیل الرحمٰن صاحب بلکہ مولوی عبد الحی صاحب کو کسی قدر یقین ہے - کہ مَیں ان لوگوں کے اختیارات میں دست اندازی کرتا ہوں - اور اُن کے کرنے کا کام خود کرتا ہوں - اس طرح وہ نمایاں نہیں ہوتے " - لیکن مولانا شبلی کہتے تھے - کہ یہ خیال غلط ہے - اور وہ اپنے خیالات سے تجاوز نہیں کرتے اُدھر مولانا کے مخالف اُن کی نسبت بدعقیدہ ہونے کے شبہات پھیلاتے - اور ان کی تنگ دلی اور تنگ مزاجی کے شکوے کرتے +

مولانا شبلی اور اُن کے رفقا کے اختلافات ۱۹۱۰ء ہی میں بہت نمایاں ہو گئے تھے - اور اس زمانے میں بعض اراکین نے تحریک شروع کی - کہ ندوہ کے اکثر طلبا مذہبی امور میں مولٰینا شبلی کی وجہ سے غافل ہیں - اور چاہئے کہ ایک کمیشن اس معاملے کی تحقیقات کرے - مولٰینا شبلی نے اس کی مخالفت کی اور یہ تحریک کامیاب نہ ہوئی - لیکن باہمی اختلافات بدستور رہے - اور جب ۱۹۱۳ء میں مولٰینا نے مولوی عبد الکریم مدرس ندوۃ العلما کو جہاد پر ایک مضمون لکھنے کی پاداش میں معطّل کر دیا - تو اُن کے مخالفین کو موقع مِلا - مولٰینا نے یہ فعل غالباً محض ندوہ کو عتابِ حکومت سے بچانے کے لئے کیا تھا - لیکن مولٰینا کے مُعترضین نے ان پر قسم قسم کے الزامات لگانے شروع کئے - اور اسلامی اخبارات (مثلاً مُسلم گزٹ) میں بھی ان پر اس زور

سے تنقید ہوئی کہ وہ گھبرا گئے ۔ اور بالآخر جولائی ۱۹۱۳ء میں ندوہ سے علیحدہ ہو گئے ۔ ندوہ اس کے بعد دوسرے اراکین کی مدد سے چلتا رہا ۔ اور اگرچہ اُسے اب وہ شہرت اور عظمت حاصل نہیں ۔ جو شبلی کے زمانے میں تھی ۔ اور اب اس کی مالی حالت بھی بہت خراب ہے ۔ لیکن بہرکیف یہ ابھی قائم ہے ۔ اور کسی حد تک اپنے مقاصد کی تکمیل کئے جا رہا ہے +

ندوۃ العلما کا تجربہ بعض لحاظ سے مسلمانانِ ہند کی زندگی میں بڑا اہم تھا ۔ لیکن یہ تجربہ پوری طرح کامیاب نہیں ہوا ۔ اس کی وجہ اس کے مقاصد کی دشواری یا قوم کی بے توجہی نہیں بلکہ شخصی نفاق اور اتفاقی حوادث ۔ مولانا شبلی کے سوا ندوہ کو کوئی ایسی مشہور ہستی نہیں ملی ۔ جو ندوہ کی وقعت اور قدر قوم کی نظر میں بڑھا سکتی ۔ لیکن بدقسمتی سے مولانا کی شرکت کی وجہ سے ندوہ کو دوامی فائدہ نہیں پہنچا ۔ اُن کے زمانۂ معتمدی میں ندوہ کی ٹیپ ٹاپ میں بڑا اضافہ ہوا ۔ لیکن اندرونی خرابیاں بدستور باقی رہیں ۔ اُن کی ناکامیابی نے قوم کے اکثر حلقوں میں ندوہ کی طرف سے شبہات پیدا کر دئے ۔ اور مولانا شبلی اور دوسرے کارکنوں کے باہمی جھگڑوں کی وجہ سے قوم کا دل ندوہ سے پھر گیا +

لیکن ان افسوس ناک جھگڑوں کے باوجود یہ نہیں کہا جا سکتا کہ ندوہ نے کوئی کام نہیں کیا ۔ بلاشبہ ندوہ کے ابتدائی وعدے پورے نہیں ہوئے ۔ لیکن علی گڑھ نے جو وعدے کئے تھے ۔ وہ سب کہاں پورے ہوئے ہیں ۔ اور حقیقتاً کسی ادارہ کی کامیابی کا اندازہ اس سے نہیں ہو سکتا کہ اُس کے سب مواعید پورے ہوئے ہیں یا نہیں ۔ بلکہ جس طرح درخت اپنے پھل سے پہچانا جا سکتا ہے اسی طرح ایک ادارے کے پرکھنے کی کسوٹی فقط یہی ہے کہ اُس نے عملی کام کیا کیا ۔ اور اس بارے میں ندوۃ العلما کا ماضی بالخصوص اس عہدِ زریں کی تاریخ جب شبلی وہاں مقیم تھے ۔ غیر تسلی بخش نہیں +

ندوہ کو دو سرچشموں سے فیض حاصل ہوا تھا ۔ ایک شبلی کے ذریعے علی گڑھ سے ۔ دوسرے مصر سے ۔ شبلی نے قیامِ علی گڑھ میں مغربی درس و تدریس اور جدید علوم کے

اصولوں اور مستشرقین کی کتابوں سے جو واقفیت حاصل کی تھی۔ اُس کا فیض ان کے ذریعے سے ان کے مخصوص تلامذہ اور ندوہ کے عام طلبا تک پہنچا۔ اس کے علاوہ سرسید نے مغربی مصنفوں اور مورخوں کے اعتراضات کا جواب دینے کا جو طریقہ "خطباتِ احمدیہ" سے شروع کیا تھا۔ اُسے شبلی نے اخذ کیا۔[1] اور چونکہ قومی حمیت وخودداری اور علم وفضل کی ان میں بھی کوئی کمی نہ تھی۔ اس لئے اُنہوں نے اِس بارے میں خاص امتیاز حاصل کیا۔ اور آج ندوہ کے ممتاز ارا کین اس نیک علمی خدمت کو جاری رکھ رہے ہیں۔ علی گڑھ کے اثرات کے علاوہ دوسرا اہم اثر ندوہ پر مصر کا پڑا ہے۔ مصر چونکہ یورپ سے زیادہ قریب ہے۔ اور ایک لحاظ سے اسلامی دُنیا کا ذہنی مرکز ہے۔ اس لئے وہاں کے رسائل میں موجودہ علمی ترقیوں پر زیادہ بحث ہوتی ہے۔ مولینا شبلی کو ملازمت علی گڑھ کے دوران ہی میں مصر جانے اور وہاں کے اہلِ علم سے روابط قائم کرنے کا موقع ملا تھا۔ اور غالباً یہ شبلی ہی کا اثر تھا۔ کہ ہندوستان کے دوسرے علمی مرکزوں کی بہ نسبت ندوہ نے مصر سے زیادہ فیض حاصل کیا ہے +

ندوہ نے ان دونوں سرچشموں سے فیض حاصل کرکے ایسے علما پیدا کئے ہیں۔ جن کی نظر رفتارِ زمانہ پر رہتی ہے۔ اور جو ایک خاص اسلوب کے ماتحت قوم کی علمی ضروریات پُورا کرنا چاہتے ہیں۔ ندوہ کے فارغ التحصیل طلبا میں سب سے قابل سید سلیمان ندوی ہیں۔ جنہیں مُلک کے بہترین علما کے بالمقابل پیش کیا جاسکتا ہے۔ ان کے علاوہ مولینا عبدالسلام

---

[1] اس بارے میں سرسید اور شبلی کے طریقِ کار میں ایک اہم فرق یہ ہے۔ کہ سرسید نے اپنی کوششیں اُردو تک محدود نہیں رکھیں۔ بلکہ انگریزی میں بھی اعتراضات کا جواب دینے اور غلط فہمیاں دُور کرنے کے لئے کتب شائع کرائیں۔ مولینا شبلی اور ان کے رفقا کی کوششیں اُردو تک محدود ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے۔ کہ جن لوگوں کی غلط فہمیاں دُور کرنے کی کوشش ہوتی ہے۔ ان تک تو یہ تصانیف پہنچتی ہی نہیں۔ اس امر کی بڑی ضرورت ہے کہ اسلامی عقائد۔ سیرتِ نبوی اور اسلامی ہندوستان کی تاریخ کے متعلق جو غلط فہمیاں غیر مسلموں میں عام ہیں۔ ان کی اصلاح کے لئے انگریزی میں بلند پایہ علمی کتابیں لکھی جائیں۔ اُردو کتب سے فقط ہندوستانی مسلمانوں کی اپنی تسکین ہوجاتی ہے اور بس۔

سید نجیب اشرف اور مولوی ابوظفر ایسی ہستیاں ہیں ۔ جن پر ندوہ بجا طور پر فخر کرسکتا ہے ۔ اُردو زبان کا بہترین اسلامی رسالہ "معارف" ندوہ ہی کے سابق طلبا چلا رہے ہیں ۔ "الہلال" کا اسٹاف ندویوں سے بھرا ہُوا تھا ۔ اور کئی لحاظ سے "الہلال" کو ندوہ کا آرگن سمجھنا چاہیئے ؛ مولانا ابوالکلام آزاد خود دیر تک ندوہ میں مقیم رہے ۔ اور مستفید ہوئے ۔ "دارالمصنفین" آج قدیم اسلامی علوم کی اشاعت کا اہم مرکز ہے ۔ اس کے علاوہ "الندوہ" جو مولینا شبلی ۔ مولینا حبیب الرحمٰن خاں شروانی اور مولانا ابوالکلام آزاد کی ادارت میں مرتب ہوتا رہا ۔ ایک بلند پایہ رسالہ تھا ۔ اور اُس نے علمی سطح کو ضرور بلند کیا ہے ۔

یہ صحیح ہے ۔ کہ ندوہ فقط توسیعِ علم اور ترقی و اصلاح ہی کا مرکز نہ رہا بلکہ علی گڑھ کی مخالفت میں ردِ عمل کا مرکز بھی بن گیا ۔ اور اربابِ ندوہ کی بعض تحریروں سے خیال ہوتا ہے ۔ کہ وہ علم وفن کو ایک معین سطح سے بالا اور ایک خاص اسلوب سے باہر لے جانے سے قاصر ہیں ۔ ندوہ کے یہ رجحانات قوم اور علم وفن کے لئے مضر ثابت ہوئے ہیں ۔ اور اُنھوں نے خود اربابِ ندوہ کی علمی ترقی کو ایک حد سے آگے بڑھنے نہیں دیا ۔ اس مسئلے پر ہم آیندہ صفحات میں اپنے خیالات کا اظہار کریں گے ۔ لیکن جو حضرات اربابِ ندوہ کی اس روش کو مستحسن نہیں سمجھتے ۔ انھیں یہ نہیں بھولنا چاہیئے ۔ کہ ان رجحانات کے باوجود اربابِ ندوہ نے جو علمی سطح برقرار رکھی ہے ۔ وہ قوم کی عام علمی سطح سے بہت بلند اور ارفع ہے !

ردِّعمل

ردِّ عمل

دیوبند ابھی تک ہم نے جن حضرات کا ذکر کیا ہے۔ اُن میں سے اکثر وہی تھے۔ جو مغربی علوم اور تعلیم سے متاثر ہوئے۔ اور جنہوں نے ضروریاتِ زمانہ کے لحاظ سے اسلام کی مروجہ صورت یا طریقۂ تعلیم میں کچھ تبدیلیاں اختیار کیں۔ لیکن ان کے علاوہ دوسرے بزرگ ایسے بھی تھے۔ جو مغرب کے طوفان سے متاثر نہ ہوئے۔ یا ہوئے تو اتنے کہ انہوں نے اسلامی عقائد اور قدیم اسلامی علوم کو زیادہ محکم پکڑ لیا۔ ان بزرگوں میں تھانہ بھون کے حاجی امداد اللہؒ خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ آپ علومِ ظاہری و باطنی میں کامل تھے۔ آپ کے مرشد میاں جیو شاہ جھنجانوی مولینا سیّد احمد بریلوی کے خلفا میں سے تھے۔ غدر کے بعد آپ مکّہ معظمہ چلے گئے۔ لیکن آپ کا فیض وہاں بھی برابر جاری رہا۔ آپ کئی کتابوں کے مصنف تھے۔ مثلاً "غذائے رُوح"۔ "ضیاء القلوب"۔ "تحفتہ العشّاق" وغیرہ۔ حرم شریف میں مثنوی مولینا روم کا درس دیا کرتے تھے۔ آپ کی نمایاں خصوصیتیں دو تھیں۔ ایک تو لائق سمجھ دار اور قابلِ اعتماد بزرگوں کی تربیت۔ جو ملک میں علوم اسلام کی اشاعت کا کام جاری رکھ سکتے تھے۔ اور نئے حملہ آوروں کے مقابلے میں ڈھال بن سکتے تھے۔ دوسرے عام مسلمانوں میں نزاع کا اختتام۔ تاکہ وہ غیر مسلمین یا فاسد عقائد والے مسلمانوں کے مقابلے میں متحد رہ سکیں۔ پہلی خصوصیت کا نتیجہ مولینا رشید احمد گنگوہی اور مولوی محمد قاسم نانوتوی کی تربیت تھی۔ جن کے متعلق آپ نے اپنی ایک کتاب کے اخیر میں لکھا ہے۔ "ہرکس کہ ازیں فقیر محبت وعقیدت دارد۔ مولوی رشید احمد و مولوی محمد قاسم را کہ جامع جمیع کمالات علوم ظاہری و باطنی اند۔ بجائے من فقیر بلکہ بمدارج فوق ازمن شمارند" دوسری خصوصیت کا اظہار ان کی

تصانیف میں ہے۔ مثلاً وہ "فیصلۂ ہفت مسائل" میں لکھتے ہیں "یہ امر مسلّمات سے ہے۔ کہ باہمی اتفاق باعث برکات دینی و دنیوی اور نااتفاقی موجب مضرت دینی و دنیوی ہے۔ اور آج کل بعض مسائل نزاعیہ میں ایسا اختلاف واقع ہؤا ہے۔ جس سے خواص کا وقت اور عوام کا دین ضائع ہو رہا ہے۔ حالانکہ اکثر امور میں محض نزاعِ لفظی ہے اور مقصود متحد" چنانچہ انہوں نے سات اختلافی مسائل (مولود شریف۔ فاتحہ۔ عرس و سماع۔ ندا بہ غیر اللہ۔ جماعتِ عثمانیہ۔ امکان نظیر۔ امکان کذب) کے متعلق جو گذشتہ صدی سے مسلمان علما کو بلا وجہ پریشان کر رہے ہیں۔ ایک مختصر سا رسالہ لکھا۔ جس میں ہر فریق کے نقطۂ نظر کو سمجھ کر ہر امر کے متعلق نہایت منصفانہ فیصلے دئے۔ یہ صحیح ہے۔ کہ بعض ظاہر بین اور "پوست از مغز نشناس" علما نے ان سب فیصلوں کو تسلیم نہ کیا۔ لیکن مولٰینا کی رفعِ نزاع کی یہ کوششیں اس مختصر رسالے سے بھی پوری طرح واضح ہیں۔ وہ عالم بھی تھے اور مثنوی مولٰینا روم کے بھی بڑے مداح تھے۔ بات کی تہ کو پہنچ جاتے۔ اور ظاہری اختلاف کم کرنے کی کوشش کرتے +

ہم حاجی امداد اللہ صاحب کے دو خلفاءِ نامدار کا ذکر کر چکے ہیں۔ ایک مولٰینا رشید احمد گنگوہیؒ۔ جن کے حالات اور مکاتیب کو مولٰینا عاشق الٰہی میرٹھی نے مرتب کیا ہے۔ دوسرے مولوی محمد قاسم نانوتویؒ۔ مولانا رشید احمد بڑے پائے کے عالم تھے۔ خاموش۔ حلیم۔ خدا رسیدہ۔ ہر کہ و مہ ان کی عزت کرتا۔ وہ حدیث کا درس بھی دیتے تھے۔ اور تعلیم باطنی بھی۔ چنانچہ مولٰینا انور شاہ محدثؒ نے یہ دونوں باتیں ان سے حاصل کیں۔ وہ نسبتاً خاموش کارکن تھے۔ لیکن خواص کی آنکھوں کا نور! انہیں مولٰینا محمد قاسم نانوتویؒ کی سی شہرت عامہ نصیب نہیں ہوئی۔ مولٰینا محمد قاسم صاحب ۱۲۴۸ھ میں پیدا ہوئے۔ حدیث شاہ عبد الغنی صاحب سے پڑھی۔ مولٰینا رشید احمد کے ہم سبق تھے۔ اور انہیں کے ساتھ حاجی امداد اللہ صاحب سے بیعت کی تھی۔ اور سلوک شروع کیا تھا۔ اس کے بعد مولوی صاحب کچھ دیر تک اینگلو عربک سکول میں پڑھتے رہے۔ جہاں مولانا مملوک علی آپ کے اُستاد تھے۔ پھر ترکِ تعلیم کر کے

کچھ دیر تحشیہ اور تصحیح میں مولینا احمد علی محدث سہارنپوری کی مدد کی۔ غدر کے بعد آپ بھی کچھ دیر مکہ معظمہ چلے گئے تھے۔ لیکن پھر واپس آئے اور منشی ممتاز علی کے پریس میں کام شروع کیا۔ ان دنوں دیوبند[1] میں مدرسہ قائم ہُوا۔ آپ وہاں گئے اور مدرسے کی سرپرستی شروع کی۔ عوام میں زیادہ شہرت انہیں مباحثوں اور مناظروں کی وجہ سے ہوئی۔ "ان دنوں پادری جا بجا اسلام کے خلاف تقریریں کر رہے تھے۔ مسلمانوں میں سے بعض بیچارے اپنی ہمت سے ان کا مقابلہ کرتے تھے۔ کوئی اہل علم جس کا یہ کام تھا۔ اس طرف متوجہ نہ ہوتا تھا۔ فقط ایک مولوی منصور علی صاحب دہلوی تھے۔ جنہوں نے عیسائیوں کے ساتھ مناظرے میں امتیاز حاصل کیا تھا۔ انجیل انہیں تقریباً زبانی یاد تھی۔ طرزِ مناظرہ بھی جداگانہ تھا۔ اور کئی شاگرد اُنھوں نے پادریوں کے خلاف وعظ کہنے کے لئے تیار کئے تھے۔" اتفاق سے ۱۲۹۳ھ میں ضلع شاہجہان پور کے ایک تعلقہ دار نے ہندوؤں۔ عیسائیوں اور مسلمانوں کے ایک مباحثے کا انتظام کیا۔ "میلہ خداشناسی" اس کا نام رکھا۔ مولینا محمد قاسم بھی مولوی منصور علی کو لے کر اس میں شریک ہوئے۔ اور ابطالِ تثلیث و شرک و اثباتِ توحید میں گفتگو کی۔ اگلے سال پھر مباحثہ ہُوا۔ ہندوؤں کی طرف سے سوامی دیانند سرسوتی تھے۔ مسلمانوں میں ایک واعظ مولوی محمد علی صاحب تھے۔ جو "بمقابلہ مذہب ہنود" زیادہ مشہور ہیں۔ ان کے بعد مولوی صاحب نے بحث وجود توحید میں زبردست تقریر کی۔ ایک لیکچر رُڑکی میں دیا تھا۔ جو "قبلہ نما" کے نام سے چھپا ہے۔ اس میں پنڈت دیانند سرسوتی کے اعتراضات کا جواب دیا ہے۔ اس کے بعد مولانا کی صحت اکثر خراب رہی۔ اور ۴ جمادی الاوّل ۱۲۹۷ھ کو بمقام دیوبند وفات پا گئے +

---

[1] نانوتہ اور دیوبند ضلع شاہجہان پور میں دو قصبے ہیں۔ دیوبند نارتھ ویسٹرن ریلوے پر ایک اسٹیشن ہے +

دیوبند کا مدرسہ جواب مولانا کے نام پر مدرسۂ قاسم العلوم کہلاتا ہے۔ اس کی ابتدا ۱۵ محرم ۱۲۸۳ھ کو ہوئی۔ اور اس کے اصل محرک مولوی فضل الرحمٰن۔ مولوی ذوالفقار علی اور حاجی محمد علی صاحب تھے۔ پہلے مدرس مُلّا محمد محمود صاحب تھے۔ جو پندرہ روپے کے مشاہرے پر ملازم درس مقرر ہوئے۔ اور دیوبند کی مسجد چھتہ میں تعلیم شروع ہوئی۔

دارالعلوم دیوبند کی ابتدا نہایت معمولی تھی۔ لیکن اللہ کے کرم اور بانیوں کے حسن نیت سے جلد ہی اس نے ترقی شروع کر دی۔ مولانا محمد قاسم نے شروع ہی سے اسے اپنی سرپرستی میں لیا۔ ان کے علاوہ مولانا محمد یعقوب کو اس مدرسے کی توسیع میں بڑا دخل ہے۔ وہ خود ایک جامع العلوم بزرگ تھے۔ ان کے والد مولانا مملوک علی۔ مولانا محمد قاسم۔ مولانا رشید احمد گنگوہی (مولانا محمد محمود الحسن کے والد) مولانا ذوالفقار علی خان اور دوسرے کئی علما کے اُستاد تھے۔ اور اس وجہ سے ان کا حلقۂ اثر بہت وسیع تھا۔ وہ خود اس وقت محکمۂ تعلیم میں ملازم تھے۔ اور ڈپٹی ایجوکیشنل انسپکٹر کے معزز عہدے پر مامور تھے۔ جس سال مدرسے کا آغاز ہوا۔ اسی سال انہوں نے اپنی اعلےٰ ملازمت اور معقول مشاہرے کو قربان کر کے علوم اسلامی کی خدمت کے لئے مدرسۂ دیوبند میں بیس ۲۰ روپے کی مدرسی قبول کر لی۔ وہ دارالعلوم کے پہلے صدر مدرس تھے۔ اور مولانا محمد قاسم کی وفات کے بعد۔ جب مولانا رشید احمد گنگوہ میں تھے۔ تو اس زمانے میں سرپرستی کا کام بھی بیشتر انہیں نے کیا۔

شروع شروع میں درس ایک مسجد میں ہوتا تھا۔ جب طلبا کی کثرت ہوئی۔ تو مسجد قاضی کے قریب ایک مکان کرائے پر لیا گیا۔ ۱۲۹۳ھ میں دارالعلوم کی اپنی عمارت کا سنگِ بُنیاد رکھا گیا۔ جو رفتہ رفتہ بہت ترقی کر گئی۔ آج دارالعلوم کے احاطے میں کئی لاکھ کی عمارتیں کھڑی ہیں۔ دو سو تیئیس ۲۲۳ بڑی بڑی درس گاہیں ہیں۔ آٹھ ہوسٹل ہیں۔ تقریباً چار سو حُجرے ہیں۔ مطالعہ کے لئے ایک عظیم الشان کتب خانہ ہے۔ ۱۳۵۰ھ میں طُلبا کی تعداد ۹۱۵ تھی۔ جن میں سے ۳۶۸ یو۔پی کے۔ ۱۸۵ بنگال کے اور ۱۵۰ صُوبۂ سرحد و پنجاب کے تھے۔

دارالعلوم کی اہمیت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے۔ کہ اس کے طلبا میں سے ۴۶ آسام اور برما کے۔ ۱۷ چینی ترکستان کے۔ ۱۰ بدخشاں کے اور ۲۶ طالب علم بخارا کے تعلیم پا رہے تھے۔ ان کے علاوہ جزائر مالدیپ۔ سیلون۔ رُوسی ترکستان۔ بلوچستان اور ایران کے بھی کئی طلبا شاملِ درس تھے۔ دیوبند سے باہر اطرافِ مُلک میں کئی مدارس ہیں (مثلاً جامعہ ملّیہ نواکھالی۔ مدرسہ قاسم العلوم مرادآباد) جن کے امتحانات اور کارگزاری کی نگرانی دارالعلوم کی طرف سے ہوتی ہے۔ دارالعلوم کے فارغ التحصیل طلبا میں سے جن بزرگوں نے شہرت حاصل کی ہے۔ ان میں مولٰینا محمود الحسن صاحب۔ مولانا اشرف علی تھانوی۔ مولانا عبدالحق صاحب مفسّر تفسیر حقانی۔ مولٰینا عبداللہ صاحب ناظم دینیات علی گڑھ یونیورسٹی۔ مولٰینا سیّد انور شاہ صاحب۔ مولٰینا عبیداللہ سندھی۔ مولٰینا شبیر احمد عثمانی۔ مفتی کفایت اللہ صاحب صدر جمعیت العلماءِ ہند۔ مولٰینا ثناء اللہ امرتسری۔ مولٰینا مظہر الدین صاحب مرحوم اور مولٰینا تاجور نجیب آبادی خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں÷

دارالعلوم کے اعلٰے عہدیدار چار ہیں۔ سرپرست۔ مہتمم۔ صدر مدرّس۔ مفتی۔ اور بالعموم شروع ہی سے دارالعلوم کو ان عہدوں کے لئے نہایت موزوں بزرگ میسّر آئے ہیں۔ پہلے سرپرست مولٰینا محمدؐ قاسم تھے۔ ان کے بعد مولٰینا رشید احمد گنگوہی۔ مولٰینا محمدؐ یعقوب نانوتوی اور مولٰینا محمود الحسن دیوبندی اس ذمہ دارانہ عہدے پر فائز رہے۔ موجودہ سرپرست مولٰینا اشرف علی تھانوی ہیں۔ صدر مدرّس پہلے مولٰینا محمدؐ یعقوب تھے۔ ان کے بعد مولانا سید احمد صاحب۔ مولٰینا محمود الحسن صاحب اور مولٰینا انور شاہ صاحب نے دارالعلوم کو رونق دی۔ آج کل مولٰینا حسین احمد صدر مدرّس ہیں۔ مہتمم اور مفتی بھی دارالعلوم کو قابل اور فرض شناس ملے ہیں۔ دارالافتا کی اہمیت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے۔ کہ ہر سال تقریباً آٹھ ہزار استفتا دارالعلوم میں آتے ہیں÷

دیوبند کا قیام غدر کے بیس۲۰ پچیس۲۵ سال بعد ہُوا۔ لیکن جلد ہی اس نے قوم کے

تعلیمی نظام میں معزز جگہ حاصل کرلی۔ اور غالباً قدیم طرز کی اسلامی درسگاہوں میں یہ سب سے اہم جگہ گنی جاتی ہے۔ اس کی ترقی کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ اس کا بیج اچھا تھا۔ اور اچھے ہاتھوں سے بو یا گیا تھا۔ دیوبند کا مدرسہ حقیقتاً شاہ عبدالعزیزؒ اور شاہ ولی اللہؒ کے درس کی نمایاں خصوصیتوں کا حامل ہے۔ اس میں فرنگی محل کی طرح منطق اور صرف و نحو اور فقہ ہی پر سارا وقت صرف نہیں ہوتا۔ بلکہ حدیث کا بھی خاص خیال رکھا جاتا ہے۔ جو شاہ ولی اللہ اور ان کے جانشینوں کی خصوصیت تھی۔ اس خاندان سے شاہ عبدالغنیؒ نے فیض حاصل کیا تھا۔ اور مولانا محمد قاسم نانوتوی نے ان سے۔ اسی طرح حاجی امداد اللہ صاحب۔ مولٰینا سید احمد بریلوی کے ایک خلیفہ کے مرید تھے۔ اور مولانا سید احمد شاہ عبدالعزیزؒ کے خلیفہ تھے۔ اس طرح دیوبند میں شروع ہی سے شاہ عبدالعزیزؒ اور ان کے تلامذہ کے درس کی خصوصیات تھیں۔ اس کے علاوہ دارالعلوم کو خوش قسمتی سے ایسے اساتذہ ملے۔ جنہوں نے قوم کی نظروں میں ان کا وقار بڑھادیا۔ مثلاً مولٰینا محمود الحسن محدث۔ مولٰینا انور شاہ محدّث اور مولٰینا شبیر احمد عثمانی۔ یہ لوگ زہد و تقویٰ۔ راست گوئی۔ بے ریائی اور بے حرصی میں اسلاف کے بہترین علما و صلحا کا نمونہ تھے۔ خود غرضیوں اور کج بحثیوں سے قطعاً پاک۔ نتیجہ یہ کہ مخالفین بھی ان کی عزت کرتے۔ مولٰینا شبلی سے مولٰینا محمود الحسن کے اختلافات تھے۔ لیکن مولٰینا شبلی ایک خط میں ان کے متعلق لکھتے ہیں۔ "میری نسبت چاہے ان کی جو رائے ہو۔ لیکن وہ کوئی رائے دیانت کے خلاف نہ دیں گے"۔ ایک اور خط میں دیوبند کے متعلق لکھتے ہیں۔ "ارباب دیوبند نہایت زاہد اور متقشف ہیں۔ اس کے ساتھ وسیع النظر بھی نہیں ہیں۔ تاہم چونکہ مخلص ہیں۔ اس لئے شور و شر نہیں مچاتے۔ کوئی پوچھتا ہے تو جو جانتے ہیں۔ بتادیتے ہیں"۔

اس کے علاوہ شروع سے اس مدرسے میں طلبا کی قوتِ تقریر و تحریر ابھارنے کی سعی رہی ہے۔ مولٰینا محمد قاسم نانوتوی بااثر مقرر تھے۔ ان کی مثال اکثر طلبا نے اختیار کی۔ نتیجہ یہ کہ دیوبند کے فارغ التحصیل طلبا اپنی انشا پردازی اور قوتِ تقریر کی وجہ سے قوم پر

اپنا قابو رکھ سکے۔ اور ان میں سے کئی ایسے ہیں۔ جو بطور اخبار نویس یا معلم یا مقرر کے قوم کی کئی ضروریات پُوری کر رہے ہیں ÷

گذشتہ پچاس سال کے حالات دیکھتے ہوئے یہ کہنا قطعاً مبالغہ نہیں۔ کہ دیوبند نے قوم کی بڑی مذہبی اور علمی خدمت کی ہے۔ دیوبند کا نصاب ضروریاتِ زمانہ کے لحاظ سے ناکافی سہی۔ اور علمائے دیوبند کو حالاتِ زمانہ اور مغربی مستشرقین یا دورِ حاضر کے مصری علما کی تصنیفات سے اتنی واقفیت نہ سہی جتنی بعض علمائے ندوۃ العلما کو ہے۔ لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ دیوبند سے سیکڑوں عُلما اور طلبا فارغ التحصیل ہو کر نکلے جنہوں نے مُلک کے کونے کونے میں اسلامی علوم کے چراغ روشن کئے۔ مذہب کی اشاعت کی۔ بدعتوں اور مضرِ اخلاق خرابیوں کی اصلاح کی یہ درست ہے کہ وہ کئی باتوں میں بہت باخبر نہیں۔ لیکن آخر اُن میں تقویٰ۔ پرہیزگاری اور ایمان داری دوسروں سے زیادہ ہے۔ صرف اسی کا فیض مُلک کے دُور دراز حصوں میں پہنچانا مُلک اور قوم کی کوئی کم خدمت نہیں۔ اور اس کے علاوہ اگرچہ دیوبند میں فلسفۂ جدید اور بعض دوسرے نئے علوم سے بہت واقفیت نہیں۔ لیکن ان کمیوں کا احساس ضرور ہو رہا ہے۔ مولانا انور شاہ کے سوانح حیات میں لکھا ہے۔ "فلسفۂ جدید (یعنی جدید سائنس) اور جدید ہیئت کا بھی آپ نے گہرا مطالعہ فرمایا تھا۔ اور آپ نے بعض مخصوص تلامذہ کو جدید سائنس کی ایک کتاب بھی پڑھائی تھی۔ اور فرمایا کرتے تھے۔ کہ اب علماء کو قدیم فلسفہ وہیئت کے ساتھ ساتھ جدید فلسفہ وہیئت کو بھی حاصل کرنا چاہئیے۔ علامہ سیّد رشید رضا جب ندوہ کے سالانہ جلسے کی تقریب میں ہندوستان آئے تھے۔ تو آپ دیوبند بھی

لہ جامع الازہر میں ریاضی۔ جغرافیہ تاریخ کے علاوہ حال میں سائنس اور مغربی زبانیں داخلِ نصاب ہوگئی ہیں۔ اگر دیوبند جامع الازہر ہی سے روابط قائم کرسکے۔ تو ہندوستانی مسلمانوں کو کئی طرح کے فائدے ہوں ÷

تشریف لے گئے اور اِس دارالعلوم کے متعلق آپ نے فرمایا" اگر میں اِس دارالعلوم کو نہ دیکھتا۔ تو ہندوستان سے نہایت مایوس ہوکر واپس جاتا۔ اس دارالعلوم نے مجھ کو بتا دیا ہے کہ ہندوستان میں ابھی علومِ عربیہ اور تعلیماتِ مذہبی اعلےٰ پیمانے پر ہیں"۔

ڈابھیل

دیو بند کی ایک نہر سورت کے قریب ریاست بڑودہ کے ایک گاؤں ڈابھیل میں بہنی شروع ہوئی ہے۔ اور بعض آثار کہہ رہے ہیں۔ کہ یہ نہر کسی دن دریائے فیض بن کر موج زن ہوگی۔ یہاں کئی سال سے ایک اسلامی مدرسہ قائم تھا۔ جسے مولانا احمد حسن نے جاری کیا تھا۔ نواح کے متمول اور مخیر لوگوں کی برکت سے اس کی مالی حالت معقول تھی۔ اور جامعہ اسلامیہ ڈابھیل اس علاقے میں پہلے ہی مفید کام کر رہا تھا۔ کہ چند اتفاقات سے اس کا درجہ اور بھی بلند ہوگیا۔ مولانا انور شاہ ۱۳۴۵ھ تک دیو بند میں "صدر مدرس و جانشین شیخ الہند" رہے۔ اس کے بعد بعض اصلاحات کے سلسلے میں منتظمین دارالعلوم سے اُن کا اختلاف ہُوا۔ اور اُنہوں نے دارالعلوم سے قطع تعلق کر لیا۔ ڈابھیل کے کارکن اور ہوشیار مہتمم اور دوسرے مربیّوں نے اس سے فائدہ اُٹھایا۔ اور مولانا کو ڈابھیل آنے کی دعوت دی۔ جسے بالآخر اُنہوں نے قبول کر لیا۔ اور اپنی وفات سے کُچھ عرصہ پہلے ۱۳۵۱ھ تک جامعہ اسلامیہ ڈابھیل میں درسِ حدیث دیتے رہے۔ اُن کی وفات کے بعد کارکنانِ جامعہ نے مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی کو راضی کر لیا۔ اب وہ اس جگہ "شیخ الحدیث" کے فرائض انجام دیتے ہیں۔ ان بزرگوں کی وجہ سے ڈابھیل کو بڑی رونق ہوگئی ہے۔ چار پانچ سو کے قریب طُلبا وہاں تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ ان میں گجرات۔ پنجاب اور یو۔ پی کے علاوہ بنگال۔ برما۔ افغانستان۔ چین اور ماریشس کے طلبا بھی ہیں۔ جامعہ کی عمارتیں اعلےٰ ہیں۔ حاجی یُوسف گارڈی اور حاجی مُوسےٰ میاں جامعہ کو ایک ایک ہزار روپیہ ماہوار دیتے ہیں۔ جامعہ کے لئے جنوبی افریقہ میں بہت چندہ جمع ہُوا ہے۔

اور مالی نقطۂ نظر سے اس کی حالت ندوہ اور دیوبند سے بہت مختلف ہے۔ لیکن ڈابھیل کی آیندہ ترقی کی اُمید کچھ تو مولانا شبیر احمد عثمانی کے تعلق اور اس کے موجودہ ناظم مولانا احمد کی سمجھ اور محنت کی وجہ سے اور کچھ نواح کے مخیر مسلمانوں کی توجہ کے باعث ہے۔ لیکن ان باتوں سے بھی زیادہ اُمید افزا بات منتظمانِ جامعہ کا نقطۂ نظر ہے۔ وہ اپنی ذمہ داری کا پُورا احساس کرتے ہیں اور اُن کا مسلک یہ ہے کہ اسلامی مدرس فقط "تبرکات" نہیں جنہیں عقیدت مندی کی وجہ سے قائم رکھا جائے۔ بلکہ وہ قوم کی بنیادی ضروریات پُوری کر سکتے ہیں۔ اور وہ اس سلسلے میں اپنی مساعی کو وسعت دے رہے ہیں۔ جو مقاصد اُن کے پیشِ نظر ہیں۔ ان میں ایک تو صنعتی تعلیم کا انتظام ہے۔ دوسرا انگریزی پڑھانے کا سلسلہ۔ اس کے علاوہ وہ یہ بھی سمجھتے ہیں کہ علما کے فرائض احمدیہ اشاعتِ اسلام کے نقائص بیان کر دینے سے پُورے نہیں ہو جاتے۔ بلکہ انہیں خود اشاعتِ اسلام کا کام ہاتھ میں لینا چاہیئے۔ اور عملی طور پر کچھ کر کے دکھانا چاہیئے۔ چنانچہ اُن کا ارادہ ہے کہ اگر انہیں پانچ چھ موزوں گریجویٹ مل جائیں تو وہ انہیں مدرسے میں تعلیم دے کر اشاعتِ اسلام کے لئے تیار کریں۔ اس مقصد کے لئے وہ ان گریجویٹوں کو وظائف دینے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ ان ارادوں میں سے بعض ابھی پایۂ تکمیل کو نہیں پہنچے۔ لیکن تجاویز ہی سے اندازہ ہو سکتا ہے۔ کہ منتظمین کی آنکھیں مستقبل کی طرف ہیں۔ اور وہ چاہتے ہیں کہ اُن کے فارغ التحصیل طلبا فقط نمازِ جنازہ پڑھانے اور مُرغیاں ذبح کرنے کے قابل نہ رہ جائیں۔ بلکہ قوم کے امراض کی دوا ہوں۔ اور خود اپنے دارالعلوم کے لئے باعثِ فخر بنیں ✣

اکبر الہ آبادی

علمائے دیوبند اور اربابِ علی گڑھ کے خیالات اور طریقِ کار میں جو اختلاف تھا۔ وہ اظہر من الشمس ہے سر سید کی زندگی ہی میں اُن کے بعض عقائد کے خلاف مولٰنا محمد قاسم نانوتوی سرپرست مدرستہ العلوم دیوبند نے رسائل لکھے تھے۔ لیکن اس اختلاف کے باوجود علمائے دیوبند نے علی گڑھ کی

مخالفت اوچھے ہتھیاروں سے نہیں کی۔ اور اعتدال اور متانت کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔
اسی زمانے میں سرسید اور اُن کے کاموں کی مخالفت ایک ایسے حلقے کی طرف سے ہوئی۔
جسے بظاہر مذہب سے کوئی تعلق نہ تھا۔ اور جس نے اس مخالفت کے لئے اعلٰے و ادنٰے
سارے حربے استعمال کئے۔ اس حلقے کا مرکز لکھنؤ کا اخبار "اودھ پنچ" تھا۔

اخبار "اودھ پنچ" کی تاریخ لکھنا ہمارا کام نہیں۔ اس نے نیچرل شاعری اور حالی کی دوسری اصلاحی کوششوں کی مخالفت جس طرح کی۔ اُس سے اُردو ادب کی تاریخ جاننے والے بخوبی واقف ہیں۔ سرسید کی مخالفت میں "اودھ پنچ" کے بہترین ترجمان سید اکبر حسین اکبر تھے۔ جنہوں نے پہلے پہل "اودھ پنچ" اور "پیامِ یار" کے صفحات میں شہرت حاصل کی[1] اور پھر رفتہ رفتہ اپنی طبع خداداد کی مدد سے ترقی کرتے ہوئے اُردو کے ایک مقبولِ عام شاعر ہو گئے۔

"اودھ پنچ" کا ذکر کرتے ہوئے مولوی محمد یحیٰے تنہا لکھتے ہیں۔ اس "اخبار کے مضمون نگاروں میں سید اکبر حسین صاحب سابق جج اور منشی جوالا پرشاد برق سابق جج خفیفہ قابلِ ذکر ہیں۔ جناب اکبر کو اپنے خاص رنگ میں جو امتیاز حاصل ہے۔ وہ محتاجِ تشریح نہیں۔ اگر سرسید احمد خاں اور "اودھ پنچ" نہ ہوتے۔ تو سید اکبر حسین صاحب بھی شاعر نہ ہوتے۔ سید صاحب کے ہر کام پر نکتہ چینی کرنا اس زمانے میں اکبر کا فرض تھا۔ اور اس کی اشاعت کے لئے "اودھ پنچ" کے اوراق وقف تھے۔ رفتہ رفتہ جناب اکبر ایک زبردست شاعر اور مسلّم الثبوت اُستاد بن گئے"۔

---

[1] ابتدائی رجحانات کا تھوڑا بہت اثر اکبر کی شاعری میں اخیر تک رہا۔ اور اس زمانے میں بھی جب تصوّف سے انہیں خاص رغبت ہو گئی تھی۔ اُنہوں نے کئی ایسے خیالات کا اظہار کیا جنہیں پڑھ کر طبیعت کو کراہت ہوتی ہے (ملاحظہ ہو کلیاتِ اکبر جلد دوم صفحہ ۷۸ و "اکبر الٰہ آبادی" از طالب الٰہ آبادی صفحہ ۳۲۸)

سرسید، علی گڑھ اور جدید تعلیم کی نسبت اکبرؔ نے سینکڑوں شعر لکھے ہیں۔ اور ان میں سے بعض بڑے پُرلطف ہیں۔ اور اکبرؔ کے مخالفین بھی اُن کی داد دیتے ہیں۔ لیکن اکبرؔ کے ابتدائی کلام کے متعلق یہ نہیں کہا جاسکتا۔ کہ یہ سُوقیانہ نہیں۔ یا اس میں دیانتداری اور انصاف پسندی کے سارے اصُول ملحُوظ رکھے گئے ہیں۔ ۱۸۷۷ء کا ایک قطعہ ہے۔ جس میں سرسید سے تمام خیالی اور فرضی بُرائیاں منسوب کی گئی ہیں۔ اور اُن کا مذاق اُڑاکر ظاہر بین ناظرین سے دادِ سخن طلب کی ہے ؎

سیّد سے آج حضرتِ واعظ نے یہ کہا — چرچا ہے جابجا ترے حالِ تباہ کا
سمجھا ہے تُو نے نیچر و تدبیر کو خُدا — دِل میں ذرا اثر نہ رہا لا اِلٰہ کا
ہے تجھ سے ترکِ صوم و صلوٰۃ و زکوٰۃ و حج — کچھ ڈر نہیں جنابِ رسالت پناہ کا
شیطان نے دکھا کے جمالِ عروسِ دہر — بندہ بنادیا ہے تجھے حُبِّ جاہ کا
اُس نے دیا جواب کہ مذہب ہو یا رواج — راحت میں جو مخل ہو وہ کانٹا ہے راہ کا
افسوس ہے کہ آپ ہیں دُنیا سے بےخبر — کیا جانیئے جو رنگ ہے شام و پگاہ کا
یورپ کا پیش آئے اگر آپ کو سفر — گذرے نظر سے حال رعایا و شاہ کا
وہ آب و تاب و شوکتِ ایوانِ خسروی — وہ محکموں کی شان وہ جلوہ سپاہ کا
آئے نظر علومِ جدیدہ کی روشنی — جس سے خجل ہو نورِ رُخِ مہر و ماہ کا
دعوت کسی امیر کے گھر میں ہو آپ کی — کمسن مسوں سے ذکر ہو اُلفت کا چاہ کا
نوخیز و دِل فریب گل اندام نازنیں — عارض پہ جن کے بار ہو دامن نگاہ کا
رُک کے اگر تو ہنس کے کہے اِک بُتِ حسین — "وَیل مولوی! یہ بات نہیں ہے گناہ کا"
اس وقت قبلہ جھک کے کروں آپ کو سلام — پھر نام بھی حضُور جو لیں خانقاہ کا
پتلون و کوٹ و بنگلہ و بسکٹ کی دُھن بندھے — سودا جناب کو بھی ہو ہَٹ کی کُلاہ کا
منبر پہ لیں تو بیٹھ کے گوشے میں اے جناب! — سب جانتے ہیں وعظ ثواب و گناہ کا

اسی زمانے کی ایک رُباعی میں شائع "تہذیب الاخلاق" کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اکبرؔ نے اپنے فلسفۂ عمل کا ذکر کیا ہے۔ جو سرسیّد کی عملی پالیسی کے عین مخالف تھا ؎

لیکچر سے ہے نہ کچھ خیالات سے ہے — تہذیب سے ہے نہ ترکِ عادات سے ہے
اکبرؔ بخدا یہ کامیابی ساری — تقدیر سے اور اتفاقات سے ہے

ایک طویل نظم میں "محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس" پر مسلسل طنز کی ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

کانفرنس احباب سے پُر ہے — جو صف ہے وہ سلکِ دُر ہے
سب کو یاد اُستاد کا گُر ہے — دلکش ہر اسپیچ کا سُر ہے
قومی ترقی کی رادھا پیاری — بیٹھی ہیں پہنے جوڑا بھاری
نو من تیل کی فکر ہے طاری — چندے کی تحصیل ہے جاری
قوم پہ غالب کورٹ کے عملے — عملے ٹھہرے پارک کے گملے
پھر یہ چندہ کیوں کر دم لے — کتنا ہی لے کوئی پھر بھی کم لے
جمع ہیں ممبر بھولے بھالے — جاڑوں کا موسم پھولے پھالے
آنکھیں پھاڑے دانت نکالے — چندہ دے کر پھنسنے والے
بعض ہیں بادہ و جام کے خواہاں — بعض نمود و نام کے خواہاں
بعض فقط آرام کے خواہاں — کم ہیں فیضِ عام کے خواہاں
ہر دم قوم کا رونا کیا ہے — ان باتوں سے ہونا کیا ہے
مفت میں روپیہ کھونا کیا ہے — شور زمین میں بونا کیا ہے
یہ وادی ہے طور سے خالی — یہ محفل ہے نُور سے خالی
یہ جنت ہے حُور سے خالی — پاس سے خالی دُور سے خالی
دیکھتا ہے اِک عُمر سے بندا — بس یہی باتیں اور یہی پھندا
ہوتا ہے کچھ کام نہ دھندا — لاؤ چندا لاؤ چندا!!

علی گڑھ کالج اور یونیورسٹی کے متعلق اکبرؔ کی جو رائے تھی۔ اُس کا اندازہ ان دو اشعار سے ہو سکتا ہے۔ جو انہوں نے علی گڑھ یونیورسٹی کی تاسیس کے متعلق کہے ؎

ابتدا کی جنابِ سیّد نے　　جن کے کالج کا اتنا نام ہُوا
انتہا یونیورسٹی پہ ہوئی　　قوم کا کام اب تمام ہُوا

اکبرؔ مرحوم کی عُمر میں خدا نے برکت دی۔ اور اُن کی شاعری نے کئی رنگ بدلے۔ سلف کی محبت اور نئی تہذیب و تمدّن سے نفرت اُن کے تمام اشعار میں جھلکتی ہے۔ لیکن اِس بارے میں بھی شروع اور اخیر کے اشعار میں امتیاز ہے۔ ابتدائی اشعار میں جو اُنہوں نے سر سیّد اور علی گڑھ کے متعلق لکھے۔ ذاتیات کا عنصر بُری طرح نمایاں تھا۔ بعد میں یہ بہت کم ہو گیا۔ نئے طریقوں سے انہیں کراہت ہمیشہ رہی۔ لیکن یہ کراہت ایک نظام (یا بدنظمی!) سے تھی۔ کسی فرد یا شخص کی مخالفت کی وجہ سے نہ تھی۔ اس کے علاوہ اب زمانہ بہت بدل گیا تھا۔ اکبرؔ نے دیکھ لیا تھا۔ کہ جدید تعلیم اور نئے طبقے سے خیالی اور فرضی معائب منسوب کرنے میں مصلحت نہیں۔ اب انہوں نے بکثرت ایسے اشعار لکھے۔ جن میں نئی تعلیم کی صریح مخالفت کی بجائے اس امر پر زیادہ زور دیا۔ کہ نئے علوم تو حاصل کئے جائیں۔ لیکن مذہب اور شعار قومی کا بھی پورا خیال ہو +

اکبرؔ مرحوم کے متعلق طالبؔ الٰہ آبادی نے جو کتاب لکھی ہے۔ اس میں بیان کیا ہے۔ کہ جب وہ ۱۸۸۱ء میں دوئم درجہ کے منصف ہو کر خورجہ گئے۔ تو وُہاں سے سیّد احمد اور سمیع اللہ صاحب نے کوشش کر کے اُن کو علی گڑھ بُلایا"۔ معلوم نہیں کہ یہ بیان کس حد تک صحیح ہے۔ اس زمانے میں اکبرؔ سر سیّد کے خلاف جو نظمیں "بشیر۔ ح الٰہ آبادی" کے نام سے لکھ رہے تھے۔ اُن کے پیشِ نظر سر سیّد کے دِل میں اکبرؔ کی قدر عجیب معلوم ہوتی ہے۔ لیکن یہ بھی صحیح ہے۔ کہ سر سیّد۔ محسن الملکؔ اور حالیؔ کی طبیعتوں میں غیر معمولی بلند خیالی اور وسیع القلبی تھی۔ اس لئے یہ بات بالکل ناممکن بھی نہیں۔ کہ سر سیّد نے اکبرؔ کو علی گڑھ بُلانے کی کوشش کی ہو۔ معلوم

ہوتا ہے۔ کہ بالآخر اکبر کا دل بھی سرسید کی طرف سے صاف ہوتا گیا۔ سرسید کی مذہبی، تعلیمی، اور سیاسی پالیسی کے تو وہ اخیر تک مخالف رہے۔ لیکن انہوں نے سرسید کی شخصی خوبیوں کی قدر کرنی شروع کر دی۔ ۱۸۹۲ء کی ایک نظم کے چند اشعار ہیں ؎

سب جانتے ہیں علم سے ہے زندگیٔ رُوح — بے علم ہے اگر تو وہ انساں ہے ناتمام
بے علم و بے ہنر ہے جو دُنیا میں کوئی قوم — نیچر کا اقتضا ہے رہے بن کے وہ غلام
تعلیم اگر نہیں ہے زمانے کے حسبِ حال — پھر کیا اُمیدِ دولت و آرام و احترام
سید کے دل میں نقش ہُوا اس خیال کا — ڈالی بنائے مدرسہ لے کر خُدا کا نام
صدمے اُٹھائے رنج سہے گالیاں سُنیں — لیکن نہ چھوڑا قوم کے خادم نے اپنا کام
دِکھلا دیا زمانے کو زورِ دل و دماغ — بتلا دیا کہ کرتے ہیں یوں کرنے والے کام
نیت جو تھی بخیر تو برکت خُدا نے دی — کالج ہُوا دُرست بصد شان و احتشام

سرسید کی وفات پر اکبر نے جو خیالات ظاہر کئے ہیں۔ اُن میں بھی دلی خلوص و احترام کا عنصر موجود ہے ؎

ہماری باتیں ہی باتیں ہیں سید کام کرتا تھا — نہ بھُولو فرق جو ہے کہنے والے کرنے والے میں
کہے جو چاہے کوئی میں تو یہ کہتا ہوں اے اکبر — "خدا بخشے بہت سی خوبیاں تھیں مرنے والے میں"

اکبر مرحوم نے نئی تعلیم کا اس قدر خاکہ اُڑایا ہے۔ کہ بعض لوگ سمجھتے ہیں۔ کہ جہاں تک اُن کا بس چلتا ہوگا۔ وہ لوگوں کو عملاً نئی تعلیم سے باز رکھتے ہوں گے۔ یا نئی تعلیم دلاتے وقت اپنے خاص نقطۂ نظر کا خیال کرتے ہوں گے۔ حقیقتاً ایسا نہیں ہُوا۔ اکبر مرحوم کے تین لڑکے تھے۔ ایک اوائل عمر ہی سے دماغی امراض میں مبتلا رہے۔ دوسرے کم سنی میں وفات پا گئے۔ تیسرے سید عشرت حسین ہیں۔ اُن کی تعلیم کے لئے اکبر نے ہندوستان ہی کی نئی یونیورسٹیوں پر اکتفا نہیں کیا۔ بلکہ انہیں انگلستان بھیجا۔ اور کیمرج میں تعلیم دلائی۔ لیکن معلوم ہوتا ہے۔ کہ جن مشرقی روائتوں پر اکبر خاص طور پر زور دیتے تھے۔ بدقسمتی سے عشرت صاحب نے کم از کم

اس زمانے میں اُن پر بہت توجہ نہ دی۔ اور اکبر نے کئی پُر درد اشعار میں اس بات پر اظہارِ افسوس کیا۔ ایک قطعہ بند غزل ہے ؎

عشرتِ گھر کی محبت کا مزا بھول گئے — کھا کے لندن کی ہوا عہدِ وفا بھول گئے
پہنچے ہوٹل میں تو پھر عید کی پروا نہ رہی — کیک کو چکھ کے سویّوں کا مزا بھول گئے
بھولے ماں باپ کو اغیار کے چرچوں میں وہاں — سایۂ کفر پڑا نورِ خدا بھول گئے
موم کی پتلیوں پر ایسی طبیعت پگھلی — چمنِ ہند کی پریوں کی ادا بھول گئے
کیسے کیسے دلِ نازک کو دکھایا تم نے — خبرِ فیصلۂ روزِ جزا بھول گئے

نقلِ مغرب کی ترنگ آئی تمہارے دل میں
اور یہ نکتہ کہ مری اصل ہے کیا بھول گئے!

اسلامی ہندوستان کی ادبی اور ذہنی تاریخ میں اکبر کو ایک خاص اہمیت حاصل ہے۔ ابتدائے شعر گوئی ہی میں اُنہوں نے کئی بلند پایہ اور موثر غزلیں لکھی تھیں۔ اور اگر وہ اپنی شاعری غزل تک محدود رکھتے۔ تب بھی قرینِ قیاس ہے۔ کہ وہ اس صنفِ شاعری میں کمال حاصل کرتے۔ اور اُن کا شمار اساتذۂ فن میں ہوتا۔ لیکن اُنہوں نے اپنی شاعری کو غزل تک ہی محدود نہ رکھا۔ بلکہ "اودھ پنچ" کی کشش سے طنزیہ نظمیں بھی لکھیں۔ اور اس فن میں اپنی نکتہ آفرینی اور جودتِ طبع سے اس درجہ کمال حاصل کیا۔ کہ اس خاص طرزِ شاعری میں اُن کا کوئی جواب نہیں۔ اُن کی طبیعت میں پرلے درجے کی مضمون آفرینی تھی۔ اور وہ معمولی باتوں میں ایسی ایسی گلکاریاں کرتے۔ کہ پڑھنے والے عش عش کرتے رہ جاتے ؂

طنزیہ اور ظریفانہ شاعری میں اکبر بے بدل تھے۔ لیکن بطور ایک تعمیری مفکّر کے اُن کا پایہ حالی یا اقبال سے بہت پست ہے۔ اکبر جزئیات اور وقتی مسائل کے مختلف پہلوؤں کو بڑی خوبی سے دیکھ لیتے تھے۔ اور ان کے متعلق انہیں ایسی باتیں سوجھتیں۔ جن کا خیال اقبال یا حالی کو نہ ہوتا تھا۔ لیکن اصولی باتوں اور انسانی زندگی یا قومی ضروریات کے اہم

بنیادی مسائل پر ان کی نظر اتنی گہری نہ تھی۔ جتنی حالیؔ یا اقبالؔ کی۔ اس کے علاوہ شاید یہ بھی صحیح ہے۔ کہ انہیں حالیؔ کی سی راست بینی اور ہموار طبیعت میسّر نہ تھی۔ نئی نسل کی تمام خامیاں تو انہیں پوری طرح نظر آجاتی تھیں۔ لیکن پُرانی نسل کے نقائص پر اُن کی توجّہ نہ تھی۔ اور وہ یہ نہیں سمجھتے تھے۔ کہ قومی تمدّن کے جس دور نے واجد علی شاہ۔ جان صاحب۔ میر جعفر اور غلام قادر رہیلہ پیدا کئے ہوں۔ اُس کے اخلاقی نظام میں اصلاح کی ضرور گنجائش ہے۔

اکبرؔ کو ایک بلند پایہ تعمیری مفکر سمجھنا غلطی ہے۔ لیکن اس سے اُن کے کام کی اہمیت یا عظمت کم نہیں ہو جاتی۔ ایک کامیاب طنز گو شاعر بالعموم عملی مفکر یا رہنما نہیں ہوتا۔ اُس کا کام عمل کی نئی راہیں بتاتا نہیں ہوتا۔ بلکہ اپنے طریقِ کار کی تکمیل میں جب دوسرے رہنما حدِ اعتدال سے تجاوز کریں۔ تو وہ تمسخر و تضحیک سے اُن کی غلطیاں جتاتا ہے۔ اور انہیں اعتدال پسندی کا راستہ دکھاتا ہے۔ اکبرؔ مرحوم نے یہی کیا۔ اور ایک ایسے زمانے میں جب قوم کا ایک با اثر طبقہ مغرب کی رسمی اور سطحی تقلید میں بے اعتدالیاں کر رہا تھا۔ اُنہوں نے اس روش کے خلاف آواز اُٹھائی۔ اور اپنے موثر طنزیہ اشعار سے اس رجحان کو روکا۔

شبلی نعمانی

ندوہ کا ذکر ہم نے اُس تحریک کے ضمن میں کیا ہے۔ جس کا مقصد مُسلمانوں کے خیالات اور طریقِ تعلیم و تدریس کو نئی صُورتِ حالات کے مطابق بدلنا تھا۔ حقیقتاً ندوہ کے مقاصد علی گڑھ کے مقاصد کا تکملہ تھے۔ اس کی تاسیس میں سر سیّد اور مُحسن الملک نے مدد کی۔ اور محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس میں ندوہ کی حمائت میں باقاعدہ ریزولیوشن پاس ہوئے۔ جن کی تائید میں سید محمود اور نواب محسن الملک نے پرزور تقریریں کیں۔ ان سب باتوں کے باوجود یہ بات قابلِ ذکر ہے۔ کہ یہی ندوہ ایک زمانے میں علی گڑھ کا سب سے بڑا حریف ہو گیا۔ اور وہ بھی ایک ایسے بزرگ کی بدولت جس نے مدتوں علی گڑھ میں فیض حاصل کیا تھا۔

شبلی قریباً سولہ سال علی گڑھ میں ملازم رہے۔ یہیں انہوں نے آرنلڈ سے فرانسیسی زبان سیکھی۔ اور مستشرقین کی کتابوں تک رسائی حاصل کی۔ اور یہیں سرسید کی با اثر شخصیت نے ان کی قلب ماہیت کی۔ بقول مولانا مہدی حسن "شبلی نے مولویت علیگڈھ میں پہنچ کر چھوڑی۔ اُن کے خیالات کی کایا پلٹ۔ مذاقِ تصنیف اور وسیع النظری۔ غرض یہ جو کچھ ہوئے۔ سرسید کے دامنِ تربیت کا اثر تھا۔ شبلی نے المامون کا دوسرا ایڈیشن جب شائع کیا ہے۔ تو سرسید نے جس خلوص کے ساتھ اس پر دیباچہ لکھا وہ آج بھی اُن کی ادبی شرافت کا پتہ دیتا ہے۔" ان سب باتوں کے باوجود کیا وجہ تھی۔ کہ شبلی سرسید اور سرسید کے کاموں کے اس قدر مخالف ہو گئے۔ کہ جس کتاب میں سرسید کی نسبت حرفِ خیر لکھا ہو۔ شبلی اس میں کیڑے نکالنا شروع کردیں!

شبلی کی زندگی کا یہ معمّا حل کرنا بہت مشکل ہے۔ بظاہر بہت کم اسباب ہیں۔ جن کی وجہ سے شبلی کو سرسید سے پرخاش ہونی چاہیئے۔ سرسید سے عموماً لوگ جس بات پر ناراض ہیں۔ وہ سرسید کے مذہبی عقائد تھے۔ لیکن شبلی اس معاملے میں سرسید سے کچھ کم نہ تھے۔ ان کے خیالات کم ازکم نیم معتزلہ ضرور تھے۔ اور دیوبند کے علما اس بارے میں ان سے بھی اتنے ہی ناخوش ہیں۔ جتنے سرسید سے۔ حال ہی میں دیوبند کے ایک عہدہ دار نے اس مدرسے کی تاریخ مرتب کی ہے۔ اور اس میں ان لوگوں کے نام گنائے ہیں۔ جنہوں نے دارالعلوم دیوبند کے بانیوں یا دوسرے اساتذہ سے کسبِ فیض کیا۔ اِس فہرست میں "پروفیسر شبلی" کا نام بھی ہے۔ لیکن اس امر کی تصریح کردی گئی ہے۔ کہ شبلی کے بعد کے مذہبی خیالات سے دارالعلوم کو کوئی تعلق نہیں۔ خود شبلی ۱۹۱۲ء کے ایک خط میں دیوبند کے آرگن "القاسم" کے متعلق لکھتے ہیں۔" القاسم کے نزدیک ہم لوگ کافر کم ازکم مضلّ و گمراہ ہیں" مذہبی اختلافات کے علاوہ بعض لوگ سرسید کی سیاسی پالیسی کے مخالف ہیں۔ شبلی نے ایک زمانے میں اس پالیسی پر بُری طرح نکتہ چینی کی۔ لیکن شاید سیاسی

اختلاف کو بھی وجہِ مخاصمت نہیں قرار دیا جاسکتا - کیونکہ سرسید کے سیاسی خیالات ۱۸۸۶ء کے بعد ہر ایک کو معلوم تھے - اور شبلی اس کے بعد برسوں سرسید اور علی گڑھ کے گُن گاتے رہے - اس کے علاوہ اگرچہ اُنھوں نے اُس زمانے میں جب نواب وقار الملک اور دُوسرے اربابِ علی گڑھ سرسید کی پالیسی سے تجاوز کرچکے تھے - اس پالیسی کی مذمت کی لیکن عملاً وہ جس پالیسی پر کار فرما رہے - اُس کا اندازہ اس عرضداشت سے بخوبی ہوسکتا ہے - جو اپنی وفات سے کچھ عرصہ پیشتر اُنھوں نے مولانا عبدالماجد سے لکھواکر چیف سیکرٹری حکومت صُوبجات متحدہ کے حضور میں پیش کی - اس میں لکھتے ہیں "مَیں مدت العمر کبھی انگریزی گورنمنٹ کا بدخواہ نہیں رہا - میری ہمیشہ یہ کوشش رہی ہے - کہ مشرق و مغرب کے درمیان یگانگت بڑھے - اور ایک دوسرے کی طرف سے جو غلط فہمیاں مُدت دراز سے چلی آتی ہیں - دُور ہوں - چنانچہ اس پر میری تمام تصانیف شاہد ہیں - اس سے بڑھ کر یہ کہ ۱۹۰۸ء میں مَیں نے الندوہ میں ایک مُستقل مضمون کے ذریعہ سے یہ ثابت کیا - کہ مُسلمانوں پر انگریزی حکومت کی اطاعت و وفاداری مذہباً فرض ہے - اور اسی سال ندوہ کے سالانہ جلسے میں وفاداری کا ایک رزولیوشن بھی پاس کروایا - پھر معاملۂ مولوی عبدالکریم میں مجھے محض اس جرم پر کہ مَیں نے اپنے ضمیر کے مطابق ایک باغیانہ مضمون کی اشاعت بند کی - اخبارات میں گالیاں سُننا پڑیں"[1]

ان دو اصُولی اختلافات کے علاوہ سرسید کے جس فعل سے کئی لوگ ناراض ہیں - وہ ٹرسٹی بل کے متعلق ان کا رویّہ ہے - نواب وقار الملک نے اس بل کی مخالفت کی - اور اس کے پاس ہونے کے بعد مولوی سمیع اللہ اور ان کی پارٹی سرسید کے کاموں سے ہمیشہ کے لئے علیحدہ ہوگئے - شبلی کو اس مسئلے پر سرسید سے بجا اختلاف ہوسکتا تھا - لیکن واقعہ یہ ہے - کہ وہ اس بل کے پُرزور حامی تھے - اور سید محمود کی حمائت اور مولوی سمیع اللہ کی

[1] مکاتیبِ شبلی حصّہ اوّل صفحہ ۲۹۰

مخالفت میں جس طرح انہوں نے غلو اور بے اعتدالی سے کام لیا۔ سرسید نے خود اُسے روا نہیں رکھا۔
سرسید سے شبلی کی عداوت اس قدر عجیب اور غیر متوقع ہے۔ کہ شبلی کے ایک عزیز دوست اور مداح نے جو شبلی کا نام غزالیؒ اور شاہ ولی اللہؒ کے ساتھ لیتے ہوئے ہچکچاتے نہ تھے۔ اس اختلاف کا سبب شبلی کے پیچیدہ کیرکٹر میں تلاش کیا ہے۔ مہدی حسن صاحب ایک پرزور مضمون میں اس مسئلے پر لکھتے ہیں۔ "یہ دلچسپ سوال ابھی باقی ہے۔ کہ حالی کے ہیرو (سرسید) کے ساتھ شبلی کو اس قدر چشمک کیوں ہے۔ کیا یہ جامع حیثیات شخصیت شبلی کے ناموران اسلام کا رنگ پھیکا کرنے والی ہے؟ یا جس طرح ایک خوبصورت عورت دوسری پر کالۂ آتش کو نہیں دیکھ سکتی۔ در اصل جذبۂ رشک اس کی تہ میں ہے"۔
مولانا عبدالحلیم شرر جو مولانا شبلی سے خوب واقف تھے۔ ان کے بیان سے بھی اس خیال کی تائید ہوتی ہے۔ وہ یہ لکھ کر کہ دنیا نے پہلے مولانا شبلی کو سرسید کی "فوج کے ایک نامی پہلوان کی حیثیت" سے دیکھا۔ اور مولانا اس ثانوی حیثیت کو ناپسند کرتے تھے۔ آگے چل کر لکھتے ہیں۔ کہ مولانا نے اسی وجہ سے "علی گڑھ کالج سے علیحدگی اختیار کر کے ندوۃ العلما میں شرکت کی۔ اور سمجھے۔ کہ میں اس ذریعے سے علما کا سرتاج اور شیخ الکل بن کے اس درجے پر پہنچ جاؤں گا۔ جو سید صاحب کے درجے سے بھی مافوق ہے"۔
شبلی اور سرسید کی اس چشمک کی وجہ خواہ کچھ ہو۔ لیکن یہ امر واقعی ہے۔ کہ شبلی کا دل سرسید کی طرف سے صاف معلوم نہیں ہوتا۔ اور علی گڑھ سے علیحدہ ہو جانے کے بعد انہوں نے بالعموم سرسید سے انصاف نہیں کیا۔ "شبلی نے الکلام لکھی۔ لیکن سرسید کا نام تک نہ آیا۔ حالانکہ سرسید پہلے شخص ہیں۔ جنہوں نے دورِ جدید میں مذہب کو معقولاتِ عصریہ سے تطبیق دینے کی کوشش کی"۔ اس کے علاوہ شبلی نے مکاتیب میں جابجا "حیاتِ جاوید" کے خلاف جو کچھ لکھا ہے۔ اس سے اندازہ ہو سکتا ہے۔ کہ سرسید کی تعریف شبلی کو کس قدر ناپسند تھی۔ مکاتیب میں جو اشارات ہیں۔ ان سے زیادہ صاف ایک زبانی ارشاد ہے۔ جسے مولوی عبدالحق

نے بالتصریح تو شبلی سے منسوب نہیں کیا۔ لیکن جو قرائن سے یقیناً شبلی کا اظہارِ خیال معلوم ہوتا ہے۔ مولوی صاحب مولانا حالی کے متعلق ایک مضمون میں لکھتے ہیں:۔

"جب حیاتِ جاوید شائع ہوئی۔ تو مولانا نے تین نسخے مجھے بھیجے۔ ایک میرے لئے۔ ایک مولوی عزیز مرزا کے لئے اور تیسرا ایک محترم بزرگ اور ادیب (مولانا شبلی؟) کیلئے جو اس وقت اتفاق سے حیدر آباد میں وارد تھے۔ مَیں نے لے جاکر یہ کتاب ان کی خدمت میں پیش کی۔ شکریہ تو رہا ایک طرف۔ دیکھتے ہی فرمایا۔ کہ یہ کذب و افترا کا آئینہ ہے۔ وہاں اور بھی کئی صاحب موجود تھے۔ مَیں یہ سُن کر دم بخود رہ گیا۔ یُوں بھی کُچھ کہنا سُوءِ ادب تھا۔ لیکن جہاں پڑھنے سے پہلے ایسی رائے کا اظہار کر دیا گیا ہو۔ وہاں زبان سے کُچھ نکالنا بے کار تھا"۔

علی گڑھ کالج سے آجانے کے بعد شبلی نے سر سید کے خلاف جو رویّہ اختیار کیا۔ ممکن ہے کہ وہ بے جا ہو اور بقول مہدی حسن اس میں جذبۂ رشک کو بھی دخل ہو۔ لیکن علی گڑھ کے طلباء اور نئے تعلیم یافتہ طبقے سے انہیں کئی جائز شکائتیں بھی تھیں۔ جن کا باعث مولانا کی خُوبیاں تھیں۔ خامیاں نہ تھیں۔ اور چونکہ قوم کی ذہنی زندگی پر شبلی کی ان خصوصیات اور علی گڑھ کے متعلق اُن کے طرزِ عمل کا گہرا اثر پڑا ہے۔ اس لئے ہم ان خصوصیات اور اس طرزِ عمل کا مطالعہ کسی قدر تفصیل سے کریں گے۔

شبلی کی زندگی اور ان کے کارناموں پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ وہ طلبِ علم میں بے حد حریص تھے۔ ان کی تعلیم پُرانے اصولوں پر ہوئی۔ لیکن اس تکمیل میں اُنہوں نے کوئی دقیقہ فرو گزاشت نہیں کیا۔ اعظم گڑھ میں ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد غازی پور۔ رام پور۔ لاہور۔ سہارنپور۔ جہاں جہاں اس زمانے میں مشہور اساتذہ تھے۔ وہاں وہ گئے۔ اور فیض حاصل کیا۔ چوبیس برس کی عمر میں جب وہ علی گڑھ گئے۔ تو بظاہر تو وہ پروفیسر تھے۔ لیکن حقیقتاً یہ ان کی طالبِ علمی کی زندگی کا دوسرا دَور تھا۔ یہاں اُنہوں نے سر سید سے فیض حاصل کیا۔ سر سید کے کتب خانے سے استفادہ کی انہیں عام اجازت تھی۔ اِس کتب خانے

میں یورپ کی چھپی ہوئی جو نادر تاریخی تصنیفات تھیں۔ انہی کے مطالعہ سے مولانا کو تصانیف کا شوق پیدا ہوا[1]
مولانا نے اس اجازت سے پورا پورا فائدہ اٹھایا۔ سرسید کے علاوہ ان کا دوسرا علمی محسن آرنلڈ تھا۔
جس کے متعلق وہ ایک قصیدے میں کہتے ہیں ع

آرنلڈ آں کہ رفیق است وہم اُستادمرا!

آرنلڈ سے اُنہوں نے فرانسیسی زبان سیکھی۔ اور مستشرقین اور مغربی علما کی تصانیف تک براہِ راست رسائی حاصل کی۔ مولانا کا یہ حصولِ علم کا سلسلہ تمام عمر جاری رہا۔ جس کا نتیجہ ان متعدد تصانیف کی صورت میں ظاہر ہوا۔ جو اُردو ادب کا زیور ہیں۔ مولانا نے ہندوستانی مُسلمانوں کو صحیح طور پر اسلامی تاریخ سے روشناس کرایا۔ اور یہ "الفاروق"۔ "المامون"۔ "الہارون"۔ "الغزالی"۔ "سیرۃ النعمان" ہی کا فیض ہے۔ کہ ہندوستان کے خواندہ مُسلمانوں کو ان عظیم الشان شخصیتوں سے خاصی واقفیت ہے۔ "شعر العجم" لکھ کر مولانا نے فارسی شاعری کا ذوق جو ہندوستان سے جا رہا تھا۔ اُسے برقرار رکھنے کا سامان کر دیا ÷

انہیں "سیرۃ النبی" مکمل کرنے کا موقع نہیں ملا۔ لیکن اس کے متعلق اُن کے جو ارادے تھے۔ اور اس کے لئے مواد تلاش کرنے میں جس طرح انہوں نے محنت کی۔ اس کا اندازہ ان کے خطوط سے ہو سکتا ہے۔ مستقل تصانیف کے علاوہ مولانا کے شجرِ علم کے قابل قدر پھل وہ متعدد مضامین ہیں۔ جو الندوہ اور دوسرے رسائل میں شائع ہوئے۔ اور جنہوں نے قوم کے علمی مذاق کو بہت ترقی دی ÷

مولانا کو علم و فن سے اس قدر دلچسپی تھی۔ تو ہمیں اس بات پر کوئی حیرانی نہیں ہونی چاہیئے۔ کہ علی گڑھ کالج کا پست علمی معیار انہیں بہت ناپسند تھا۔ وہ دیکھتے تھے۔ کہ علی گڑھ نے نہ تو کوئی زبردست سکالر یا مُصنف پیدا کیا۔ اور نہ کوئی علمی روایات قائم کیں۔ طلباء علی گڑھ کے پست ذہنی معیار کے متعلق اُنہوں نے ۱۸۸۳ء کے قریب ہی

[1] مکاتیب شبلی جلد اوّل صفحہ ۲۶۶

ایک خط میں لکھا تھا۔ "معلوم ہوا۔ کہ انگریزی خوان قوم نہایت مہمل فرقہ ہے۔ مذہب کو جانے دو۔ خیالات کی وسعت۔ سچی آزادی۔ بلند ہمتی۔ ترقی کا جوش برائے نام نہیں۔ یہاں ان چیزوں کا ذکر نہیں آتا۔ بس خالی کوٹ پتلونوں کی نمائش گاہ ہے"۔ نئی نسل سے یہ شکایت انہیں اخیر دم تک رہی۔ ۱۹۱۴ء کے ایک خط میں لکھتے ہیں۔ "علمی سطح بالکل گر چکی اور انگریزی تعلیم بھی جہل کے برابر بن گئی"۔ مولانا کا خیال تھا۔ کہ جہاں تک صحیح علمی خدمت کا تعلق ہے۔ جدید تعلیم پر قدیم تعلیم کو، اور علی گڑھ کالج پر ندوہ کو فوقیت حاصل ہے۔ نواب محسن الملک کی وفات پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں۔ "جدید تعلیم ایک مدت سے جاری ہے۔ اور آج سیکڑوں ہزاروں تعلیم یافتہ بڑی بڑی خدمات پر مامور ہیں۔ لیکن قومی علم ابھی اُن لوگوں کے ہاتھ میں ہے۔ جنہوں نے کالجوں کے ایوانوں میں نہیں بلکہ مکتب کی چٹائیوں پر تعلیم پائی ہے"۔ ندوہ اور علی گڑھ کا مقابلہ کرتے ہوئے وہ مہدی حسن صاحب کو جو ان کی علمی قابلیت کے بڑے مداح تھے لکھتے ہیں۔ "ندویت آپ کی سمجھ میں نہیں آتی۔ لیکن انصاف کیجئے۔ جن لوگوں کی آپ قدردانی کرتے ہیں۔ وہ کس کان کے جوہر ہیں۔ کالج کے یا ندوہ کے؟"

علی گڑھ کی علمی پستی سے مولانا کو جو شکایت تھی۔ ہمیں اُس سے پورا اتفاق ہے۔ علی گڑھ کی علمی کم مائگی کی ایک وجہ یہ بھی ہے۔ کہ کالج کا اصل مقصد عالم اور سکالر پیدا کرنا نہ تھا۔ بلکہ سرکاری ملازمت اور قومی رہنمائی کے لئے موزوں طلبا تیار کرنا۔ اور اس بارے میں علی گڑھ شاید ناکامیاب نہیں رہا۔ لیکن پھر بھی یہ بڑا ظلم ہے۔ کہ قوم کا سب سے بڑا تعلیمی ادارہ کوئی علمی روایات قائم نہ کر سکے۔ اور اپنی طویل مدتِ حیات میں ایک بھی طالب علم ایسا نہ پیدا کرے۔ جسے سرسید یا حالی یا شبلی کے مقابلے میں پیش کیا جا سکے۔

علی گڑھ کالج کی یہ اہم کوتاہی اس قدر افسوس ناک تھی۔ کہ اس نے حالی جیسے فرشتہ خصلت انسان کو بددل کر دیا۔ سرسید کا ذکر کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں۔ "چھبیس ۲۶ برس کے تجربے سے

اُن کو اس قدر ضرور معلوم ہو گیا ہوگا۔ کہ انگریزی زبان میں بھی ایسی تعلیم ہو سکتی ہے۔ جو دیسی زبان کی تعلیم سے بھی زیادہ نکمی، فضول اور اصلی لیاقت پیدا کرنے سے قاصر ہو" مولانا حالی کا ذکر کرتے ہوئے مولوی عبدالحق لکھتے ہیں۔" جدید تعلیم کے بڑے حامی تھے۔ اور اس کی اشاعت اور تلقین میں مقدور بھر کوشش کرتے رہے۔ لیکن آخر عمر میں ہمارے کالجوں کے طلبہ کو دیکھ کر انہیں کسی قدر مایوسی ہونے لگی تھی۔ مجھے خوب یاد ہے۔ کہ جب اُن کے نام حیدر آباد میں ایک روز" اولڈ بوائے" آیا تو اُسے پڑھ کر بہت افسوس کرنے لگے کہ اس میں سوائے مسخرہ پن کے کچھ بھی نہیں ہوتا۔ انہیں علی گڑھ کے طلبہ سے اس سے اعلیٰ توقع تھی"۔

علی گڑھ کالج کی علمی پستی کا جس قدر شکوہ کیا جائے بجا ہے۔ اور آج بھی اس امر کی بڑی ضرورت ہے۔ کہ مسلم یونیورسٹی کے ارباب حل وعقد اس اہم کمی کا احساس کریں۔ اور چند ایسے منتخب طلبا کی علمی تربیت کرنا اپنا فرض سمجھیں۔ جو علمی خدمت اور تصنیف و تالیف کے لئے موزوں ہوں۔ اور سرسید اور حالی کے نقش قدم پر چل سکیں۔

علی گڑھ کے پست علمی معیار سے مولانا شبلی کو جو شکائتیں تھیں۔ اُن سے ہم اصولاً متفق ہیں۔ لیکن انصاف کا تقاضا ہے۔ کہ ہم اس امر کا بھی اظہار کر دیں۔ کہ شبلی نے اس کے متعلق جو طرزِ عمل اختیار کیا تھا۔ اُس سے اس کمی کی اصلاح ہرگز نہیں ہو سکتی تھی۔ علی گڑھ کی اِس کوتاہی کو دُور کرنے کا عملی طریقہ تو یہ تھا۔ کہ شبلی اپنے قیام کے دوران میں اس کا سدِ باب کرتے۔ یا علی گڑھ سے آجانے کے بعد جب نواب محسن الملک انہیں بار بار بُلاتے تھے۔ اس وقت وہاں جاکر چند موزوں طلبا کی علمی تربیت کرتے۔ شبلی سے یہ نہ ہُوا۔ صرف یہی نہیں۔ بلکہ علی گڑھ کے متعلق اُن کی شکائتیں بغور پڑھنے سے یہ احساس ہوتا ہے۔ کہ ان شکائتوں سے علی گڑھ کی اصلاح اس قدر مقصود نہ تھی۔ جس قدر علی گڑھ کے مقابلے میں اپنے ندوہ کی فوقیت دکھانا۔

علی گڑھ کالج بانئ درس گاہوں کے طلبا کے متعلق شبلی کی شکائتیں اگر فقط قومی ہمدردی پر

مبنی تھیں ۔ تو کم از کم اتنا تو چاہیئے تھا ۔ کہ جب انہیں ان طلبا میں سے کوئی جوہر قابل نظر آتا ۔ تو وہ خوش ہوتے اور اُس کا دل بڑھاتے ۔ مولانا محمود الحسنؒ دیوبندیؒ کو کالجوں کے طلبا سے شبلؔی سے کہیں زیادہ شکائتیں تھیں ۔ لیکن مولانا کے سب تذکرہ نگار لکھتے ہیں ۔ کہ جب ان طلبا میں سے انہیں کوئی مذہب کا پابند یا مذہب میں دلچسپی لینے والا ملتا ۔ تو مولانا کو بے انتہا خوشی ہوتی ۔ اور مولانا ہر طرح سے اس کی ہمت افزائی کرتے ۔ اسی طرح حاؔلی کو بھی شبلؔی کی طرح علی گڑھ کے طلبا سے کئی شکائتیں تھیں ۔ لیکن اس نے یہ کبھی نہ کیا ۔ کہ اُن میں سے جو قابل نکلیں اُن کی تعریف نہ کرے ۔ یا ہونہار طلبا کا دل نہ بڑھائے ۔ برخلاف اس کے مولانا شبلؔی کے قلم سے کالج کے کسی طالب علم کے متعلق کبھی حرفِ خیر نہیں نکلا ۔ مولانا ظفر علی خاں کی نسبت اپنے خطوط میں اُنہوں نے جو رائے ظاہر کی تھی ۔ وہ سب جانتے ہیں ۔ باقیوں کا بھی اگر کہیں ذکر آیا ہے ۔ تو " ایم ۔ اے ہونا بہ جوے نمی ارزد " یا اس طرح کے دوسرے فقرے کہہ کر دل کا بخار نکالا ہے ۔ اقباؔل کے بارے میں البتہ اُنہوں نے قدرے کشادہ دلی سے کام لیا ۔ اور کہا ۔ کہ "جب آزاؔد اور حاؔلی کی کرسیاں خالی ہونگیں تو لوگ انہیں ڈھونڈیں گے "۔ بظاہر تو شبلؔی کا یہ مشہور فقرہ اقباؔل کی تعریف سمجھا جاتا ہے ۔ لیکن جاننے والے جانتے ہیں ۔ کہ یہ بھی " ہجوِ ملیح " سے کم نہیں ۔ کیونکہ بطور شاعر کے اقباؔل کو آزاؔد سے پست سمجھنا کسی طرح اقباؔل کی تعریف نہیں !

حقیقت یہ ہے ۔ کہ شبلؔی اور اُن کے جانشینوں کے دل و دماغ پر جدید تعلیم اور قدیم تعلیم کا فرق اس طرح حاوی ہے ۔ کہ اُن کے لئے جدید تعلیم کے ساتھ انصاف کرنا بڑا مشکل ہے ۔ اور جدید تعلیم پر چوٹ کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتے ۔ نواب محسنؔ الملک کی وفات پر مولانا شبلؔی نے جدید اور قدیم تعلیم پر جو اظہارِ رائے کیا تھا ۔ اُس کا حوالہ ہم دے چکے ہیں ۔ نواب وقارؔ الملک کی وفات پر مولینا شبلؔی تو زندہ نہ تھے ۔ ندوؔہ کی ترجمانی مولانا کے جانشین سیّد سلیماؔن ندوی نے کی ۔ وہ معارف میں لکھتے ہیں :۔

" یہ ہستیٔ گرانمایہ جس نے ہماری دُنیا کو ۲۸ر جنوری ۱۹۱۷ء کو الوداع کہا ۔ ہمارے

کار فرما قافلے کا آخری مسافر تھا۔ اس کے بعد وہ دَور جو انقلابِ ہند کے بعد شروع ہُوا تھا۔ ختم ہوگیا۔ وہ دَور جو انگریزی کالجوں کی کائنات نہیں۔ بلکہ بوریانشین مدارس کا نتیجہ تھا منتہی ہوگیا۔ وہ دَور جو قدیم تعلیم اور قدیم اخلاق کے نمونوں کو پیش کرتا تھا۔ منقطع ہوگیا! یعنی آئندہ ہماری قسمت کے مالک عربی مدارس کے شملے نہ ہوں گے۔ بلکہ انگریزی درس گاہوں کے ہیٹ اور جھبّے ہوں گے۔ اب مشرق مشرق کی قومیت پر حکومت نہیں کرے گا۔ بلکہ مغرب اب لیڈری اور رہبریٔ جمہور کے لئے جوشِ دل اور اخلاصِ عمل ضروری نہ ہوگا۔ بلکہ صرف ایک کامیاب عہدہ اور ایک عُمدہ سُوٹ فیاویلاہ علٰی فقید الاسلام ویا خیباہ للمسلمین!"

نواب محسن الملک کی وفات پر شبلی نے جو تبصرہ کیا۔ اور نواب وقار الملک کی وفات پر سید سلیمان ندوی نے جن خیالات کا اظہار کیا۔ اُن کی پشت پر تو ایک ہی جذبہ کارفرما ہے۔ لیکن اُن میں نہایت لطیف فرق ہے۔ اور اُن کو بغور پڑھنے سے ہم دیکھ سکتے ہیں۔ کہ ندوہ پارٹی میں جدید تعلیم کی مخالفت کس طرح روز بروز بڑھتی گئی۔ مولانا شبلی نے تو فقط ناقابل اعتراض نفظوں میں اس خفیفت کا اظہار کیا تھا۔ کہ قوم میں جدید تعلیم قدیم مدارس کے تعلیم یافتہ بزرگوں نے پھیلائی۔ اور اب تک قوم کی علمی راہنمائی وہی لوگ کر رہے ہیں۔ نئی نسل نے اس بارے میں کچھ نہیں کیا لیکن سید سلیمان کے زمانے تک نئی نسل میں بھی کچھ ایسے لوگ پیدا ہوگئے تھے۔ جو قوم کی علمی راہنمائی کر سکتے تھے۔ چاہئے تو یہ تھا۔ کہ سید صاحب کو اس صورتِ حالات سے خوشی ہوتی۔ کہ قوم کے ایک اہم طبقے سے مولانا شبلی کو جو شکائت تھی۔ وہ رفع ہوگئی۔ لیکن معلوم ہوتا ہے۔ کہ انہیں اب اس کا بھی رنج ہے۔ کہ جدید طبقے کے لوگ قوم کی علمی راہنمائی میں کیوں کوشاں ہیں ؏

مَیں ہُوا کافر تو وہ کافر مُسلماں ہوگیا

نواب مُحسن الملک اور نواب وقار الملک کے متعلق تو شاید کہا جائے کہ قدیم تعلیم کو

اُن پر بجا فخر تھا[1]۔ اور اُن کی وفات پر اگر مولانا شبلی اور سید سلیمان ندوی نے جدید تعلیم کے مقابلے میں قدیم تعلیم کی فوقیت جتائی۔ تو انہیں اس کا پُورا حق تھا۔ لیکن لُطف یہ ہے۔ کہ اقبال کا ذکر آتا ہے۔ تب بھی نئی تعلیم کی شکایتیں ہیں۔ اقبال کی تعریف کے پردے میں نئی تعلیم کی مذمت ہوتی ہے۔ سید سلیمان صاحب اقبال کی وفات پر لکھتے ہیں:۔

"کہنے کو تو ہم میں ملّت کے غمخواروں کی کمی نہیں۔ اور نہ امت کے دوستداروں کی قلت۔ مگر واقعہ یہ ہے۔ کہ نئی تعلیم نے اپنے ساٹھ ستر برس کے طویل عرصے میں دو ہی سچے مسلمان غمخوار پیدا کئے۔ ایک محمد علی مرحوم اور دوسرا اقبال مرحوم۔ دونوں مرحوموں پر خدا کی بڑی رحمت ہو۔ ان کے دلوں میں اسلام کا حقیقی سوز تھا۔ اور رسول صلعم کے ساتھ سچا عشق۔ نئے زمانے کی جھوٹی آب و تاب۔ اور نئے تمدن کی ظاہری چمک دمک سے ان کی آنکھیں خیرہ نہ تھیں۔ آفتاب اسلام کی ضیا باری کے مقابلے میں ان کے سامنے جدید تہذیب و تمدن اور زمانۂ حال کی تجدیدات کی نئی روشنی مہِ نخشب کے مصنوعی نور سے زیادہ وقعت نہیں رکھتی تھیں۔ خدا ان کی قبروں کو اپنے نور سے بھر دے!"

جدید تعلیم کی نسبت اربابِ ندوہ کی رائے جس طرح روز بروز زیادہ سخت ہوتی گئی۔ اس کی ایک دلچسپ مثال انگریزی پڑھانے کے متعلق ان بزرگوں کا طرزِ عمل ہے۔ شبلی ندوۃ العلما میں انگریزی سکھانے کے بڑے حامی تھے۔ اور اس کی خاطر اُنہوں نے اپنے رفقائے کار کی مخالفت بھی گوارا کی۔ لیکن اس مسئلے پر سید سلیمان ندوی کی رائے

---

[1] یہ کہنا ضروری ہے۔ کہ جدید تعلیم کے متعلق اُن کا یا دوسرے بزرگوں کا جن پر مولینا شبلی اور سید سلیمان صاحب کو اس قدر ناز ہے۔ ہرگز وہ معاندانہ نقطۂ نظر نہ تھا۔ جو شبلی کا اخیر عمر میں ہو گیا۔ یا اُن کے جانشینوں کا آج ہے۔ یہ بزرگ "دع ماکدر خذ ما صفا" کے اصُول پر پوری طرح عامل تھے۔ اور شائد اس اصول کی پیروی ہی اُن کی علمی اور اخلاقی ترقیوں کا صحیح سبب تھی۔

پڑھیں تو خیال ہوتا ہے۔ کہ اُن کے نزدیک انگریزی کی تعلیم ایک ایسا زہرِ ہلاہل ہے۔ جس کے چھُو جانے سے علم۔ تقدس اور مذہب رفو چکّر ہو جاتا ہے۔ وہ "معارف" کی ایک تازہ اشاعت میں تحریر فرماتے ہیں۔ "انگریزی خواں علما کی ضرورت روز بروز جیسی بڑھ رہی ہے۔ وہ تو معلوم ہے۔ لیکن مشکل یہ ہے۔ کہ علماء انگریزی خوان ہونے کے بعد عالم نہیں رہتے!"

انگریزی اور جدید تعلیم یافتہ طبقے کی نسبت اربابِ ندوہ کا جو طرزِ عمل ہے۔ وہی مغربی علما اور علم وفن کے اصولوں کے متعلق ہے۔ براؤن کے متعلق شبلی نے جو جلے کٹے فقرے لکھے تھے۔ اُن سے سب واقف ہیں۔ دوسرے مستشرقین اور علما کے بارے میں بھی مولانا کی رائے اس سے بہتر نہ تھی۔ اور آج "معارف" ان خیالات کا ترجمان بنا ہؤا ہے۔ یہ اختلاف ان بزرگوں کو فقط مغربی علما سے نہیں۔ بلکہ مغربی علم وفن کے بنیادی اصولوں سے بھی ہے۔ "معارف" میں آئے دن ان اصولوں کی ایک تاریک سی تصویر پیش کی جاتی ہے۔ اور ناظرین کو ان سے محترز رہنے کی تلقین ہوتی ہے۔ سب سے زیادہ اعتراض جس بات پر ہے۔ وہ تحقیق وتنقید میں قیاس کی اہمیت ہے۔ بعض مغربی علماء تحقیق و تاریخ نویسی کے ضمن میں جو مضحکہ خیز قیاس آفرینیاں کرتے ہیں۔ ان سے سب واقف ہیں۔ اور بلند پایہ مغربی علمی حلقے بھی اسے عزت کی نظر سے نہیں دیکھتے۔ لیکن اس حقیقت کے وہ ضرور معترف ہیں۔ کہ علم وفن میں قیاس کو بالکل جواب دے دینے سے علمی ترقی کا راستہ بند ہو جاتا ہے۔ اور یہ بھی صحیح ہے۔ کہ بسا اوقات ایک محتاط اور دیانتدار واقفِ فن کا قیاس ایک غیر تربیت یافتہ اور مبالغہ کے دلدادہ راوی کی شہادت سے بھی زیادہ قابلِ اعتماد ہوتا ہے۔ "معارف" قیاس کا

[1] ایک اور جگہ مولانا نے انگریزی اور علم جغرافیہ کی تعلیم کا یوں تمسخر اڑایا ہے۔ "اسکول تک ہم کو کیا سکھایا جاتا ہے؟ ایک ایسی بدیسی زبان جس کے ذریعے سے ہم اپنے افسروں سے گفتگو کر سکیں۔ اور ان کے لئے ان کی زبان میں مواد فراہم کر کے رکھ سکیں۔ اور جغرافیہ جس میں زیادہ تر ہم یہ جانیں کہ وہ دُنیا کے کون کون سے براعظم، جزیرے اور ٹاپو ہیں، جہاں وہ علم لہراتا ہے۔ جس کا آفتاب دُنیا سے کبھی نہیں ڈوبتا۔"

بڑا مخالف ہے۔ اس کے نزدیک قیاس خواہ وہ کس قدر قوی دلائل پر مبنی ہو۔ صحیح نہیں۔ اور جو نظریے اس کی بنا پر قائم کئے جائیں۔ انہیں یہ قابل اعتماد نہیں سمجھتا +

قوم کی علمی زندگی میں مولانا شبلیؔ اور سیّد سلیمانؔ ندوی کا جو بلند مرتبہ ہے۔ اور قوم پر اُن کے جو جلیل القدر احسانات ہیں۔ اُن کا خیال کرتے ہوئے اُن کے کاموں پر کڑی تنقید کرنا' اور اُن کے وہ پہلو نمایاں کرنا' جن کی طرف اُن کے مداحوں کی نظر نہیں جاتی۔ بظاہر بڑی بے دردی اور احسان فراموشی ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے۔ کہ جب تک ان پہلوؤں کا غائر مطالعہ نہ کیا جائے۔ ہم ان اثرات کا اندازہ نہیں کرسکتے۔ جو شبلیؔ اور اُن کے رفقائے کار نے قوم کی علمی اور ذہنی زندگی پر ڈالے۔ اور قوم کی ذہنی تاریخ اور شبلیؔ کے کام کی اہمیت سمجھنے کے لئے ان اثرات کا مطالعہ ضروری ہے +

ہم بیان کرچکے ہیں۔ کہ علی گڑھؔ کالج نے کوئی قابلِ ذکر علمی روایات قائم نہیں کیں۔ اور قوم کا تعلیمی مرکز ہونے کے باوجود یہاں کوئی اہم علمی یا ادبی ادارہ قائم نہیں ہوا۔ اس کمی کی وجہ سے جہاں قوم کو بڑا نقصان رہا۔ وہاں علی گڑھؔ والوں کو بھی اس کی سزا بہت سخت ملی ہے۔ اس کمی کی وجہ سے قوم کا ذہنی مرکز علی گڑھ کے باہر منتقل ہوگیا۔ اور چونکہ اس کی باگ ڈور ایسے ہاتھوں میں رہی۔ جو سرسیّد کے مخالف تھے۔ اس لئے سرسیّد کے مقاصد اور اصول بھی قوم میں نامقبول ہوگئے۔ لطف یہ ہے۔ کہ یہ اہم تبدیلی صرف قوم کے اسی طبقے میں رُونما نہیں ہوئی۔ جو علی گڑھؔ سے بے تعلق تھا۔ بلکہ علی گڑھؔ خود اس سے متاثر ہُوا۔ اور وہاں کے بعض با اثر طلبا نے وہی خیالات اخذ کرلئے۔ جو شبلیؔ۔ ابو الکلامؔ آزاد۔ سیّد سلیمانؔ ندوی اور اُن کے دوسرے رُفقا کے تھے۔ اور سرسیّد کے خیالات کی عین ضد تھے۔ یہ اثر آج کسی قدر کم ہو رہا ہے۔ لیکن حال ہی میں کئی کتابیں ایسے لوگوں کی لکھی ہوئی شائع ہوئی ہیں۔ جنہیں علی گڑھؔ سے مدتوں تعلق رہا ہے۔ اور جنہیں علی گڑھ کا ترجمان سمجھنا چاہیئے۔ لیکن حقیقتاً یہ کتابیں سرسیّد کے نقطۂ نظر کا اظہار نہیں۔ بلکہ شبلیؔ کے خیالات کا اعادہ ہیں۔ اور انہیں پڑھ کر

غنیؔ کا مشہور شعر یاد آتا ہے ؎

غنیؔ روزِ سیاہِ پیرِ کنعاں را تماشا کُن
کہ نورِ دیدہ اش روشن کُند چشمِ زلیخا را!

ممکن ہے۔ قوم اور خود علی گڑھ کے نقطہ منظر میں اس عظیم تبدیلی کی وجہ سرسیدؔ کے مقاصد کے اصولی نقائص ہوں۔ لیکن شاید ایک اہم وجہ یہ بھی ہے۔ کہ "حیاتِ جاوید" کے بعد سرسیدؔ کے نقطۂ نظر کو سمجھنے کی کوئی صحیح کوشش ہی نہیں ہوئی۔ اور قوم کی ذہنی زندگی کی باگ اُن لوگوں کے ہاتھ میں رہی ہے۔ جو سرسیدؔ کے مخالف تھے ؛

مولانا ابوالکلام آزاد

علمائے دیوبندؔ کے مذہبی خیالات اور سرسیدؔ کے مذہبی عقائد میں بُعد المشرقین تھا۔ اور دیوبند میں جو طریقۂ تعلیم رائج ہُوا۔ وہ علی گڑھؔ کے تعلیمی نظام کی عین ضد تھا۔ ان وجوہات کی بنا پر خیال ہو سکتا ہے۔ کہ دیوبندؔ علی گڑھ کا سب سے زبردست اور پُرجوش مخالف ہوگا۔ لیکن حقیقتاً ایسا نہیں ہُوا۔ دیوبندؔ اور علی گڑھؔ کے اختلافات اصولی اور بُنیادی تھے۔ لیکن ان اختلافات نے عملی مخالفت کا رنگ نہیں اختیار کیا۔ اس کی وجہ دیوبندؔ کے اربابِ حل و عقد کا عام طرزِ عمل ہے۔ اسلام کے بہترین علماء صلحا کی طرح ان بزرگوں کا عام طریقِ کار یہ ہے۔ کہ وہ مخالفتوں اور مناظروں میں اپنا وقت تلف نہیں کرتے۔ خاموشی سے اپنا کام کئے جاتے ہیں۔ اور اس بات کے منتظر رہتے ہیں۔ کہ اُن کے کام کے عملی نتائج دیکھ کر مخالفین اُن کے طریقِ کار کے قائل ہو جائیں۔ علی گڑھؔ کے معاملے میں بھی اُن کا طرزِ عمل یہی رہا ہے۔ علی گڑھؔ سے اُن کے جو اختلافات تھے۔ وہ سب کو معلوم ہیں۔ لیکن اُنہوں نے فریقِ ثانی کو نیچا دکھانے کے لئے کبھی اوچھے ہتھیار استعمال نہیں کئے ؛

اس کے علاوہ چونکہ علی گڑھ اور دیوبندؔ کے اختلافات اصولی تھے۔ اور کسی بغض و عناد یا رشک و حسد پر مبنی نہیں تھے۔ اس لئے ان میں تلخی کبھی نہیں آئی۔ حالانکہ یہ اختلافات بہت

گھرے تھے۔ اس کے برعکس دیوبند اور علی گڑھ قوم کی دو مختلف ضروریات (دینی اور دنیوی تعلیم) کو پورا کرتے تھے۔ اس لئے ایک وقت ایسا بھی آیا۔ جب انہوں نے تقسیم کار کا اصول اختیار کیا۔ اور اپنے مختلف مقاصد کے حصول کے لئے ایک دوسرے سے اشتراکِ عمل بھی کیا۔ "انجمن موتمر الانصار" کے سلسلے میں جسے مولانا محمود الحسن نے قائم کیا تھا" علی گڑھ کالج سے یہ معاہدہ بھی ہوا تھا۔ کہ انگریزی خواندہ طلبا جو تبلیغ کا شوق رکھیں۔ وہ دار العلوم دیوبند ہیں جاکر علوم اسلامیہ حاصل کریں۔ دار العلوم دیوبند اس کا خاص انتظام کرے گا۔ اسی طرح علی گڑھ کالج ان طلبا کو خاص انتظام کے ساتھ انگریزی کی تعلیم دے گا۔ جو دار العلوم دیوبند سے فارغ ہوکر علی گڑھ کالج جائینگے"۔

شبلی نے اخیر عمر میں سرسید اور علی گڑھ تحریک کے متعلق جو رویہ اختیار کیا۔ وہ دیوبند کے طرزِ عمل سے مختلف تھا۔ اور اس ہیں تلخی اور عملی مخالفت کا رنگ ضرور نمایاں تھا۔ شبلی نے مرنے سے دو چار سال پہلے وقتی مباحث پر جو نظمیں لکھی ہیں۔ اُن میں شاید ہی کوئی بُرائی ہوگی۔ جو سرسید اور اُن کے رفقا سے منسوب نہ کی گئی ہو۔ اور علی گڑھ تحریک کا شائد ہی کوئی پہلو ہوگا۔ جس ہیں اُنہوں نے نقص نہ نکالے ہوں۔ ان واقعات کو دیکھتے ہوئے شبلی کو علی گڑھ تحریک کا سب سے بڑا مخالف خیال کیا جا سکتا ہے۔ اور یہ صحیح ہے کہ علی گڑھ کی کامیاب عملی مخالفت کی بنیاد بیشتر انہی نے قائم کی۔ سب سے پہلے انہیں اس حقیقت کا پوری طرح احساس ہوا۔ کہ ایک صاحبِ قلم ہزاروں لوگوں کے دلوں پر حکومت کرسکتا ہے۔ اور ان کے خیالات بدل سکتا ہے۔ اُنہوں نے اپنا قلم سرسید اور ان کے طریقِ کار کی مخالفت کے لئے استعمال کیا۔ لیکن چند ایسے اسباب بھی تھے۔ جن کی وجہ سے وہ اس مخالفت میں پوری طرح کُھل نہیں سکتے تھے۔ ایک تو وہ اپنے "زود اشتعال جذبات" کے باوجود بہت تک مصلحت پسند تھے۔ اور علی گڑھ کی مخالفت کا کُھلم کھلا اعلان انہوں نے اس وقت کیا جب اندرونِ ہند اور بیرونِ ہند کے چند واقعات کی وجہ سے عام مسلمانانِ ہند سرسید کی پالیسی

سے منحرف ہو گئے ۔ اور خود نواب وقار الملک سیکرٹری علی گڑھ کالج نے اس سے تجاوز کرنا ضروری سمجھا۔ شبلی نے اس موقعے پر سرسید اور اُن کے کاموں کے متعلق اپنے دلی خیالات کا اظہار کیا۔ اور اپنی مشہور اُردو نظمیں لکھیں ۔ لیکن اس کے بعد انہیں بہت دن جینا نصیب نہ ہُوا ۔ اور وہ اس مخالفت کی تکمیل نہیں کر سکے ؛

اس کے علاوہ شبلی نے کئی برس سرسید کی صحبت میں گزارے تھے ۔ سرسید کے عقائد اور خیالات سے انہیں اختلاف تھا ۔ لیکن ان کے طریقِ کار اور ٹھوس کاموں کی عزت ان کے دل میں تھی ۔ وہ جانتے تھے ۔ کہ سرسید پر نکتہ چینی کا صحیح حق اسی شخص کو حاصل ہو سکتا ہے ۔ جو عملی کاموں میں ان سے سبقت لے جائے ۔ خالی لفاظی اور جوش و خروش سے انہیں نفرت تھی ۔ اور یہ احساس کہ ٹھوس عملی کاموں میں سرسید کے مخالفین کا پلہ بہت ہلکا ہے انہیں انتہائی مخالفت سے باز رکھتا ؛

سرسید اور اُن کے کاموں کی سب سے مکمل اور کامیاب مخالفت ایک قابل مگر پر جوش نوجوان نے کی ۔ جس نے اپنی زندگی کا ایک اہم حصہ شبلی کی صحبت میں گزارا تھا ۔ اور جسے طبعاً سرسید سے شبلی کے مقابلے میں کہیں زیادہ حقیقی اختلافات تھے ۔ یہ نوجوان آگے چل کر مولانا ابوالکلام آزاد کے نام سے مشہور ہُوا ؛

مولانا ابوالکلام آزاد جن کا اصل نام احمد اور تاریخی نام "فیروز بخت" ہے ۔ ۱۸۸۸ء (۱۳۰۵ھ) بمقام مکہ معظمہ پیدا ہوئے ۔ آپ کے والد ایک صُوفی بزرگ مولوی خیر الدین قادری نقشبندی تھے ۔ اضلاع بمبئی و کلکتہ میں اُن کے ہزار ہا مُرید پائے جاتے ہیں ۔ اُن کا تعلق دہلی سے تھا ۔ اور مولانا کا ننھیال مدینہ منوّرہ ہے ۔ چنانچہ مولانا کو اپنے گھر ہی میں وہ تعلیم حاصل ہوئی ۔ جو اُن کا مابہ الامتیاز ہونے والی تھی ۔ عربی قریب قریب اُن کی مادری زبان تھی ۔ اُردو والد سے وراثتاً ملی ۔ ان دونوں زبانوں میں کمال حاصل کرنے کے بعد فارسی کی قابلیت پیدا کرنا مشکل نہ تھا ۔ چنانچہ عربی ۔ فارسی اور اُردو تینوں پر اُن کو پُورا عبُور ہے ؛

مولانا کی ایک خصوصیت اُن کی اٹھان ہے۔ اُن کا شجرِ علم اُس وقت پھل لایا۔ جب دوسروں کے ہاں ابھی بُور لگنا بھی شروع نہیں ہُوا۔ اردو اور عربی کی واقفیت تو موروثی تھی۔ اور ایک خاص طرزِ تحریر خدا نے طبعاً عطا کی تھی۔ سترہ سال کی عمر میں آپ "الندوہ" جیسے اہم رسالے کے ایڈیٹر ہو گئے۔ کچھ دیر ندوہ مقیم رہے۔ یہ قیام آپ کے لئے بہت مفید رہا۔ مولانا شبلی آپ میں بڑی دلچسپی لیا کرتے تھے۔ آپ کی طرزِ تحریر اور مذہبی جوش کا بڑا احترام کرتے تھے۔ اور یہ امر قرینِ قیاس ہے کہ شبلی نے آپ کے سیاسی اور اجتماعی معتقدات پر بھی گہرا اثر ڈالا۔ ندوہ کے سال ڈیڑھ سال کے قیام میں مولانا کو اپنی واقفیت وسیع کرنے اور اپنی خامیاں درست کرنے کا موقع ملا۔ چنانچہ مولانا شبلی ایک خط میں لکھتے ہیں۔ "آزاد کو تو آپ نے "مخزن" وغیرہ میں ضرور دیکھا ہوگا۔ قلم وہی ہے۔ معلومات یہاں رہنے سے ترقی کر گئے ہیں۔" ندوہ کے قیام کے بعد آپ غالباً انیس ۱۹ سال کی عمر میں پنجاب کے قدیم اور معزز اخبار "وکیل" کے ایڈیٹر ہو گئے۔ اس سلسلے میں آپ کی طرزِ تحریر اور بھی پختہ ہو گئی۔ حجاز اور بغداد کے قیام و سفر نے آپ کو وہاں کی علمی اور سیاسی کوششوں سے واقف کر دیا۔ اس کے علاوہ آپ بالعموم کلکتہ مقیم رہے ہیں۔ جو ۱۹۱۲ء سے پہلے ہندوستان کا دارالخلافہ تھا۔ اس سے آپ کو سیاسی اور علمی حالات سے ملک کے دوسرے حصوں میں رہنے والوں سے زیادہ واقفیت ہوتی رہی۔ اور چونکہ اِن دنوں یہ شہر اس شورش کا مرکز تھا جو تقسیم بنگال کے خلاف برپا ہو رہی تھی۔ اس لئے آپ کو بھی اِس شورش اور اس کے لیڈروں کے طریقِ کار سے بخوبی واقف ہونے کا موقعہ ملا۔

الہلال مولانا ابوالکلام آزاد کی زندگی کا اہم ترین دن وہ تھا۔ جب جون ۱۹۱۲ء میں اُنھوں نے کلکتہ سے اخبار "الہلال" جاری کیا۔ "کامریڈ"۔ "زمیندار" اور "مُسلم گزٹ" کے ساتھ اس اخبار کو مسلمانانِ ہند کے خیالات کی تشکیل میں بڑا دخل رہا ہے۔ اور مولانا کی کامیابی اور قومی خدمت اسی اخبار اور اس کے جانشین "البلاغ" ہی سے

جانی جاسکتی ہے ؎

"الہلال" کا سب سے بڑا کارنامہ یہ تھا کہ اس نے علی گڑھ تحریک کے مختلف پہلوؤں اور مختلف نتائج پر اس مؤثر طریقے سے نکتہ چینی کی کہ یہ تحریک اور اس کے راہنماؤں کا طریقِ کار قوم کے بااثر حلقوں میں ایک مدت کے لئے غیر مقبول ہوگیا ؎

علی گڑھ تحریک کے کئی پہلو تھے۔ تعلیمی۔ ادبی۔ مذہبی۔ سیاسی۔ اور تمدنی۔ "الہلال" نے ہر پہلو سے سرسید اور اس کے رفقائے کار کی مخالفت کی۔ اور بہت حد تک کامیاب رہا۔ علی گڑھ تحریک کی ایک نمایاں خصوصیت اس کا "مقامی" نقطۂ نظر تھا۔ اس کا مقصد ہندوستانی مسلمانوں کی علمی اور اقتصادی پستی کو دُور کرنا تھا۔ باہر کے مسلمانوں سے اسے کوئی تعلق نہ تھا۔ مولانا ابوالکلام آزاد اس "مقامی" نقطۂ نظر کے سخت مخالف تھے۔ ان کے خیال میں احیائے اسلام کا واحد ذریعہ پان اسلامک تحریک تھی۔ وہ "الہلال" جاری کرنے کے تھوڑی دیر بعد ایک اہم خط میں خواجہ حسن نظامی کو لکھتے ہیں۔ "علی گڑھ کی تحریک نے مسلمانوں کو عضوِ شل بنا دیا ..... آج کوئی وطنی یا مقامی تحریک مسلمانوں کو فائدہ نہیں پہنچا سکتی۔ خواہ وہ یونیورسٹی کا افسانہ ہی کیوں نہ ہو۔ جب تک تمام دُنیائے اسلام میں ایک بین الاقوامی اور عالمگیر تحریک نہیں ہوگی۔ زمین کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے چالیس کروڑ مسلمانوں کو کیا فائدہ پہنچا سکتے ہیں[1]"۔

اس عام نصب العین کے اختلاف کے علاوہ مولانا ابوالکلام آزاد اور علی گڑھ پارٹی کے سیاسی طریقِ کار میں بھی بڑا اختلاف تھا۔ سرسید حکومت کے ساتھ اشتراکِ کار کو ہندوستانی مسلمانوں کے لئے مفید سمجھتے تھے۔ اور اس معاملے میں مولانا آزاد کا جو نقطۂ نظر ہے وہ ساری دنیا جانتی ہے ؎

سرسید اور مولانا آزاد کے درمیان جو بنیادی اختلافات تھے۔ وہ سیاسیات ہی تک

---

[1] اتالیق خطوط نویسی۔ از خواجہ حسن نظامی۔

محدود نہ تھے ۔ بلکہ علی گڑھ تحریک کے قریب قریب ہر پہلو پر حاوی تھے ۔ سر سید جدید علم الکلام کے بانی تھے ۔ اور جدید علم الکلام پر سب سے زور دار اعتراضات "الہلال" کے صفحات اور مولینا آزاد ہی کی تصانیف میں ملیں گے ۔ سر سید نے اُردو میں سادہ اور آسان نثر کو رائج کیا تھا۔ مولینا ابو الکلام آزاد کی خاص طرزِ تحریر اس آسان نثر کی عین ضد تھی ۔ ادبی، مذہبی اور سیاسی کوششوں کے علاوہ سر سید کا سب سے بڑا کام ان کی تعلیمی پالیسی تھی ۔ مولینا ابو الکلام آزاد اس کے بھی معترف نہ تھے ۔ علی گڑھ یونیورسٹی کے متعلق ان کے جو خیالات تھے ۔ ان کا اندازہ مندرجہ بالا خط کے اقتباس سے ہوسکتا ہے ۔ محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے متعلق بھی ان کی تحریریں حقارت آمیز ہوتی تھیں ۔ یہ صحیح ہے کہ وہ چند بار محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس میں شریک ہوئے ۔ لیکن وہاں بھی اُنہوں نے سر سید کی تعلیمی پالیسی کی مخالفت کی ۔ اور بالآخر منتظمین کو کانفرنس کے دروازے اِن پر بند کرنے پڑے ۔ بعض اوقات تو اس مخالفت میں انہوں نے اس درجہ غلو کیا کہ حیرت ہوتی ہے ۔ "الہلال" کی ایک تحریر سے خیال ہوتا ہے کہ شاید مولینا اشاعتِ تعلیم کو بھی اسی طرح غیر ضروری بلکہ مضر سمجھتے تھے جس طرح علما کے "شغلِ تکفیر" کو ! وہ "الہلال" کی ایک اشاعت میں کلام مجید کے انگریزی ترجموں کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں ۔ "قرآن کریم کا اب تک ایک انگریزی صحیح ترجمہ بھی شائع نہ ہوسکا ۔ اور تقسیم تو شاید سو نسخے بھی نہ ہُوئے ہونگے ۔ تعلیم یافتہ اصحاب کو مسئلۂ تعلیم سے اور علما کو مسئلۂ تکفیر سے فرصت نہیں ملتی ۔ قرآن کو شائع کرے ۔ تو کون کرے ؟"

ہم کہہ چکے ہیں کہ سر سید کا سب سے بڑا کام ہندوستانی مسلمانوں میں جدید تعلیم کی اشاعت تھی ۔ اسی کی خاطر انہوں نے علی گڑھ کالج قائم کیا ۔ اسی کو مقبول کرنے کے لئے اُنہوں نے ایجوکیشنل کانفرنس کی بُنیاد ڈالی ۔ لیکن جو لوگ اس تعلیم سے بہرہ ور ہوئے ہیں ۔ ان کے متعلق مولینا ابو الکلام آزاد کی رائے پڑھیں ۔ تو خیال ہوتا ہے ۔ کہ ان کے نزدیک جدید تعلیم سے زیادہ مُضر اور نقصان دہ چیز کوئی نہیں ۔ "الہلال" کے ایک نمبر میں جدید تعلیم یافتہ طبقے کے

متعلق لکھتے ہیں :-

"ہمارے دوستوں کا بھی یہی حال ہے۔ ان کا سرمایۂ علم و دانش یورپ کی اسمی و سطحی تقلید سے زیادہ اور کچھ نہیں۔ تاہم جن چیزوں میں وہ اپنے ائمۂ ہدیٰ کی تقلید کرنا چاہتے ہیں۔ انہی میں اولیں شے اجتہاد بھی اور ضرور تھا کہ اس تقلیدِ مجتہدانہ کا سفر اسی منزل سے شروع ہوتا۔ قینچی ہاتھ میں ہو۔ تو خواہ مخواہ جی چاہنے لگتا ہے۔ کہ کسی چیز کو تراشئے۔ اس اجتہاد کی قینچی ہمارے چابک دست دوستوں کے ہاتھ آگئی۔ تو بے کار بیٹھا نہ گیا۔ یورپ کے علم و عمل کے سر رشتوں پر تو کیا چلتی۔ کہ وہیں کے کارخانے کی بنی ہوئی تھی۔ بس اپنے یہاں کی جو چیز سامنے آگئی۔ وہی بلا تامل آلۂ مشق بنی۔ پھر اس کی روانی بے پناہ اور اس کی کاٹ بے روک تھی۔

"سب سے پہلے مشرقی علوم و فنون، تہذیب و تمدن اور اخلاق و ادب قومی سے اس کی آزمائش شروع ہوئی۔ اور تھوڑی ہی دیر میں سیکڑوں برسوں کے صفحات و اوراقِ قدیمہ پرزے پرزے تھے۔

"پھر غریب مذہب کی باری آئی۔ یہ کپڑا دبیز تھا۔ اس لئے مقراضِ اجتہاد کی روانی بھی زیادہ تیز و شدید تھی۔ پھر اس کا بھی وہی حشر ہوا۔ جو پہلی آزمائش کا ہو چکا تھا۔ اور جو کچھ باقی رہ گیا ہے۔ نہیں معلوم اور کتنی گھڑیوں کا مہمان ہے۔

"کچھ دنوں سے یہ قینچی زنگ آلود سی ہوگئی ہے۔ مگر ڈرتا ہوں۔ کہ اب ایک نئی آزمائش شروع ہونے والی ہے۔ اور مذہب و علم کے بعد "زبان" کا میدان جولانگہِ اجتہاد بننے والا ہے[1]۔"

---

[1] اس کے آگے مولینا نے "ایک نیا فتنۂ لغویہ" کا عنوان قائم کر کے اصل مطلب سے بحث کی ہے مولینا کے اس مضمون کی وجہ تحریر ایک بحث تھی جو ان کے اور مولینا عبدالماجد دریابادی کے درمیان "Pain and pleasure" کے اردو ترجمے پر شروع ہو گئی تھی۔ مولینا دریابادی نے اپنی مشہور کتاب "فلسفۂ جذبات" کے چند اجزا "الہلال" میں شائع کرائے۔ اور ان میں مندرجہ بالا اصطلاحات کا ترجمہ "حظ و کرب" کیا مولینا ابوالکلام

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر ملاحظہ ہو)

نئے تعلیم یافتہ طبقے کی برائیاں بیان کرنے سے مولانا کا دل بالکل سیر نہیں ہوتا۔ "الہلال" میں جابجا اس طبقے کے نقائص گنائے ہیں۔ ایک مضمون میں جو در اصل بیگم صاحبہ بھوپال کی کتاب "تندرستی" پر تبصرہ ہے۔ اس گروہ کے متعلق لکھتے ہیں:۔

"مَیں جو نئے تعلیم یافتہ حضرات کا ہمیشہ شاکی رہتا ہوں۔ تو اس کی بڑی وجہ یہ ہے۔ کہ اُن کی ہر گذشتہ خوبی کو ان سے دور پاتا ہوں۔ اور اُس کی جگہ کوئی نئی خوبی مجھے نظر نہیں آتی۔ ہماری گذشتہ مشرقی معاشرت' اوضاع و اطوار' اخلاق و عادات' طریق بود و ماند یہ سب کے سب اُنہوں نے ضائع کر دئے۔ اخلاق و تمدن کے بعد مذہب کا نمبر آیا۔ اور جدید تعلیم و تہذیب کے مندر پر مذہب کی قربانی بھی چڑھائی گئی۔ خیر مضائقہ نہیں۔ خرید و فروخت کا معاملہ ہے اور متاعِ بے بہا ہاتھ آئی ہو۔ تو دل و جاں تک کو اُس کی قیمت میں لگا دیتے ہیں۔ لیکن سوال یہ ہے۔ کہ سب کچھ دے کر وہ کونسی چیز ہے۔ جو ہاتھ آئی؟

نے مندرجہ بالا مضمون "الفتنۃ اللغویہ" کے عنوان سے ترتیب دیا۔ اس میں ایک طول طویل تمہید کے بعد مولانا عبد الماجد کے متعلق لکھا۔ "لیکن مجھ کو نہایت افسوس اور رنج ہے۔ کہ 'حظ و کرب' کے معاملے میں وہ ایک نہایت سخت غلطی میں مبتلا ہو گئے ہیں۔ اور بجائے اس کے کہ جو مشورہ انہیں دیا گیا تھا۔ اس کو تسلیم کر لیتے۔ محض لاحاصل بحث و مناظرہ میں پڑ گئے ہیں۔ حالانکہ یہ معاملہ اُن کے بس کا نہ تھا۔ نہ ان کو اس بارے میں معلومات حاصل ہیں۔ اور نہ اُن کے مذاق و مطالعہ کی یہ چیز ہے۔ اُن کو انگریزی سے ترجمہ کرنا چاہیئے اور بس!..... مَیں ان کو یقین دلاتا ہوں کہ یہ ایک 'فتنۂ لغویہ' ہے۔ جس کی اشاعت کا بار وہ اپنے سر لے رہے ہیں"۔ مولانا نے "الفتنۃ اللغویہ" کے عنوان سے جو مضمون لکھا۔ وہ ان کے زورِ قلم کا بڑا دلچسپ نمونہ ہے۔ لیکن اس سے یہ بات بھی دیکھی جا سکتی ہے۔ کہ مولانا جدید تعلیم یافتہ طبقے پر نکتہ چینی کرتے وقت معمولی اور جائز باتوں کی مخالفت بھی بڑی شدت سے کرتے تھے۔ دو لفظوں کے ترجمے کے متعلق مولانا عبد الماجد کا اختلاف آخر اتنا سنگین جرم نہ تھا۔ کہ اسے ایک بڑا فتنہ قرار دیا جائے۔ لیکن یہ مولانا کا زورِ قلم تھا۔ جس نے ؏ 'اتنی سی بات تھی جسے افسانہ کر دیا'

"علم؟ نہیں۔ اخلاق؟ نہیں۔ تہذیب و معاشرت؟ نہیں۔ ایک پوری انگریزی زندگی؟ نہیں۔ ایک اچھی مخلوط معاشرت؟ یہ بھی نہیں! پھر یہ کیا بدبختی ہے۔ کہ جیب اور ہاتھ دونوں خالی ہیں؟

آئندہ و گذشتہ تمنّا و حسرت است
یکُ کاشکے 'بود کہ بصد جا نوشتہ ایم!"

سرسید کے کاموں اور جدید تعلیم یافتہ طبقے کے متعلق مولٰینا ابوالکلام آزاد کے جو خیالات ہیں ان کے حسُن و قبح پر بحث کرنے کی یہاں گنجائش نہیں۔ لیکن مندرجہ بالا سطور سے اُس اختلاف کا اندازہ ہوسکے گا۔ جو مولٰینا کو سرسید کی قریباً ہر بات سے ہے۔ اور جس نے "الہلال" کو علی گڑھ کا سب سے با اثر مخالف بنا دیا ۔

مذہبی خدمات

مذہبی نقطۂ نظر سے مولٰینا ابوالکلام آزاد کا سب سے اہم کام جو ہندوستانی مُسلمانوں کی مذہبی تاریخ میں ہمیشہ یادگار رہے گا۔ جدید علم کلام کی تردید و اصلاح ہے۔ سرسید کے نومعتزلہ عقائد سے مسلمان کبھی خوش نہ تھے۔ لیکن شاید اس کا مُستقل سدِ باب مولٰینا نے ہی کیا۔ یہ صحیح ہے۔ کہ سرسید کی زندگی میں اور اُن کی موت کے بعد کئی عالموں نے اُن کے خیالات کی تردید میں کتابیں لکھیں۔ مولٰینا نذیر احمد نے بھی مذہب کی تجدید و اصلاح کے لئے ایک مستقل سلسلۂ تصانیف جاری کر رکھا تھا۔ لیکن مولٰینا ابوالکلام آزاد کا کام ان سب سے اہم تھا۔ قدیم علما کو خدا نے وہ زوردار قلم نہ دیا تھا۔ جو مولٰینا ابوالکلام آزاد کے ہاتھ میں تھا۔ اس کے علاوہ ان کی معلومات نئے مسائل کے متعلق نسبتاً کم تھیں۔ اور استدلال کے طریقے رسمی اور بے جان تھے۔ ان میں سے مولٰینا نذیر احمد کی کتابوں کو ہم سب سے بہتر سمجھتے ہیں۔ اور ہمارا خیال ہے۔ کہ "الحقوق والفرائض"۔ "اجتہاد" اور دوسری کتب کی تعریف میں عام علما نے کسی قدر بخل سے کام لیا ہے۔ لیکن مولٰینا ابوالکلام آزاد کی تصانیف کا مرتبہ مولٰینا نذیر احمد کی کتابوں سے بہت بلند ہے۔ زوردار طرزِ تحریر کے

علاوہ جس میں دلائل کی کمی ساحرانہ طرزِ تحریر سے پوری ہو جاتی تھی۔ مولینا ابوالکلام جدید علمِ کلام کی اصلاح کے لئے خاص طور پر موزوں تھے۔ وہ خود تشکک کی منزل سے گزر چکے تھے۔ اور ذاتی تجربے سے جانتے تھے۔ کہ ہر چیز کو تشکک و تردد کی نظر سے دیکھنے، اور ہر عقیدے کو مادیت اور منطق کے ترازو میں تولنے کا نتیجہ شک میں اضافے اور بے چینی اور بے اعتمادی کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ "جن نام نہاد علوم کا ماحصل خود ظلمتِ ظن و شک اور کورئے وہم ورائے سے زیادہ نہیں۔ وہ مریضانِ یقین و اعتقاد کے لئے کیونکر نسخۂ شفا ہو سکتے ہیں"! دوسرے وہ اسلام کی تاریخ سے خوب واقف تھے۔ اور جانتے تھے۔ کہ جب قدیم علمِ کلام شک وشبہ کا ازالہ کرنے میں کسی طرح کامیاب نہ ہُوا۔ تو نیا علم کلام کس کام آئے گا۔ چنانچہ انہوں نے لکھا۔ "یاد رکھو کہ تمام طوائفِ متکلمین فلسفۂ قدیمہ کے مقابلے میں بھی ناکام رہے تھے۔ اور آج نام نہاد فلسفۂ جدید کے مقابلے میں بھی اسی طرح ناکام رہیں گے۔ اُس وقت بھی صرف اصحاب حدیث و طریق سلف ہی کامیاب و منصور ہوئے تھے۔ اور آج بھی اس میدان میں بازی انہیں کے ہاتھ ہے۔ فقہا و متکلمین میں سے آج تک کوئی اس میدان کا مرد نہیں اُٹھا ؎

کامل اس فرقۂ زہاد سے اُٹھا نہ کوئی
کچھ ہوئے تو یہی رندانِ قدح خوار ہوئے"

علمِ کلام کی مخالفت کے علاوہ دوسرا اہم کام جو مولینا ابوالکلام آزاد نے کیا۔ وہ قرآن مجید کا غائر مطالعہ اور اس کی وسیع اشاعت ہے۔ قرآن مجید کی صحیح اشاعت ہندوستان میں شاہ ولی اللہؒ کے فارسی ترجمے سے شروع ہوئی۔ ان کے صاحبزادوں نے اردو ترجمے کر کے اس اشاعت کو اور بھی آسان کر دیا۔ اُن کے بعد اس کارِ خیر کی تیسری اہم کڑی مولینا نذیر احمد کا "ترجمۃ القرآن" ہے۔ یہ ترجمہ شاہ عبدالقادرؒ اور شاہ رفیع الدینؒ کے ترجموں سے زیادہ بامحاورہ اور ادبی خوبیوں کا حامل تھا۔ اور اس کی اشاعت سے وقت کی ایک بڑی ضرورت کسی حد تک پوری ہوئی۔ ۱۹۱۲ء تک یعنی جب "الہلال" جاری ہوا۔ اس کے قریباً باون ہزار نسخے ملک میں

فروخت ہو چکے تھے۔ مولٰینا نذیر احمد کے بعد دوسرے بزرگوں نے بھی کلام مجید کے ترجموں پر توجہ کی۔ اور ۱۹۱۲ء میں مذکورہ بالا تین ترجموں کے علاوہ مرزا حیرت، مولوی عاشق الٰہی، مولوی فتح محمدؐ جالندھری، اور مولٰینا عبدالحق حقانی کے اُردو ترجمے بازار میں ملتے تھے۔ ان ترجموں کی مانگ سے ظاہر ہے۔ کہ مُلک میں اس وقت کلام مجید سمجھنے کی ضرورت عام طور پر محسوس کی جارہی تھی۔ لیکن اس کے باوجود ارشادات قرآنی کو قوم کی ذہنی اور اجتماعی زندگی کا جزو بنانے کی کوئی خاص کوشش نہ ہوئی۔ یہ کمی "الہلال" نے پوری کر دی۔ "الہلال" میں کلام مجید کے مختلف پہلوؤں اور مختلف حصّوں پر حکیمانہ تبصرہ ہوتا۔ اور روزمرّہ کے واقعات کو ارشاداتِ قرآنی کی روشنی میں نمایاں کیا جاتا۔ مولٰینا ابوالکلام آزاد نے قرآن مجید کا بڑا گہرا مطالعہ کیا تھا۔ اور وہ اپنے مطالب کی توضیح و تائید کے لئے جابجا قرآن سے حوالے دیتے۔ یہ صحیح ہے۔ کہ بعض نقاد کہتے رہے۔ کہ مولٰینا ابوالکلام آزاد اپنے خیالات کی تائید کیلئے قرآنی آیات کی حسب دلخواہ ترجمانی اسی طرح کر لیتے تھے۔ جس طرح سرسیّد احکام اسلام کو سائنس کے مطابق ثابت کرنے کے لئے کرتے تھے۔ لیکن اس میں کوئی شک نہیں۔ کہ مولٰینا کے ان اقتباسات سے لوگوں کی قرآن فہمی میں بڑا اضافہ ہُوا۔ اور وہ یہ سمجھنے لگے۔ کہ قرآن مجید میں فقط یہود و نصاریٰ اور جزا و سزا کے قصے ہی نہیں۔ بلکہ وہ ارشادات بھی ہیں۔ جن کا تعلق ہماری روزمرہ کی انفرادی اور اجتماعی زندگی سے ہے۔ اور جن کی متابعت سے ہم اپنی دینی اور دنیاوی مُشکلات کا حل ڈھونڈ سکتے ہیں *

مولٰینا کی تیسری اہم مذہبی خدمت یہ ہے۔ کہ اُنہوں نے مذہبی تصنیف و تالیف کا معیار بہت بلند کر دیا۔ جن لوگوں نے قدیم علما کی غدر کے بعد کی لکھی ہُوئی کتابیں بغور دیکھی ہیں۔ انہیں ان سے کئی طرح کی مایوسی ہوتی ہے۔ ایک تو ان بزرگوں نے بڑا وقت ان بحثوں میں صرف کیا ہے۔ جو جزوی اور غیر ضروری ہیں۔ مثلاً "رفعِ یدین" کی بحث۔ دوسرے ان حضرات کا طرزِ استدلال بہت رسمی اور بے جان ہے۔ ایک مبحث پر کچھ لکھتے ہُوئے پہلے اس کا

منطقیانہ تجزیہ اس طرح کرتے ہیں کہ اصل مسئلہ بے جان ہو جاتا ہے۔ اور اگر معتقدین اس اظہارِ منطق سے مرعوب ہو جائیں۔ تو ہو جائیں۔ لیکن غیر جانبدار ناظرین کے پلے کچھ نہیں پڑتا۔ تیسرے ان کتابوں میں بھی علمی تبحر اور وسعتِ معلومات کا کوئی سراغ نہیں ملتا۔ ان بزرگوں نے نہ صرف مغربی علوم اور مغربی کتب کے دروازے اپنے لئے بلند کر رکھے ہیں۔ بلکہ قاہرہ۔ بیروت یا دمشق میں عربی کی جو نئی نئی کتابیں چھپتی ہیں۔ ان کے مطالعہ سے بھی وہ بالعموم محروم رہتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہے۔ کہ ان کی کتابوں میں علمی وسعت کا نام نہیں ہوتا۔ چوتھا بڑا نقص ان کتابوں میں یہ ہے۔ کہ یہ بالعموم نہایت سطحی پہلوؤں پر نظر رکھتی ہیں۔ حکیمانہ ژرف نگاہی اور مبصرانہ نظر تو خیر کسی حد تک خداداد بات ہوتی ہے۔ لیکن ظاہر ہے۔ کہ جس طریقۂ تعلیم میں سارا زور صرف و نحو اور فقہ و منطق پر صرف کیا جائے۔ اس میں واقعات کو پرکھنے اور بات کی تہ کو پہنچ جانے کی قابلیت کیسے ترقی پا سکتی ہے۔ ان بزرگوں کے زہد و تقوےٰ اور نیک نیتی کا پاس کرتے ہوئے ہم ان کی کتابوں کا چاہے کتنا ادب کریں۔ لیکن علمی نقطۂ نظر سے انہیں بہت بلند پایہ نہیں کہا جا سکتا۔ مولٰینا ابوالکلام آزاد کی تصانیف ان تمام نقائص سے پاک ہیں۔ ان کی نظر مشرق و مغرب کی اکثر متعلقہ کتابوں پر ہوتی ہے۔ خُدا نے انہیں حکیمانہ دل و دماغ اور زبردست قلم دیا ہے۔ ان تمام خوبیوں کا عکس ان کی تصانیف میں ہے۔ اور "الہلال" کے صفحے صفحے پر نظر آتا ہے۔ "تذکرہ" کئی لحاظ سے ان کی بہترین تصنیف ہے۔ اس کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ یہ کتاب ایک ایسے شخص کی لکھی ہوئی ہے۔ جو دُنیائے اسلام کی ذہنی اور مذہبی تاریخ سے پوری طرح واقف ہے۔ اور ان تمام تحریکوں اور شخصیتوں سے باخبر ہے۔ جنہوں نے مسلمانوں پر اچھا یا بُرا اثر ڈالا۔ مولٰینا کی اس خوبی کی وجہ سے نہ صرف ہمیں چند نہایت بلند پایہ تصانیف بہم پہنچیں۔ بلکہ ایک ایسی مثال قائم ہو گئی جس کی تھوڑی بہت پیروی دوسرے بزرگ بھی کرتے ہیں۔

مندرجہ بالا خدمات تو ایسی ہیں۔ جن کے مفید ہونے میں کسی کو شک نہیں۔ لیکن ان کے علاوہ مولٰینا کے ایک دو کام ایسے بھی ہیں۔ جن کے فائدوں کے متعلق اختلافی رائیں ظاہر

کی گئی ہیں۔ مولینا کے ایک دوست فضل الدین احمد "تذکرہ" کے شروع میں لکھتے ہیں "علما و
مشائخ کا گروہ جو اپنے مدرسوں اور حجروں سے کبھی جھانک کر بھی دُنیا کی حالت پر نظر نہ ڈالتا
تھا "الہلال" نے ان کو نکال کر جد و جہد کے میدانوں میں کھڑا کر دیا" بعض لوگ اسی کو
مولینا کی سب سے اہم خدمت سمجھتے ہیں۔ لیکن اس سے کئی لوگ اختلاف بھی کرتے ہیں۔
حاجی محمد اسمٰعیل رئیس رتاولی نے "الہلال" ہی کے ایک پرچے میں اس نقصان کی طرف توجہ دلائی
تھی۔ جو مذہب کو چھوڑ کر دوسرے میدانوں میں عُلما کے سرگرم عمل ہونے سے مذہب کو پہنچے گا۔
اُنہوں نے ایک پُرجوش خط میں ایڈیٹر "الہلال" کو لکھا تھا۔ "ہمارے علما اور پیشوایانِ دین (جس طرح
کہ جناب والاخود ہیں یا شمس العلما مولینا شبلی ہیں) افسوس کہ اپنے فرائض کو بھول چکے ہیں۔
اور ایسی "تُو تُو۔ مَیں مَیں" میں جس سے انہیں الگ رہنا زیادہ مستحسن تھا۔ پڑ گئے ہیں۔ میں پھر
عرض کروں گا کہ مَیں معاملات ملکی میں توجہ کرنا غیر ضروری نہیں جانتا۔ لیکن بلا شبہ یہ قطعاً غلطی
ہے کہ سب گروہوں کا فقط یہی کام رہ جائے کہ وہ حکام پر نکتہ چینی میں منہمک ہو جائیں اور
اپنے تمام دوسرے کام بھول جائیں .... شمس العلما مولینا شبلی
معاف فرمائیں گے۔ اگر عرض کیا جائے کہ اُنہوں نے ندوہ کو چھوڑ کر پولٹیکل نظموں کو
مسلمانوں کے حق میں مفید یا اپنے واسطے موجب نام آوری قرار دیا ہے۔ اگر آپ حضرات
ان فضولیات کو چھوڑ دیں اور ایسے علما کے پیدا کرنے میں جو یورپ کا علمی مُقابلہ کرتے
ہوئے ان کے واسطے روحی فضیلت کا اور تلقین اسلام کا باعث ہوں۔ اپنے آپ کو مصروف
کر دیں۔ تو بلاشُبہ عند الناس اور عند اللہ دونوں جگہ زیادہ مقبول ہوں گے۔ اشاعت مذہب
جیسی ضروری تحریک سے جس طرح مسلمانانِ عالم (یعنی اندرونِ ہند اور بیرونِ ہند) غافل ہیں۔
وہ ہر طرح نہایت افسوس۔ ملامت اور مواخذہ کے لائق ہے۔ اور یہ سب الزام علما کے
سر سب سے اوّل ہے"؎

مولینا ابوالکلام آزاد کی مذہبی سرگرمیوں کے ایک پہلو پر ہمارے ایک دیوبندی اُستاد نے

ایک دفعہ دلچسپ تبصرہ کیا تھا - وہ فرماتے تھے - کہ بے شک مولٰینا ابوالکلام آزاد نے جدید علم الکلام کے فتنے کا تدارک کیا - اور اپنے زوردار قلم کی مدد سے ایک ایسی ذہنی فضا پیدا کردی - جس کے سامنے متکلمانہ رُجحانات کا فروغ پانا ناممکن ہوگیا - لیکن پھر بھی جو لوگ ان تحریروں سے متاثر ہوئے - ان میں مذہبی جوش اور حرارتِ دینی کے باوجود صحیح اسلامی تقوٰے اور پرہیزگاری پُورے طور پر نہیں آئی - انہیں اسلام کی عظمت اور سچائی کا یقین ہوگیا - لیکن اگر روحانی انقلاب کی اہمیت اسی میں ہے - کہ یہ اعتقادات و احساسات سے گزر کر کیرکٹر اور اخلاق کو متاثر کرے - اور اسے صُلحا کے رنگ میں رنگ دے - تو اس میں مولٰینا ابوالکلام آزاد کو پوری کامیابی نہیں ہوئی - ہمارا خیال ہے - کہ یہ رائے بڑے غور کی مستحق ہے - یہ خیال تو صحیح نہیں - کہ مولٰینا نے مذہب کا عملی اور اخلاقی پہلو نظر انداز کردیا - اُنہوں نے اس پر کافی توجہ دی - اور قوم کے خیالات میں آزاد خیالی - جُرأت - ایثار - بلند ہمتی اور اسی طرح کی دوسری اخلاقی خصُوصیات ابھارنے میں بڑا حصّہ لیا - لیکن یہ بھی سچ ہے - کہ اُنہوں نے تقوٰے اور پرہیزگاری کی ان امتیازی خصوصیات پر جو اسلام کے قدیم علما و صلحا کا طرۂ امتیاز رہی ہیں - پُورا زور نہیں دیا - اور ان کے سب سے پُرجوش مداحوں اور معتقدوں میں بھی وہ روحانی پاکیزگی نظر نہیں آتی - جو اب بھی دیوبند کی چاردیواری میں مِل جاتی ہے - حقیقت یہ ہے - کہ مولٰینا کا بنیادی کام احیائے مذہب تھا - اِصلاحِ اخلاق یا تلقینِ صفائے نفس نہ تھا - اور سچ تو یہ ہے - کہ حالؔی کے بعد کسی نے اس اخلاقی تنزّل کا صحیح اندازہ ہی نہیں کیا - جو قدیم مذہبی نظام کی شکست وریخت اور تصوف کے انحطاط کے بعد ہندوستانی مسلمانوں میں شروع ہُوا - اور آج بھی ہماری خوش فہمیوں اور خود اعتمادیوں کے باوجود بڑھ رہا ہے *

الہلالی اُردو مولٰینا ابوالکلام آزاد کی نسبت ہم کہہ چکے ہیں کہ انہیں سرسید کے کاموں کا سب سے بڑا مخالف سمجھنا چاہیئے - اُن کی تمام زندگی اُن عمارتوں کو

مسمار کرنے میں گذر گئی ہے ۔ جن کی تعمیر میں سرسید اور اُن کے ساتھیوں کا ہاتھ تھا" الہلال" نے شروع سے علی گڑھ یونیورسٹی کی مخالفت کی اور ہمیشہ اس کی راہ میں روڑے اٹکائے ۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے سرسید اور محسن الملک کی سیاسی روش کی ہمیشہ مخالفت کی ۔ سرسید کے جدید علم الکلام پر سب سے زوردار اعتراض مولانا ابوالکلام ہی نے کئے ۔ لیکن سرسید کی یہ مخالفت مولانا نے تعلیم ۔ سیاست اور مذہب ہی تک محدود نہیں رکھی ادب اور انشا پردازی میں بھی اُنھوں نے سرسید کی مخالفت کا راستہ اختیار کیا ۔ ان کی "مخصوص انشا پردازی" سرسید کی طرزِ تحریر کی عین ضد ہے ۔ مسٹر رام بابو سکسینہ "تاریخ ادبیاتِ اُردو" میں موجودہ اردو نثر کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں ۔" اکثر لوگوں کا میلانِ طبع اس طرف ہے کہ عبارت میں مشکل مشکل فارسی عربی الفاظ بالقصد استعمال کئے جائیں ۔ تاکہ عبارت شاندار اور وقیع معلوم ہو ۔ ممکن ہے کہ اس طرز کی ابتدا اس طرح ہوئی ہو کہ سرسید اور اُن کے رفقا اور مقلدین اُن کی تقلید میں نہایت سیدھی سادھی مگر زوردار عبارت لکھنے کے عادی ہو گئے تھے ۔ بعد کو بعض جدت پسند طبائع کو جب وہ رُوکھی پھیکی اور بدمزہ معلوم ہونے لگی تو اس میں رنگینی اور علمیت کی چاشنی پیدا کر کے عربی فارسی الفاظ کا بکثرت استعمال کیا جانا ضروری سمجھا گیا ۔ گویا اس طرز کو سرسید مرحوم کی طرز کا ردِ عمل کہنا چاہیئے ۔ ہمارے خیال میں اس طرز کے مخترع مولانا ابوالکلام آزاد ہیں ۔ جنھوں نے اپنے مشہور اخبار" الہلال" میں اس کو برتا" (ترجمہ)

سرسید کی ایک اہم ترین قومی خدمت یہ تھی کہ اُنھوں نے اُردو نثر کو مرزا رجب علی بیگ غلام امام شہید اور دوسرے ابتدائی نثر نگاروں کی مسجّع اور مقفیٰ طرزِ تحریر سے پاک کیا ۔ اور زبان کو عام خیالات کے اظہار کا آئینہ بنایا ۔ غدر سے پہلے اُردو نثر لکھنے والے تشبیہوں اور قافیوں کے انبار میں اصل مطلب کو خبط کر دیتے تھے ۔ اور نفسِ مضمون کی وضاحت انشا پرداز کی خوبی نہیں سمجھی جاتی تھی ۔ سرسید نے نئی نثر کو مقبول اور رائج کیا ۔ جسے مرزا غالب نے اُردوئے معلےٰ میں شروع کیا تھا ۔ مشکل الفاظ اور دُور از کار تشبیہوں ۔ عبارت آرائی اور

تصنّع نگاری کو بہ یک قلم موقوف کر دیا اور اُردو زبان کو ہر طرح کے خیالات کے اظہار کا نہایت کامیاب ذریعہ بنایا۔ اُن کی نثر میں لفظی آرائش یا صنائع بدائع کا التزام تو نہ ہوتا لیکن وہ جو کچھ لکھتے خلوص سے پُر ہوتا اور نفسِ مضمون اور خیالات مفید اور ضروری ہوتے۔ اِس لئے اُن کی طرزِ تحریر کامیاب ہو گئی۔

مولٰینا ابوالکلام آزاد نے اس طرزِ تحریر کے خلاف قدم اُٹھایا اور بعض لحاظ سے اُردو نثر کو وہیں جا کھڑا کیا جہاں وہ سرسید کی اصلاح سے پہلے تھی بلکہ اُردو نثر میں "تاریخِ وصّاف" اور "انوارِ سہیلی" کے نمونے قائم کر دئے۔ ان کی طرزِ تحریر کا ایک دلچسپ نمونہ وہ صفحات ہیں جو "تذکرہ" کے آخر میں اپنے حالات کے متعلق اُنہوں نے "اپنے اندازِ خاص" میں تحریر کئے ہیں۔ چند ابتدائی سطریں ملاحظہ ہوں:-

"یہ غریب الدیارِ عہد۔ ونا آشنائے عصر۔ بیگانۂ خویش و نمک پروردۂ ریش معمورۂ تمنا و خرابۂ حسرت، کہ موسوم بہ احمد و مدعو بابی الکلام ہے ۱۸۸۸ء مطابق ۱۳۰۵ھ ہجری میں ہستیٔ عدم سے اس عدمِ ہستی نما میں وارد ہُوا اور تہمت حیات سے متہم۔ النّاس نیام اذا ماتوا انتبہوا۔

شورے شد و از خوابِ عدم چشم کشودیم   دیدیم کہ باقی است شبِ فتنہ غنودیم"

انگریزی فنِ تنقید کا ایک کلیہ ہے کہ طرزِ تحریر ہی شخصیت کا بہترین اظہار ہوتا ہے۔ اس نقطۂ نظر سے سرسید اور مولٰینا ابوالکلام کا موازنہ بڑا دلچسپ ہے۔ سرسید کی طرزِ تحریر سیدھی سادھی۔ مشکل الفاظ سے پاک اور خطیبانہ جوش و خروش سے بالکل مبرّا تھی۔ ان کا خطاب ناظرین کی عقل سے ہوتا۔ وہ جذبات کو نہ اُبھارتے اور اپنے خیالات سلیس عبارت میں پیش کر کے اسی پر قناعت کرتے کہ ناظرین انہیں درست سمجھ کر اُن پر عمل کریں۔ وہ سمجھتے تھے کہ قوم کے لئے سلامتی کا راستہ اسی میں ہے کہ وہ لفاظی اور انشا پردازی کے پردے اُتار کر واقعات اور حالات کو اصلی صورت میں دیکھنا شروع کرے۔ مولٰینا ابوالکلام آزاد

کی طرزِ تحریر اس سے بہت مختلف ہے ۔ وہ "ابو الکلام" ہیں ۔ زورِ کلام اور زورِ بیان کے بادشاہ۔ اُن کی تحریر ایسی ہے ع

جو قلب کو گرما دے ۔ جو روح کو تڑپا دے

لیکن اس سے دماغ کو روشنی نہیں ملتی ۔ وہ خشک منطق سے زیادہ جذبات کے قائل ہیں ۔ان کی طرزِ تحریر میں حرارت زیادہ ہے روشنی کم ۔ ان کی تحریر و تقریر میں ایک جادو ہے جس سے مسحور ہو کر ناظرین اور سامعین ان کی پیروی شروع کر دیتے ہیں خواہ عقل اور خشک منطق اس طرف رہنمائی نہ کریں +

جذباتی لب و لہجہ کی کمی کے علاوہ سر سید اور ان کے ساتھیوں کی طرزِ تحریر کی خصوصیت ان کی سادہ زبان تھی ۔ سر سید ۔ حالی اور علی گڑھ تحریک کے دوسرے رہنماؤں کی تصانیف میں عربی فارسی کے موٹے موٹے الفاظ بہت کم ملیں گے ۔ وہ حتے الوسع وہی زبان استعمال کرتے ۔ جو دہلی اور یوپی میں بولی جاتی ۔ عربی اور فارسی کے الفاظ اشد ضرورت کے بغیر کبھی استعمال نہ کرتے ۔ دوسرے انگریزی کے الفاظ استعمال کرنے سے انہیں گریز نہ تھا ۔ نتیجہ یہ کہ ان کی زبان ایسی تھی ۔ جسے ہندو اور مسلمان دونوں بآسانی سمجھ سکتے تھے ۔ مولینا ابو الکلام آزاد نے جو طرزِ تحریر رائج کی ۔ اس میں مُشکل اور غیر مانوس عربی اور فارسی الفاظ کی بھرمار تھی ۔ اُردو میں انگریزی الفاظ استعمال کرنے کے وہ سخت مخالف تھے ۔ عام مروجہ انگریزی الفاظ کو ترک کر کے اُنہوں نے ٹھوس عربی الفاظ استعمال کرنے کی رسم ڈالی ۔ مثلاً "لیڈر" کی جگہ "زعیم" اور "وائرلیس" کی جگہ "لاسلکی" ۔ "الہلال" اور "البلاغ" کی عام سرخیاں ہی ایسی ہوتی تھیں ۔ جنہیں تھوڑی بہت عربی جانے بغیر سمجھنا مشکل تھا ۔ مثلاً "مذاکرۂ علمیہ" "شئونِ اسلامیہ" "اسئلتہ و اجوبتہا" وغیرہ ۔ مولینا ابو الکلام آزاد کی اس طرزِ تحریر کو مولینا ظفر علی خاں نے پنجاب میں رائج کیا ۔ اور آہستہ آہستہ ایسی اُردو لکھنے کا فیشن ہو گیا ۔ جسے عربی دان مسلمانوں کے سوا کوئی نہیں سمجھ سکتا تھا ۔ اور اُردو فقط مسلمانوں کی زبان ہو کر رہ گئی +

مولینا ابو الکلام آزاد کی نثر کے متعلق کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ یہ ایک استخوانِ بے مغز ہے۔ مولینا کی طرزِ تحریر مولینا کی شخصیت کا آئینہ ہے۔ مشکل اور دقیق الفاظ اُن کی نثر میں اس لئے آجاتے ہیں کہ فارسی اور عربی اُن کے لئے مادری زبانیں ہیں اور مشکل عربی اور فارسی لفظ اُن کی زبان پر چڑھے ہوئے ہیں۔ طرزِ تحریر کا جوش اور زور ان کی اپنی نوجوان طبیعت کی وجہ سے ہے۔ اُنہوں نے "الہلال" کے مضامین اس زمانے میں لکھے۔ جب وہ بیس بائیس برس کے تھے۔ اور جب بہ تقاضائے عمران پر جوش اور جذباتی رنگ غالب تھا۔ اس کے علاوہ اُن کی طبیعت شاعرانہ ہے۔ عربی، فارسی اور اُردو کے بے شمار اشعار اُن کی نوکِ زبان پر ہیں۔ جنہیں وہ اپنی تصانیف میں کبھی بلا تکلف اور موزوں طور پر اور کبھی بلا ضرورت اور بے جا استعمال کر جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ ان کی دماغی قابلیت اور علمی تبحّر ان کی تصانیف میں نمایاں ہے اور ان کی طرزِ تحریر میں مغز و استخوان دونوں موجود ہیں۔ لیکن افسوس یہ ہے کہ جن لوگوں نے اُن کی طرزِ تحریر کی تقلید کی ان میں بالعموم مولینا کا علمی تبحّر یا اجتہادانہ نظر اور عالی دماغی تو نہ تھی۔ مولانا کی خوبیاں تو ان کی تحریر میں نہ آئیں لیکن مشکل الفاظ کا استعمال خطیبانہ جوش و خروش۔ لفاظی اور زورِ کلام یہ سب باتیں اُنہوں نے اخذ کرلیں۔ اور مولینا کی تقلید میں ایک ایسی طرزِ تحریر رائج ہو گئی جس میں مولینا کی نثر کی خوبیاں تو کوئی نہیں نقائص سبھی ہیں۔ مولینا کی طرزِ تحریر تو ان کی اپنی شخصیت کا آئینہ تھی۔ لیکن جن نقالوں نے اسے اختیار کیا اُنہوں نے فقط اپنی کم علمی اور بے بضاعتی کو الفاظ کے انبار میں چھپانے اور اپنے خام یا نیم پختہ خیالات کو جوش و خروش سے آب و تاب دینے کا ذریعہ بنا لیا۔ اُردو کے اخبارات دیکھے جائیں تو وہ اہم سے اہم معاملات پر تبصرے کریں گے۔ لیکن کسی بات پر ٹھنڈے دل سے غور نہیں کرتے۔ کتنے اہلِ قلم ہیں جو کسی مضمون پر لکھنے سے پہلے اس کے تمام پہلوؤں سے اپنے آپ کو بخوبی واقف کر لیتے ہیں۔ اور پھر مسئلہ کے حُسن و قبح پر دیانتداری اور ٹھنڈے دل سے رائے زنی کرتے ہیں۔ یہ طریقِ کار مشکل ہے۔ اور جب زورِ قلم۔ لفاظی اور انشا پردازی سے معمولی سے معمولی بات

اور غلط سے غلط طریقِ کار اتنا شان دار اور وقیع بنایا جا سکتا ہے کہ ناظرین اس پہ وجد کرنے
لگیں تو پھر اتنی محنت کون کرے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ طرزِ تحریر ہماری ادبی اور قومی زندگی
میں زہر کی طرح سرائت کر رہی ہے۔ اس سے نہ جمہور کی واقفیت میں اضافہ ہوتا ہے۔
اور نہ انہیں اہم اور ضروری واقعات پر عقل اور سمجھ سے غور کرنے اور رائے قائم کرنے کا
موقع مل سکتا ہے۔ لفاظی۔ زورِ کلام۔ ساحرانہ طرزِ تحریر اور خطیبانہ جوش وخروش
سے ایک ایسی فضا قائم کر دی جاتی ہے جس میں انسانی سمجھ عضوِ معطل بن جاتی ہے۔ اور
آنکھیں بند کر کے جوش وخروش کے گھوڑے پر سوار ہو کر انشا پرداز یا اخبار نویس کے
پیچھے ہو لیتی ہے۔ خواہ وہ ہلاکت کی طرف لے جائے۔ خواہ سلامتی کی طرف ؛
ظاہر ہے۔ کہ مولینا ابو الکلام آزاد کے مقلدین کی تمام کوتاہیوں کے لئے مولینا کو ذمہ دار
قرار نہیں دیا جا سکتا۔ ایک صاحبِ طرز انشا پرداز کی سطحی خصوصیات کی تقلید کرنا ہمیشہ آسان
ہوتا ہے۔ اور اس کی ذاتی خوبیوں کو اخذ کرنا بہت مشکل۔ مثلاً غالب کی تقلید میں جو اردو
غزلیں پنجاب کے رسائل میں شائع ہوتی ہیں۔ انہیں پڑھ کر دیکھا جا سکتا ہے۔ کہ وہ کلام
غالب کی تمام معنوی خوبیوں سے تو معرا ہوتی ہیں۔ لیکن اُن میں "فوق البھڑک" الفاظ اور فارسی
تراکیب کی بھرمار ہوتی ہے۔ مولینا ابو الکلام آزاد کے مقلدین نے بھی یہی کیا۔ لیکن یہ بھی
صحیح ہے۔ کہ فی نفسہٖ مولینا کی "مخصوص طرزِ تحریر" جسے اُنہوں نے "الہلال" میں رائج کیا اور
جسے وہ آج ترک کر چکے ہیں۔ عیوب سے بالکل پاک نہ تھی۔ اور اس کا اثر دورِ حاضر کے
اُردو ادب اور اُردو زبان کی نشوونما پر نسبتاً ناخوشگوار ہی پڑا ہے ؛

دورِ ردِّ عمل کی خصوصیات

گذشتہ اوراق میں ہم نے ان حضرات کا ذکر کیا ہے جنہوں نے علی گڑھ تحریک کے خلاف ردِّ عمل جاری کیا۔ اور جن کی وجہ سے وہ علمی اور اصلاحی اصول جن پر سر سید قوم کی ترقی کی بنیاد رکھنا چاہتے تھے۔ قوم کے با اثر حلقوں میں ناپسند

ہو گئے۔ اگر ردِ عمل کے اس زمانے کا بغور مطالعہ کیا جائے۔ تو کئی نمایاں خصوصیتیں نظر آئیں گی۔ جو قومی زندگی کے اس دَور کو اُس زمانے سے ممتاز کرتی ہیں۔ جب سرسیّد اور ان کے مقاصد مقبول تھے +

اس ذہنی دَور کی ایک نمایاں خصوصیت عام مذہبی احیاء ہے۔ علی گڑھ کالج کو قائم کرتے وقت سرسیّد کی ایک بڑی آرزو یہ تھی۔ کہ وہاں کے طلبا مذہب سے بھی پوری طرح بہرہ ور ہوں۔ لیکن چند اسباب کی بنا پر علی گڑھ نے جو عملی صورت اختیار کی۔ اُس میں مذہبی رنگ نمایاں نہ تھا۔ اور علی گڑھ کے طلبا اور عام تعلیم یافتہ طبقے سے قوم کو عام شکائت تھی۔ کہ وہ مذہب سے بیگانہ ہیں۔ ایک زمانے میں اس طبقے کی جو شہرت تھی۔ اس کا اندازہ مسٹر فضل الدین احمد کے بیان[1] سے ہو سکتا ہے۔ وہ فرماتے ہیں "یہ بات عام طور پر مسلّم ہو چکی تھی۔ کہ نئی تعلیم یافتہ جماعت کو مذہب سے کوئی واسطہ نہیں۔ اور اسکول اور کالج کی تعلیم اور مذہبی زندگی' دونوں ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتیں۔ حتےٰ کہ اگر کوئی شخص ترکی ٹوپی اوڑھے ہوئے نماز پڑھتا ہُوا نظر آ جاتا۔ یا قرآن شریف کی کوئی آئت اس کی زبان و قلم سے نکل جاتی۔ تو لوگوں کو ایک نہایت تعجب انگیز اور غیر معمولی واقعہ معلوم ہوتا۔ ایک خاص واقعے کی طرح اس کا ذکر کیا جاتا۔ کہ فلاں شخص نے کالج میں تعلیم پائی ہے۔ اور ساتھ ہی نماز بھی پڑھ لیا کرتا ہے!"

علی گڑھ تحریک کے خلاف جو ردِ عمل ہُوا۔ اُس میں مذہب سے بیگانگی بہت حد تک کم ہو گئی۔ ایک تو جدید تعلیم یافتہ جماعت ہی میں ایسی ہستیاں پیدا ہو گئیں۔ جو مذہب کی قدر و قیمت سمجھتی تھیں۔ اور جن کے دلوں میں مذہبی جوش تھا۔ دوسرے قدیم علما نے بھی اس مذہبی بے حسی کو دُور کرنے کے لئے زیادہ سرگرم کوششیں شروع کیں۔ دیوبند میں

[1] اس بیان میں مبالغہ ضرور ہے۔ لیکن تعلیم یافتہ طبقے کے متعلق قوم کے مذہبی حلقوں کا جو خیال تھا۔ اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے۔

علوم دینی کے جو سرچشمے جاری تھے۔ ان کا فیض ملک میں عام ہونا شروع ہُوا۔ اکبرؔ مرحوم نے بے دینی اور لامذہبی کے خلاف اپنی ظرافت کے بے پناہ تیر چلائے۔ اور سب سے بڑھ کر یہ ہُوا۔ کہ مولٰینا ابوالکلام آزادؔ نے اپنے زورِ قلم کو مذہبی احیائے کے لئے استعمال کیا۔ اور "الہلال" کے ذریعے قوم پر مذہب کی ضرورت اور اہمیت پوری طرح واضح کر دی۔ ان تمام اثرات کا نتیجہ یہ ہُوا۔ کہ مذہب سے جو بے پروائی تھی وہ جاتی رہی۔ اور قوم میں نئی مذہبی زندگی کے آثار نمایاں ہو گئے ؀

عام مذہبی احیاء کے علاوہ اس دَور کی نمایاں خصوصیت مغرب کی ذہنی غلامی کے خلاف ردِّ عمل ہے۔ یہ صحیح ہے۔ کہ علی گڑھ تحریک کے راہنماؤں میں ذہنی آزادی کی کمی نہ تھی۔ قوم کو سلف کی کورانہ تقلید سے آزاد کرانے اور اس تقلید کے حمائیتیوں کی مخالفت برداشت کرنے کے لئے بڑی جرأت اور صحیح آزاد خیالی کی ضرورت ہے۔ اور سرسید۔ حالؔی اور اُن کے رفقا میں یہ آزاد خیالی پوری طرح موجود تھی۔ لیکن اس کے باوجود ان بزرگوں کی تصانیف پڑھ کر خیال ہوتا ہے۔ کہ انہیں مغرب سے ایک قسم کا حُسنِ ظن تھا۔ اور مغربی تعلیم، مغربی ادب اور مغربی علوم و فنون سے انہیں ایسی توقعات تھیں۔ جو زیادہ تر عقیدت یا ناواقفیت پر مبنی تھیں۔ مغرب سے ان بزرگوں کو تو فقط ایک طرح کا حسنِ ظن تھا۔ لیکن جس طبقے نے انگریزی کالجوں میں تعلیم پائی۔ ان میں غلامانہ ذہنیت بُری طرح نمایاں تھی۔ ان کے نزدیک مغرب کی ہر ایک چیز اچھی تھی۔ اور مشرق کی ہر ایک چیز بُری۔ اور قدیم مشرقی شعرا اور اسلامی مفکروں سے انہوں نے غیر معمولی بے اعتنائی روا رکھی۔ جس زمانے کا ہم ذکر کر رہے ہیں اُس میں اس رجحان کے خلاف ردِّ عمل ہُوا۔ ایک تو ۱۹۰۶ء کی جنگِ رُوس و جاپان میں جاپانیوں نے رُوس کو شکست دے کر مغرب کی برتری اور فوقیت کا طلسم توڑ دیا۔ دوسرے خود ہندوستان میں کئی ایسے راہنما پیدا ہُوئے۔ جنہوں نے مغربی علم و فن، فلسفہ اور اخلاقیات پر نکتہ چینی کی۔ اور ساتھ ساتھ مشرق کی ان برگزیدہ ہستیوں کی خُوبیاں بے نقاب

گئیں۔ جنہیں مغرب کے بہترین شعرا، ادبا اور فلسفیوں کے بالمقابل پیش کیا جاسکتا ہے۔ ان بزرگوں کی کوششوں کا یہ نتیجہ ہُوا۔ کہ قوم میں خود اعتمادی بڑھ گئی۔ غلامانہ ذہنیت کم ہوئی۔ اور پرانے مشرقی شاعر اور ادیب اور فلسفی پھر عزت کی نظر سے دیکھے جانے لگے۔ علامہ اقبال نے ۱۹۱۲ء کے شروع میں "شمع اور شاعر" لکھی تھی۔ اُس میں اس ذہنی تبدیلی کی طرف ایک لطیف اشارہ ہے ؎

مُژدہ اے پیمانہ بردارِ خمستانِ حجاز — بعد مدت کے ترے رندوں کو پھر آیا ہے ہوش
نقدِ خود داری بہائے بادۂ اغیار تھی — پھر دکاں تیری ہے لبریزِ صدائے ناؤ نوش
پھر یہ غوغا ہے کہ لاساقی شرابِ خانہ ساز — دل کے ہنگامے مئے مغرب نے کر ڈالے خموش

نئی نسل کی غلامانہ ذہنیت کے خلاف جو ردِّ عمل ہُوا۔ اُس کے مفید ہونے میں شک نہیں۔ لیکن افسوس یہ ہے۔ کہ یہ ردِّ عمل مناسب حدود سے تجاوز کر گیا۔ پہلے مغرب کی ہر ایک چیز کو اچھا کہا جاتا تھا۔ اب مغرب کی ہر چیز بُری ہوگئی۔ اور مشرق کی ہر ایک چیز بے عیب ؎

پہلے گر شانِ غلامی تھی تو اب خیرہ سری!

اس زمانے میں انصاف، راست بینی اور صحیح قومی بہی خواہی کے اصول کسی حد تک قوم کی نظر سے اوجھل ہوگئے۔ اور ایک ایسی فضا پیدا ہوگئی۔ جس کے زیر اثر اپنی ہر ایک چیز اچھی نظر آتی۔ اور دوسروں کی ہر ایک چیز بُری۔ مشرقی شعرا اور ادبا کو اس طرح بڑھا چڑھا کر پیش کیا جاتا۔ گویا اُن کے سامنے دُنیا کے تمام شاعر اور انشا پرداز ہیچ ہیں۔ اسی طرح قومی معاشرت، بُود و باش، اخلاقی اور تعلیمی حالت کے متعلق خیال پیدا ہوگیا۔ کہ اُن میں کسی اصلاح یا تبدیلی کی ضرورت نہیں۔ کوئی اس نقطۂ نظر سے اختلاف کرتا۔ تو فوراً اُس کے متعلق کہا جاتا۔ کہ وہ مغرب سے "مرعوب" ہوگیا ہے۔ اور اُس کی ذہنیت غلامانہ ہے +

قومی ذہنیت میں اس وقت جو عظیم الشان تبدیلی ہوگئی تھی۔ اُس کا اندازہ غالبؔ کے متعلق قومی نقطۂ نظر سے ہو سکتا ہے۔ ایک قوم کا ادب اس کے کیرکٹر اور ذہنی رجحانات کا بہترین

مظہر ہوتا ہے۔ اور غالبؔ کو ہمارے ادب میں ایک امتیازی حیثیت حاصل ہے۔ یہ ایک امرِ واقعی ہے۔ کہ غالبؔ کو قوم سے صحیح معنوں میں روشناس حالیؔ نے کرایا۔ جو سرسیدؔ کے بعد علی گڑھ تحریک کا سب سے بڑا علمبردار تھا۔ حالیؔ غالبؔ کا شاگرد تھا۔ اس کے علاوہ وہ خود طبعاً اس قدر نیک تھا۔ کہ اُس کی نظر دوسروں کی نیکیوں ہی پر پڑتی۔ اور اُن کی خامیاں نمایاں کرنے سے وہ ہمیشہ پرہیز کرتا۔ چنانچہ "یادگارِ غالب" میں مرزا غالبؔ کی جو تصویر پیش کی گئی ہے۔ اُس میں حالیؔ کی ان خصوصیتوں کا عکس بھی موجود ہے۔ لیکن اس کے باوجود کوئی نہیں کہہ سکتا۔ کہ مرزا کی شاعرانہ عظمت کا اندازہ کرنے میں حالیؔ نے کسی مبالغے بے انصافی یا جانبداری سے کام لیا ہے۔ حالیؔ نے "یادگارِ غالب" میں مرزا کی اُردو شاعری کی تو فقط خصوصیتیں بیان کر دی ہیں۔ اور دوسرے اُردو شعرا پر اُن کی فوقیت کے متعلق کوئی فیصلہ کُن رائے نہیں دی۔ فارسی کلام کا البتہ دوسرے فارسی شعرا کے کلام سے مقابلہ کیا گیا ہے۔ لیکن اس بارے میں بھی حالیؔ کی جو رائے ہے۔ اُسے کوئی صاحبِ ذوق مبالغہ آمیز نہیں کہہ سکتا۔ "الغرض مرزا کی فارسی نظم و نثر کے متعلق ہماری رائے کا ماحصل یہ ہے۔ کہ ان کا مرتبہ قصیدہ اور غزل میں عُرفیؔ اور نظیریؔ کے لگ بھگ اور ظہوریؔ سے بڑھا ہُوا۔ مثنوی میں ظہوریؔ کے لگ بھگ اور عرفیؔ و نظیریؔ سے بالا اور نثر میں تینوں سے بالاتر ہے" +

اگر "یادگارِ غالب" کا مقابلہ بجنوریؔ کے "مقدمۂ دیوانِ غالب" سے کیا جائے۔ جو اس دورِ ردِ عمل کی تصانیف کا ایک اچھا نمونہ ہے۔ تو اس ذہنی انقلاب کا پتہ چل جائے گا۔ جو قوم کے بہترین دماغوں کو متاثر کر رہا تھا۔ مقدمے کا پہلا فقرہ ہے۔ "ہندوستان کی الہامی کتابیں دو ہیں۔ "مقدس وید" اور "دیوانِ غالبؔ"۔ آگے چل کر رائے ظاہر کی ہے۔ کہ شیکسپیئر سے مرزا غالبؔ کا مقابلہ کرنا مرزا کی توہین ہے۔ "تنازع للبقا میں مغلوب ہو کر ایشیائی ایسے مرعوب ہو گئے ہیں کہ اپنے ہر فعل و خیال کا موازنہ مغربی اقوال اور آرا سے کرنے لگے ہیں۔ یہ وہ غلامی ہے۔ جس کی زنجیروں کو تلوار بھی نہیں کاٹ سکتی۔ پس کیا تعجب ہے۔ اگر اس

یورپ زندگی کے زمانے میں طالب علم اور انگریزی تعلیم یافتہ مرزا غالبؔ کا شیکسپیئر، ورڈس ورتھ اور ٹے نی سن سے مُقابلہ کرتے ہیں۔ اور خوش ہوتے ہیں۔ افسوس کہ کوتاہ نظر یہ نہیں جانتے کہ شاعری اور تنقید پر کیا دانستہ ظلم ہوتا ہے .... دُنیا میں اگر کسی شاعر سے غالبؔ کا مقابلہ ہوسکتا ہے۔ تو وہ شعرائے المانیہ کا سرتاج یوحنا ولف گانگ فان گیٹے المعروف بہ گیٹے ہے" ؎

مغرب اور اہلِ مغرب کی برتری کے خلاف جو پُر زور ردِّ عمل ہُوا۔ اُس کا نہ صرف یہ نتیجہ ہُوا۔ کہ مشرق کی ہر ایک چیز مبالغہ آمیز خوش اعتقادی سے دیکھی جانے لگی۔ بلکہ ایک ایسا جذباتی نقطۂ نظر عام ہوگیا۔ جس کے زیر اثر اشیا یا خیالات اپنی اصلی صورت میں نہیں بلکہ وقتی اور شخصی رجحانات کے مُطابق پیش کئے جاتے۔ سر سید اور حالیؔ کی ایک نمایاں خصوصیت ان کی غیر معمولی واقعیت پسندی تھی۔ وہ واقعات کو اپنی اصلی صورت میں دیکھتے تھے۔ جذباتی جوش و خروش یا انشا پردازانہ رنگ آمیزی سے انہیں موڑ توڑ کر پیش نہ کرتے تھے۔ دورِ ردِّ عمل میں یہ حقیقت پسندی بالکل جاتی رہی۔ اور واقعات ایک ایسی جذباتی عینک کی مدد سے دیکھے جانے لگے۔ جس سے قومی خود پسندی میں اضافہ تو ہوتا تھا۔ لیکن واقعات اپنی اصلی صورت میں نظر نہ آتے۔ اس رجحان کی مثالیں اس دَور کے مصنفوں، اخبار نویسوں اور قومی راہنماؤں کے مضامین میں بکثرت ملیں گی۔ مثال کے طور پر ان تحریروں ہی کو دیکھا جائے۔ جو اس زمانے میں غالبؔ کے متعلق لکھی گئیں۔ تو ان میں بھی اِس رجحان کی کئی ایسی مثالیں ملیں گی۔ جن میں تبصرہ نگار نے واقعات کو ان کی اصلی صورت میں دیکھنے کی کوشش نہیں کی۔ بلکہ انہیں اپنے نقطۂ نظر کے مُطابق موڑ توڑ کر پیش کیا ہے۔ اور واقعات کی کمی۔ جذباتی جوش اور زورِ انشاپردازی سے پُوری کرنے کی کوشش کی ہے۔ غالبؔ کی حب الوطنی کے متعلق جو تحریریں لکھی گئی ہیں۔ وہ اِس رجحان کو خوب نمایاں کرتی ہیں۔ حالیؔ نے "یادگارِ غالب" میں کہیں مرزا کو بڑا

محبِ وطن ثابت کرنے کی کوشش نہیں کی۔ بلکہ حکامِ انگریزی سے اُن کے جو تعلقات تھے۔ انہیں اچھی طرح نمایاں کر دیا۔ اور بہادر شاہ سے مرزا کو جو شکائتیں تھیں۔ ان کا بھی تھوڑا بہت ذکر کر دیا۔ لیکن دورِ ردِ عمل کے نقادوں نے بالعموم مرزا کو بڑا محبِ وطن ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ اور اُن کے کئی درد انگیز اشعار سے (بلا کسی ثبوت کے) استدلال کیا ہے۔ کہ وہ غدرِ دہلی کا مرثیہ ہیں۔ ڈاکٹر سید محمود "دیوانِ غالب" (نظامی ایڈیشن) کے شروع میں لکھتے ہیں۔ "۱۸۵۷ء کے ہنگامے کے بعد فاتح کے جوشِ انتقام نے مفتوح کے مُلک و دولت ہی پر قناعت نہ کی۔ بلکہ ان کے سرمایۂ ناز کارنامے اور فن و کمال یہاں تک کہ ان کی تہذیب کو مٹانے اور برباد کرنے میں کوئی کسر نہ اُٹھا رکھی تھی۔ یہ ممکن نہ تھا۔ کہ مرزا جیسے باکمال شاعر اور صاحب دل پر اس کا اثر نہ ہوتا۔ چنانچہ جس پوشیدہ مگر دردناک پیرائے میں اُنہوں نے اس کا مرثیہ لکھا۔ وہ حقیقتاً دِل ہلا دینے والا ہے۔ اور ہندوستان کی مٹی ہوئی عظمت کی یاد دلا کر خون کے آنسو رُلواتا ہے۔ اس کے چند اشعار نقل کئے بغیر دِل نہیں مانتا ؎

ظلمت کدے میں میرے شبِ غم کا جوش ہے   اک شمع ہے دلیلِ سحر سو خموش ہے"

ڈاکٹر صاحب کا یہ فرمانا بجا ہے۔ کہ یہ قطعہ بند غزل دل ہلا دینے والی ہے۔ لیکن یہ دہلی یا ہندوستان کا مرثیہ نہیں۔ بلکہ مرزا کی اپنی مصیبتوں کا بیان ہے۔ اور غدر کے بعد نہیں بلکہ غدر سے تیس ۳۰ سال پہلے سفرِ کلکتہ کے دوران میں لکھی گئی۔ اس کے کئی اشعار اس قلمی نسخے کے حاشیے پر درج ہیں۔ جو اس زمانے کا لکھا ہوا پروفیسر محمود شیرانی کے کُتب خانے میں محفوظ ہے۔ نیز اس کے کئی اشعار "گلشنِ بے خار" (مرتبہ ۱۸۳۲-۱۸۳۴ء) میں موجود ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے اور بھی کئی اشعار نقل کئے ہیں۔ جن کے متعلق ان کا خیال ہے۔ کہ وہ مرزا کی وطن پرستی کا اظہار اور ان مصائب کا بیان ہیں۔ جو غدر کے بعد شاہی خاندان پر پڑے ؎

گُلشن میں بندوبست برنگِ دگر ہے آج   قمری کا طوق حلقۂ بیرونِ در ہے آج

آتا ہے ایک پارۂ دل ہر فغاں کے ساتھ   تارِ نفس کمندِ شکارِ اثر ہے آج

لیکن یہ اشعار بھی غدرِ دہلی سے بہت پہلے لکھے گئے تھے۔ اور بھوپال اسٹیٹ لائبریری کے اس قلمی نسخے کے متن میں موجود ہیں۔ جو ۱۸۲۱ء میں نقل ہُوا۔

ڈاکٹر سید محمود کے ارشادات سے بھی زیادہ پُرجوش مولینا ابوالکلام آزاد کا ایک مضمون ہے۔ جو اُنہوں نے "الہلال" میں لکھا۔ اس میں وہ تحریر فرماتے ہیں۔ کہ مرزا غدرِ دہلی کے بعد کے واقعات سے بڑے متاثر ہوئے۔ اور مرزا کی غیرت و حمیت نے گوارا نہ کیا۔ کہ فتحِ دہلی کے بعد فاتح حکام کے سامنے جاکر عاجزی و خوشامد کریں" اور " ان کی طبیعت کچھ اس طرح بیزار ہوئی۔ کہ فتح کے بعد قلعہ میں وفادارانِ سرکاری جمع ہوئے انعامات اور سندیں ملیں ... مگر مرزا غالب اپنے بیت الحزن سے نہ نکلے اور کسی حاکم کے آگے جاکر اس کا منتقم و قاہر چہرہ نہ دیکھا" حقیقت یہ ہے۔ کہ اس بیان کا بیشتر حصہ واقعیت سے عاری ہے۔ مرزا غدر دہلی کے بعد کے واقعات سے ضرور متاثر ہوئے۔ لیکن اُنہوں نے ان کی بنا پر حکام سے عدم تعاون نہیں اختیار کیا۔ بلکہ واقعہ یہ ہے۔ کہ چونکہ غدر کے دوران میں اُنہوں نے بہادر شاہ کی تعریف میں ایک قصیدہ پڑھا تھا۔ اس لئے حکام نے ان کا خلعت بند کردیا۔ اور جب میرٹھ میں دربار ہُوا۔ تو انہیں دوسرے درباریوں کی طرح بُلایا نہ گیا۔ اِس کے بعد جب وہ دہلی میں چیف سیکرٹری سے ملنے گئے۔ تو انہیں جواب ملا۔ کہ ایامِ غدر میں تم باغیوں سے اخلاص رکھتے تھے۔ اب گورنمنٹ سے کیوں ملنا چاہتے ہو!

اس دَور کے قومی رجحانات کا کچھ اندازہ اس امر سے بھی ہوسکتا ہے۔ کہ اس زمانے میں ادب کے انہی شعبوں نے فروغ پایا۔ جن کی تشکیل میں قوتِ مشاہدہ سے زیادہ قوتِ متخیلہ کو دخل تھا۔ مثال کے طور پر ناول نویسی کو لیا جائے۔ اس فن نے اس زمانے میں خاصہ فروغ حاصل کیا۔ اور عبدالحلیم شرر۔ راشد الخیری۔ حکیم محمد علی ہمارے بہترین ناول نگاروں میں شمار ہوتے ہیں۔ اُن کی تصنیفات دیکھی جائیں۔ تو معلوم ہوگا۔ کہ قریباً سب کی سب تاریخی رومان ہیں۔ جن میں روزمرہ کی زندگی سے ہٹے ہُوئے واقعات بیان کئے گئے

ہیں۔ حقیقت نگاری کو ان میں کوئی دخل نہیں۔ افسانوی حقیقت نگاری کا کمال اسی میں ہے۔ کہ روزمرہ کے عام واقعات میں اس طرح رنگ بھرا جائے۔ کہ وہ دلچسپ معلوم ہوں۔ اور دوسرے انسانی فکر وعمل کی وہ جزئیات جنہیں عام اور اہم ہونے کے باوجود ہماری سطحی نظریں نہیں دیکھ سکتیں۔ انہیں اس طرح بے نقاب کیا جائے۔ کہ انسانی فطرت کے متعلق ہماری واقفیت میں اضافہ ہو۔ ہم فارسی شعرا کی معاملہ بندی سے واقف ہیں۔ جس میں ایک انسانی جذبہ (محبت) کے چند پہلوؤں کا بیان ہوتا ہے۔ لیکن حقیقت نگار ناول نویس کا میدان بہت وسیع ہوتا ہے۔ وہ کرداروں کے قول وفعل میں تمام انسانی جذبات مثلاً خوف۔ حرص۔ خودداری۔ حسد۔ محبت کی کارفرمائیاں اور انسانی فطرت کی تمام کشمکشیں اور الجھنیں نمایاں کرسکتا ہے۔ ہمارے ناول نویسوں میں یہ حقیقت پسندی بالکل مفقود ہے۔ وہ ناول میں انسانی عنصر (یعنی کرداروں) کی اہمیت ہی پوری طرح نہیں سمجھتے۔ کہ اپنے مشاہدے۔ تجربے اور معلومات کو کام میں لائیں۔ اور ان کرداروں کو زندہ حقیقی انسانوں کی طرح بشری خوبیوں اور کمزوریوں سے متصف کردیں۔ شررؔ۔ راشد الخیری اور محمد علی کے پلاٹ دلچسپ ضرور ہیں (اگرچہ بے تنوع) لیکن ان کے کردار بیشتر کاٹھ کے بے جان پتلے ہیں۔ جن کی موجودگی فقط پلاٹ کی تکمیل اور دلچسپی برقرار رکھنے کے لئے ہے۔ مصنف کو ان میں بطور ایک انسان کے کوئی دلچسپی نہیں۔ شررؔ اور محمد علی کے تمام تر ناول تاریخی رومان ہیں۔ جن میں دور دراز ملکوں اور قدیم گذرے ہوئے زمانوں کی داستانیں ہیں۔ مصنف کے اپنے تجربے اور مشاہدے کو استعمال کرنے کی ان میں بہت گنجائش ہی نہیں۔ راشد الخیری کے سب سے مقبول ناول بھی تاریخی رومان ہیں۔ مثلاً ماہِ عجم۔ یاسمینِ شام۔ آفتابِ دمشق۔ اور جن ناولوں میں اپنے گردوپیش کے واقعات ہیں۔ اُن میں بھی حقیقت نگاری پر خاص توجہ نہیں۔ کردار ان کے بھی اکثر بے جان ہیں۔ اور مُصنف نے بیشتر توجہ اصلاحی اور معاشرتی مسائل نمایاں کرنے پر صرف کی ہے۔

یہ صحیح ہے کہ اسی زمانے میں ایک اُردو افسانہ نویس نے حقیقت نگاری کو خاص طور پر

ملحوظِ خاطر رکھا۔ اور ہماری معاشرت بالخصوص ان پڑھ دیہاتیوں اور متوسط طبقے کی سماجی زندگی کی صحیح تصویر پیش کی۔ لیکن وہ افسانہ نویس مسلمان نہ تھا۔ ہندو تھا۔ پریم چند بی۔اے!

اس دَور کے ادب کے متعلق ایک اور قابلِ ذکر حقیقت یہ ہے۔کہ اس زمانے میں تاریخ سے بالخصوص ہندوستان کی تاریخ سے بے اعتنائی برتی گئی۔ ہندوستانی مسلمانوں کو اپنے حال اور ماضی سے ہمیشہ گہری دلچسپی رہی ہے۔ اور فارسی میں جو صدیوں اُن کی ادبی زبان رہی ہے۔کئی بلند پایہ تاریخی اور سوانحی تصانیف ہیں۔"فتوحاتِ فیروزشاہی" "توزکِ بابری" توزکِ جہانگیری" تو ایسی کتابیں ہیں۔ جو تاریخی دلچسپی کے علاوہ ادبی اور نفسیاتی نقطۂ نظر سے بھی بے حد دلچسپ ہیں۔ اس کے علاوہ تقریباً ہر عہد میں کوئی نہ کوئی بلند پایہ مورخ پیدا ہُوا ہے۔جس نے اپنے یا اپنے پیش رووں کے حالات بڑی تفصیل سے لکھے ہیں۔ یہ صحیح ہے۔کہ اگر ان کتابوں کو روائت اور درائت کے اصولوں سے تنقیداً دیکھا جائے۔تو بعض میں کئی غلطیاں بھی نظر آتی ہیں۔لیکن اس سے ان کی اہمیت یا دلچسپی کم نہیں ہوجاتی۔ ضیاء الدین برنی۔ منہاج۔ سراج۔ بابر۔ گلبدن بیگم۔ ابوالفضل۔ عبدالقادر بدایونی۔ شاہ عبدالحق محدّث۔ جہانگیر۔ خواجہ ابوالحسن مُصنف جہانگیرنامہ۔ مُلا عبدالحمید مصنف بادشاہ نامہ۔ خافی خاں۔میر غلام علی آزاد بلگرامی اور مُلا محمد قاسم فرشتہ کے علاوہ دوسرے متعدد قابلِ ذکر مؤرخ اور تذکرہ نویس ہیں۔جنہوں نے ہندوستان بالخصوص اسلامی عہدِ حکومت کے تفصیلی حالات صفحۂ کاغذ پر ثبت کئے ہیں۔ علی گڑھ تحریک کے دوران میں بھی اس تحریک کے راہنماؤں نے اپنی تاریخ سے دلچسپی برقرار رکھی ہے۔ سرسید نے خود "آئینِ اکبری" اور ضیاء الدین برنی کی کتاب "تاریخِ فیروزشاہی" کی تصحیح کی۔ اور اُن کی کتاب "آثار الصنادید" بھی ایک مورخ کے لئے بڑی کار آمد ہے۔ مولوی ذکاءاللہ نے اس زمانے میں ہندوستان کی مفصل تاریخ لکھی۔ اور مولٰینا شبلی نے بھی سرسید کے زیرِ اثر تاریخ سے دلچسپی پیدا کی۔ مولٰینا کی بہت سی تاریخی کتابیں قیامِ علی گڑھ کے دوران میں لکھی گئیں۔ اور بعض جو اس

زمانے میں شروع ہوئی تھیں۔ قیامِ علی گڑھ کے بعد ختم ہوئیں ⁂

جس دَور کا ہم ذکر کر رہے ہیں۔ اُس میں شائع شدہ کتابوں کی تعداد کے لحاظ سے تاریخی
مباحث پر نسبتاً بہت کم کتابیں تصنیف ہوئیں۔ اور ہندوستان کے متعلق جو اس زمانے
کی تاریخی کتابیں ہیں۔ اُن کی تعداد تو اُنگلیوں پر گنی جا سکتی ہے۔ مولینا شبلی جو اس زمانے
کے سب سے بڑے مورخ ہیں۔ ان کی بھی توجہ بہت حد تک سیاسیات، ادب اور سیرت کی
طرف رہی۔ اور ہندوستان کی تاریخ کے متعلق تو اُنہوں نے چند منتشر مضامین سے مُستزاد
(مثلاً مضامینِ عالمگیر جو پہلے "الندوہ" میں شائع ہوئے تھے) کبھی کچھ نہیں لکھا۔ مولینا عبدالحلیم
شرر نے اسی زمانے میں چند تاریخی سوانح عُمریاں اور کئی تاریخی مضامین لکھے۔ لیکن اُن میں بھی
صرف دو تین ہندوستان کے متعلق ہیں۔ حقیقت یہ ہے۔ کہ چونکہ ہندوستانی مُسلمانوں کی
آنکھیں اس وقت ہندوستان سے باہر لگی ہُوئی تھیں۔ اس لئے اُنہوں نے ہندوستان
کی تاریخ پر بہت توجہ نہ کی۔ اس کے علاوہ چونکہ اب سرسیّد اور حالؔی کے وہ اصُول نظر
سے اوجھل ہو گئے تھے۔ جن کے زیر اثر قوم نے واقعات کی قدر و اہمیت سیکھی تھی۔
اس لئے تاریخی واقعات بھی رنگین بیانی اور داستان سرائی کی چاٹ کے بغیر بے مزہ معلوم
ہونے لگے۔ حتےٰ کہ تاریخی تصانیف کی جگہ تاریخی ناولوں نے لے لی۔ اور قوم کے مقبول ترین
مورخ اور اُن کے ساتھی بھی اس بات پر فخر کرنے لگے۔ کہ ان کی تاریخی تصانیف واقعات
کی کھتونیاں نہیں۔ حُسن و عشق کی داستانیں ہیں!!

اس دور کے قومی رجحانات کا ذکر ہم نے کسی قدر تفصیل سے کر دیا ہے۔ لیکن ان رُجحانات
کے سب سے مُضر نتیجے کا ذکر ابھی باقی ہے۔ ہم لکھ چکے ہیں۔ کہ اس دَور میں مغربی برتری
کے خلاف جو ردِّ عمل ہُوا۔ اُس کے زیر اثر قوم میں ایک طرح کی خود پسندی اور جذباتی
ذہنیت آ گئی۔ پہلے اگر مغرب کی ہر چیز کو برتر سمجھا جاتا تھا۔ تو اب اپنی ہر ایک چیز بے عیب
اور دوسروں سے اچھی نظر آنے لگی۔ اس ذہنیت کا قدرتی نتیجہ تھا۔ کہ ع

کارواں کے دل سے احساسِ زیاں جاتا رہا

غدر کے بعد ہندوستانی مسلمانوں کی جو خستہ حالت ہوگئی تھی ۔ اس نے بہتوں کی آنکھیں کھول دی تھیں ۔ اور جو ابھی غفلت میں تھے ۔ انہیں حالیؔ کی نظموں اور سرسید کی تقریروں نے بیدار کر دیا تھا ۔ اب قوم میں اپنی پستی اور اصلاح کی ضرورت کا عام احساس تھا ۔ پستی سے ابھرنے کے لئے پہلی شرط یہ ہے ۔ کہ اپنی پستی کا احساس کیا جائے ۔ یہ احساس علی گڑھ تحریک کے زمانے میں عام تھا ۔ چنانچہ اس زمانے میں اصلاح کی بھی عالم گیر کوششیں ہوئیں ۔ "علی گڑھ کالج" ۔ "ایجوکیشنل کانفرنس" ۔ "انجمن حمایتِ اسلام لاہور" ۔ "ندوۃ العلماء" "دارالعلوم دیوبند" ۔ اِن سب کا قیام اسی زمانے میں ہُوا ۔ اُردو ادب کی اصلاح بھی اسی زمانے میں ہوئی ۔ اور مسلمانوں کی تعلیمی اور اقتصادی پستی کا کسی حد تک علاج ہوا ۔ اور ردِّ عمل کے زمانے میں پستی کا یہ احساس جاتا رہا ۔ چنانچہ اصلاحی کوششیں بھی کمزور ہوگئیں ۔ اور جمہور کی بیداری کے باوجود اس زمانے میں ٹھوس تعمیری کام بہت تھوڑے ہُوئے ۔

ہم بیان کر چکے ہیں ۔ کہ علی گڑھ تحریک کے خلاف جو ردِّ عمل ہُوا اُس کی بنا و تنظیم میں مولٰینا شبلی کو بڑا دخل تھا ۔ لیکن مولٰینا علیگڑھ تحریک کے بھی ایک ممتاز رکن رہے تھے[1] ۔ اُنہوں نے قریباً سولہ سال علیگڑھ کالج میں سر سید کے ساتھ کام کیا تھا ۔ اور قوم کی اصلاح کے لئے ٹھوس اور نتیجہ خیز کوششیں ہوتی دیکھی تھیں ۔ یہ قدرتی امر تھا ۔ کہ انہیں نئی تحریک کے نوجوان راہنماؤں کا بے نتیجہ جوش و خروش اور عدم توازن ناپسند ہوتا چنانچہ اُنہوں نے اس موضوع پر دو بڑی پُر معنی نظمیں لکھی ہیں ۔ اور ہم اس باب کو ان کے چند اشعار پر ختم کرتے ہیں ۔ جو اُنہوں نے "جزر و مد" کے عنوان سے اخیر عمر میں لکھے ؎

دیکھ کر حدّتِ فکر کا یہ دَورِ جدید	سوچتا ہُوں کہ یہ آئینِ خرد ہے کہ نہیں
رہنماؤں کی یہ تحقیر بہ اندازِ کلام	اس میں کچھ شائبۂ رشک و حسد ہے کہ نہیں
نکتہ چینی کا یہ انداز یہ آئینِ سخن	بزمِ تہذیب میں مستوجبِ رد ہے کہ نہیں
پہلے گر شانِ غلامی تھی تو اب خیرہ سری	اس دورا ہے میں کوئی بیچ کی حد ہے کہ نہیں
فیصلہ کرنے سے پہلے مَیں ذرا دیکھ تو لُوں	جزر جیسا تھا اسی زور کا مد ہے کہ نہیں

[1] خود کہتے ہیں ؎ دو دل بودن درین رہ سخت تر عیبے ست سالک را ۱۷۸ خجل گشتم ز کفر خود کہ دارد بُوئے ایماں ہم

اِقبال

اقبال

تمہید ہم ان کوششوں کا ذکر کر چکے ہیں - جو علوم اسلامی کی اشاعت اور قوم کی مذہبی اور علمی اصلاح کے لئے غدر کے بعد ہندوستان کے مختلف حصوں میں ہوئیں - یہ سبھی کوششیں قابلِ قدر ہیں - اور سر سید احمد - سید امیر علی - مولانا محمدؐ قاسم نانوتوی - مولانا محمود الحسن - مولانا ابوالکلام آزاد سب قوم کے محسن تھے - ان بزرگوں کی قابلیت - مذہبی جوش اور دینی ہمدردی میں شک نہیں - لیکن ان کی مذہبی کوششیں دو دائروں میں محدود تھیں - سر سید - سید امیر علی اور مولوی چراغ علی نے مذہب اسلام کے چند مسائل کو نئے انداز میں پیش کیا - اور مذہب اسلام کو مغربی علوم اور سائنس کے مُطابق ثابت کیا - ان لوگوں نے اپنے خیال کے مطابق مذہب میں بڑے اجتہاد سے کام لیا - لیکن شائد یہ کہنا صحیح ہے کہ ان کا اجتہاد تقلیدی اجتہاد تھا یعنی اگرچہ اُنہوں نے عقائد اسلام کی ترجمانی میں اجتہاد کیا - لیکن اصُولی باتوں میں یعنی مذہبی معیار قائم کرنے اور مذہب کے پرکھنے کے اصول معین کرنے میں مغربی مصنفین کی پیروی کی - دوسرے طبقے میں مولانا محمدؐ قاسم نانوتوی - مولانا محمود الحسن - مولانا ابوالکلام آزاد اور دوسرے علما آتے ہیں - مولانا محمدؐ قاسم نے مدرسۂ دیوبند قائم کر کے اور مولانا محمود الحسن اور دوسرے بزرگوں نے اسے کامیابی سے چلا کر مُلک کو علومِ اسلامی کا ایک ایسا سرچشمہ دے دیا - جس سے ہزاروں مسلمان فیض یاب ہوئے ہیں - ان بزرگوں کی کوششوں نے جمہور کے خیالات پر بڑا اثر ڈالا - اور عوام کو مذہب سے جو ناواقفیت تھی - اُسے دُور کیا - لیکن نئی نسل پر ان کا اور مدرسۂ دیوبند کا اتنا اثر نہ پڑا - نئی نسل کے

خیالات کی اصلاح میں مولانا ابوالکلام آزاد کا حصہ زیادہ ہے۔ انہوں نے اپنے زوردار قلم کو مذہبی احیاء کے لئے استعمال کیا۔ اور جدید متکلمین کے نقائص قوم پر پوری طرح واضح کر دئے۔ لیکن نئی نسل کی راہنمائی کے لئے فقط یہی کافی نہ تھا۔ کہ اُسے ایک رستے کی مضرتوں سے آگاہ کر دیا جائے۔ یا زوردار طرزِ تحریر سے اسلام اور قُران سے ایک طرح کا جذباتی اُنس پیدا کر دیا جائے۔ قوم کی مذہبی راہنمائی کے لئے ضروری تھا۔ کہ ضروریاتِ حال کے مُطابق صراطِ مُستقیم کی بھی پُوری طرح توضیح ہو۔ اور اسلامی عقائد اور فلسفے کی ایسی تنظیم کی جائے۔ جسے رسماً یا تقلیداً یا جوش اور جذبات سے متاثر ہو کر نہیں، بلکہ سوچ سمجھ کر مغربی علوم سے موازنہ کر کے، اور اس کی فوقیت کا اندازہ لگا کر لوگ چراغِ راہ بنائیں۔ مولانا ابوالکلام آزاد اگر اپنے آپ کو فقط مذہب کے لئے وقف رکھتے۔ تو غالباً یہ سب کچھ کر سکتے تھے۔ لیکن اُن کی دوسری دلچسپیوں نے انہیں اس کا موقع نہ دیا۔ یہ سعادت اقبالؔ کی قسمت میں لکھی جا چکی تھی!

اقبالؔ ایک ایسے گھر میں پیدا ہُوا۔ جہاں مذہب پر خاص زور دیا جاتا تھا۔ اسلام کی محبت اور مذہب سے دلچسپی اُسے وراثت میں ملی۔ اور مغربی علوم اور مغربی فلسفے کی انتہائی تکمیل اُس نے مغربی درس گاہوں میں کی۔ ان دونوں کا مجموعہ اقبالؔ کی دلچسپ شخصیت ہے۔ اقبالؔ مذہب اسلام سے بھی پوری طرح آگاہ ہے۔ اور مغربی فلسفے کی بھی کوئی خوبی یا خامی اس کی نظر سے نہیں چھُپی۔ لیکن نہ تو مذہب اسلام کا مطالعہ کرتے وقت اس نے تقلیدِ سلف کی پٹی آنکھوں پر باندھی ہے۔ اور نہ وہ مغرب اور فلسفۂ مغرب کی برقی روشنی سے چندھیا گیا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اسے چشمِ بصیرت عطا کی۔ جس کی مدد سے اس نے مشرق و مغرب کے مذاہب اور ایشیا اور یورپ کے فلسفوں کا نقادانہ مطالعہ کیا۔ اُس کے فطری فہم و فراست نے اس پر یہ راز بے نقاب کر دیا کہ اگر پرانے علما کی نظر اسلام کے ظاہری اور فقہی پہلوؤں پر

زیادہ ہے اور وہ بالعموم اسلام کی گہری خوبیوں اور برکتوں کو سمجھنے سے قاصر رہے ہیں تو ہمارے نئے راہبر بھی صراطِ مستقیم پر نہیں جا رہے۔ اور اُن کا تقلیدی اجتہاد بھی قوم کو بہت دُور نہیں لے جا سکتا۔ مغربی فلسفے اور سائنس کو خود دوام نہیں۔ کل نیوٹن کے جس نظریے کو اٹل سمجھا جاتا تھا۔ آج اُسے آئن سٹائن نے رد کر دیا ہے۔ ایسی صورت میں مذہب کو ایسی غیر پائندہ بنیادوں پر کھڑا کرنے سے فائدہ؟ اقبالؔ نے اسی لئے مذہب اسلام کی ترجمانی نئے اصولوں اور زیادہ مستحکم بنیادوں پر کی ہے *

اقبالؔ نے مذہب کے لئے جو معیار قائم کیا ہے وہ اس کے عام فلسفۂ زندگی کا ایک جزو ہے لیکن جیسا کہ اس نے بار بار کہا ہے اس کا فلسفۂ زندگی خالص اسلامی ہے۔ اور اس کے تمام اجزا اور پہلو بھی اسلامی ہیں۔ اقبالؔ کے فلسفے کا موضوع انسان ہے اور اس کا مقصد کامل ترین انسان کی نشوونما۔ اقبالؔ نے اپنے مقصد کی توضیح اپنی نظموں میں جا بجا کی ہے۔ لیکن اس کا بہترین اظہار رومیؔ کے وہ قطعہ بند اشعار ہیں جنہیں اس نے تبرکاً اور توضیحاً اپنی کتاب "اسرارِ خودی" کے عین آغاز میں درج کیا ہے ؎

دی شیخ با چراغ ہمے گشت گردِ شہر — کز دام و دد ملولم و انسانم آرزوست

زیں ہمرہانِ سُست عناصر دلم گرفت — شیرِ خدا و رستمِ دستانم آرزوست

گفتم کہ یافت می نشود جستہ ایم ما

گفت آں کہ یافت می نشود آنم آرزوست

اقبالؔ نے اس مقصد کی تکمیل کے لئے اپنی شاعری وقف کر دی۔ اُس نے "پیامِ مشرق"۔ "زبورِ عجم" "جاوید نامہ" اور دوسری کتابوں میں ان حقائق کا انکشاف کیا ہے۔ جو اس مقصد کے حصول میں مفید ہیں لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ اقبالؔ کے فلسفے کا واضح ترین اظہار اس کی فارسی مثنویاں "اسرارِ خودی" اور "رموزِ بے خودی" ہیں۔ دوسری جگہ جو خیالات 'بہ رمز و ایما' بیان ہوئے ہیں۔ اُن کا اظہار یہاں صاف صاف ہے اور کوئی شخص

جس نے ان دو کتابوں کا بغور مطالعہ نہیں کیا اقبالؔ کے فلسفے کو نہیں سمجھ سکتا +

اقبالؔ نے اپنے فلسفے کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ ایک تو انسان کی وہ نشو و نما، جو ذاتی اور انفرادی طور پر ہوتی ہے۔ اس کا ذکر "اسرارِ خودی" میں ہے۔ "رموزِ بے خودی" میں انسانی تربیت اور ارتقا کی اس منزل کا ذکر ہے جو انسان اجتماعی طور پر اور ایک ملت کا جزو ہو کر طے کرتا ہے۔ اقبالؔ کے فلسفے کا ماحصل یہ ہے کہ انسان ذاتی محنت اور اصلاحی کوششوں سے (۱) "اطاعت"، (۲) "ضبطِ نفس" اور (۳) "نیابتِ الٰہی" کی تین منزلیں طے کرتا ہوا خودی کی انتہائی بلندی پر پہنچے۔ اور اپنی ان روحانی اور مادی ترقیوں کو ملت کے لئے وقف رکھے۔ لیکن آدمی کو انسانیت کی ان بلند ترین چوٹیوں پر چڑھنے کے لئے مذہب کی ضرورت ہے۔ اور اقبالؔ کے خیال میں مذہب کی صداقت اور قدر و قیمت کا معیار یہی ہے کہ وہ انسان کو اس عظمت پر پہنچانے میں مفید ہو۔ اور بہترین مذہب وہی ہے جو اس مقصد کے حصول میں سب سے زیادہ مدد پہنچاتا ہے۔ بہترین مذہب وہ نہیں جس کے اعتقادات کو سائینس اور مغربی فلسفے کی چھلنی میں اس طرح چھانا جائے کہ اس میں فقط مادیت اور تشکک کی باریک ریت ہی رہ جائے! گولڈ اسمتھ نے ایک جگہ بہترین آرٹ کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ بے عیب ہونا آرٹ کی سب سے بڑی خوبی نہیں۔ آرٹ کے بہترین شاہکاروں میں عیب بھی ہوتے ہیں۔ لیکن اُن کی خوبیاں عیبوں کی نسبت بہت زیادہ اور وقیع ہوتی ہیں۔ مذہب کا بھی یہی حال ہے۔ بے شک یہ ممکن ہے کہ تاویل و توضیح سے ایک مذہب کو سولہ آنے سائینس کے مطابق بنا دیا جائے۔ لیکن اگر اِسی کوشش میں مذہب خود بے جان ہو گیا۔ اور اس کی مفید ہونے کی قابلیت جاتی رہی تو اس کوشش سے فائدہ؟ اقبالؔ نے بھی اسی لئے اسلام کے متعلق اعتراضات کا جواب دینے کی کوشش نہیں کی اور نہ اس کی فروعی اور جزوی باتوں کے متعلق کرید کی ہے کہ آیا وہ موجودہ سائینس کے عین مطابق ہیں یا نہیں۔

لیکن اس نے اسلام کو اس اصُولی معیار پر پرکھا ہے۔ کہ آیا اسلام انسان کو انسانیت کی معراج پر پہنچنے کے لئے مفید ہے یا نہیں۔ اور وہ جس نتیجے پر پہنچا ہے وہ یہ ہے سہ

ہست دینِ مُصطفےٰ دینِ حیات　　شرعِ او تفسیرِ آئینِ حیات
گر زمینی آسماں سازد ترا　　آنچہ حق می خواہد آں سازد تُرا
خستہ باشی استوارت می کند　　پُختہ مثلِ کوہسارت می کُند!

اس سوال کا جواب کہ اسلام کس طرح آدمی کو انسانیت کی معراج تک پہنچانے میں مفید ہے اقبال نے "رموزِ بے خودی" میں دیا ہے اور ارکانِ اسلامی کی تشریح کرتے ہُوئے ان حقائق کو بے نقاب کیا ہے۔ جن کی وجہ سے یہ "دینِ حیات" کہلانے کا مستحق ہے۔ ہم نے شاہ اسمٰعیل شہیدؒ کی کتاب "تقویت الایمان" کا ذکر کرتے ہوئے بتایا ہے کہ یہ کتاب کلمۂ توحید لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ مُحمَّدُ الرَّسُولُ اللّٰہ کی تفسیر ہے۔ اقبال بھی اسی طرح انسان کی اصلاح کے لئے توحید اور رسالت پر زور دیتا ہے۔ جو اسلام کے اصولی عقائد ہیں اور جن کا مجموعہ کلمۂ توحید ہے!

توحید توحید اسلامی عقائد کی جان ہے۔ قران۔ حدیث۔ فقہ ہر جگہ اس کی توضیح اور اس کی اہمیت پر زور دیا ہے۔ فقہی کہتے ہیں کہ چھوٹے موٹے گناہ تو معاف ہو سکتے ہیں۔ لیکن شرک کا گناہ سب گناہوں سے بڑا ہے۔ کلام مجید کا بیشتر حصّہ توحید کی عظمت اور شرک کے نقائص پر مشتمل ہے۔ اسلام کے پانچ ارکان گنے جاتے ہیں۔ کلمۂ توحید کا اقرار۔ نماز۔ روزہ۔ زکوٰۃ۔ حج۔ لیکن باقی چاروں کا ملا کر کلام مجید میں جتنی دفعہ ذکر آیا ہوگا۔ توحید کا اس سے کہیں زیادہ ذکر کیا گیا ہے۔ نماز خدا سے رشتہ جوڑنے کی بڑی سبیل ہے۔ لیکن قرآن میں نماز کا ذکر پانچ جگہ ہوگا تو توحید کا پچاس جگہ۔ بار بار ارشاد ہوتا ہے کہ ایک خدا کو معبُود سمجھو اور اس کے علاوہ کسی کے آگے سر نہ جھکاؤ۔ شرک کی سزا بہت سخت ہے اور اگلی قومیں توحید کی

خلاف ورزی کرنے سے تباہ ہوئیں +

اسلام کے علاوہ دوسرے مذاہب میں بھی وحدانیتِ الٰہی کا عقیدہ کسی نہ کسی شکل میں رائج ہے یہودی ایک خدا کو مانتے ہیں عیسائی بھی کہتے ہیں کہ اُن کا عقیدۂ تثلیث عقیدۂ توحید کی ایک قسم ہے۔ سکھ اور برہمو سماجی وغیرہ بھی ایک خدا کو ماننے والے ہیں لیکن ان میں سے کسی ایک مذہب نے عقیدۂ توحید پر اتنا زور نہیں دیا جتنا اسلام نے۔ اور جن لوگوں نے مختلف مذاہب پر حکیمانہ نظر ڈالی ہے وہ جانتے ہیں کہ مذاہب میں اہم اختلاف اس بارے میں عموماً نہیں ہوتا کہ ایک کے اخلاقی اصول دوسرے میں تسلیم نہیں کئے جاتے۔ کیونکہ مذاہب کے اخلاقی احکام مثلاً چوری نہ کرو جھوٹ نہ بولو وغیرہ تمام بڑے مذاہب میں تسلیم کئے جاتے ہیں۔ لیکن ان میں اہم فرق اس بارے میں ہوتا ہے کہ وہ کس حکم کو، کس عقیدے کو اہم سمجھتے ہیں اور کس کو نسبتاً کم اہم۔ عقائد اور احکام کی یہی ترتیب اور یہی تدریج ہے جو مذاہب کے ماننے والوں پر اثر کرتی ہے۔ اور ان کے اخلاق و اطوار اور ذہنیت کو کم و بیش کسی خاص رنگ میں رنگ دیتی ہے۔ مثلاً جین مذہب میں کئی باتوں کا ذکر ہے لیکن جتنا زور "اہنسا" پر ہے کسی اور بات پر نہیں۔ اور اگرچہ دوسروں کو دُکھ نہ دینے کی فضیلت ہر ایک بڑے مذہب میں تھوڑی بہت بتائی گئی ہے۔ لیکن کسی نے اس پر اتنا زور نہیں دیا۔ جتنا جین مذہب نے اور اگر اس نیکی کو جین فلسفۂ اخلاق کی رُوح کہیں تو بجا ہے۔ اِسی طرح عیسائی مذہب میں "انکسار" پر اتنا زور دیا جاتا ہے۔ کہ مسیحی فلسفۂ اخلاق کی جان یہی نیکی ہے[1]۔ پادری اور عیسائی مذہب کے دوسرے ترجمان جب کسی شخص کو مسیحی زندگی کا بہترین

---

[1] نٹشے نے اپنی کتاب شجرۃ الاخلاق (Genealogy of Morals) میں اخلاق کی دو قسمیں بیان کی ہیں۔ ایک تو غلاموں کے اخلاق مثلاً انکساری۔ عاجزی۔ رہبانیت وغیرہ۔ دوسرے شریف اور برتر انسانوں کے اخلاق مثلاً ہمت۔ جرأت وغیرہ۔ اُس نے عیسائی کتب سے ثابت کیا ہے کہ مسیحی فلسفۂ اخلاق میں انہی اخلاق پر زیادہ زور دیا ہے۔ جو محکوم عیسائیوں اور یہودیوں کو رومن حاکموں کے ساتھ تعلقات ہموار رکھنے میں مفید تھے۔ اور وہ اخلاق

نمونہ کہہ کر پیش کرتے ہیں تو اُسے "Christian Lamb" (مسیحی میٹھا) کہکر پکارتے ہیں۔ اب اگرچہ اسلام میں بالخصوص عجمی کتبِ اخلاق میں انکسار کے فوائد کا ذکر ہے لیکن کہیں بھی اس پر اتنا زور نہیں کہ اُسے اسلامی فلسفۂ اخلاق کی جڑ کہا جا سکے۔

جو چیز اسلامی فلسفۂ اخلاق یا اسلامی مذہب کی جان ہے اس کے متعلق قرآن کسی شبہ کی گنجائش نہیں چھوڑتا۔ یہ توحید ہے۔ ایک خدا کو معبود سمجھنا۔ اور کسی دوسرے کے آگے سر نہ جھکانا۔ تمام قرآن میں اسی اصول کی توضیح اور تشریح ہے۔ اور دلائل سے، بُرے نتیجوں سے ڈرا کر موسےٰؑ اور فرعونؔ، خلیلؑ اور نمرودؔ کی مثال دے کر اسی حقیقت کو واضح کیا ہے۔ بعض دوسرے مذاہب میں بھی وحدانیت الٰہی کا تھوڑا بہت اقرار موجود ہے لیکن اسلام، بالخصوص قرآن نے اس پر جتنا زور دیا ہے اس کی بنا پر کہا جا سکتا ہے کہ جس طرح "اہنسا" جینی اور "انکسار" مسیحی فلسفۂ اخلاق کی جان ہے۔ اسی طرح توحید اسلام کا طرۂ امتیاز ہے۔ لیکن قرآن کی نظروں میں توحید محض ایک عقیدہ نہیں۔ محض ایک شعور عقلی نہیں جس میں جذبات اور احساسات شریک نہ ہوں۔ ایک ہاتھ کی پانچ اُنگلیاں ہیں۔ آنکھ انہیں دیکھتی ہے اور عقل یہ بات قبول کر لیتی ہے۔ یہ ایک شعور عقلی ہے۔ احساس، جوش، اور جذبات سے مبرّا! لیکن وہ توحید جس پر قرآن زور دیتا ہے محض شعورِ عقلی نہیں۔ محض یہی اقرار نہیں کہ خدا ایک ہے اور دو یا تین یا کم و بیش نہیں۔ بلکہ ایک ایسا احساس ہے جو جان اور دل پر طاری ہے۔ توحید ماننے کو اقرار یا اعتقاد نہیں کہا گیا۔ بلکہ ایمان کے لفظ خاص سے واضح کیا ہے۔ جو شخص توحید پر قرآنی معنوں میں ایمان رکھتا ہے وہ صرف یہی نہیں مانتا کہ خُدا ایک ہے بلکہ اس کا ایمان ہے یعنی اس کا دل مانتا ہے اور اس کی زندگی اس احساس کی تفسیر ہوتی ہے کہ اس ذاتِ واحد کے سوا کوئی چیز قابلِ پرستش نہیں اس کے سوا کوئی طاقت نہیں۔ انسانی یا غیر انسانی جس کے آگے سر جھکایا جائے، یا جس سے ڈرا جائے یا جس سے مدد مانگی جائے۔ اسی ذاتِ واحد سے رشتہ جوڑنا چاہیئے۔

اسی کے احکام کی تعمیل کرنی چاہیئے۔ اُسی سے مدد مانگنی چاہیئے۔ اسی کی مرضی پر شاکر رہنا چاہیئے۔ اور اُسی کے احکام کے مُطابق اپنی زندگی بنانی چاہیئے۔ یہی ہے "اسلام"۔ اور جس شخص کا ذاتِ واحد سے یہ رشتہ ہو وہی "مسلم" ہے۔

صحابہؓ کرام اور وہ خوش قسمت ہستیاں جنہیں رسول اکرمؐ کی زبانی توحید کی توضیح سُننی نصیب ہُوئی یا جنہیں اپنی آنکھوں سے دُنیا کے سب سے بڑے مُوحّد، سب سے بڑے مومن کی سیرت دیکھنی نصیب ہوئی۔ وہ توحید کے رازِ سربستہ اور اس مسئلے کی حقیقت سے خوب واقف تھے۔ جس کی اشاعت کی خاطر رسول اکرمؐ نے دنیا کی سب مصیبتیں جھیلیں۔ اُنھوں نے نہ صرف بُتوں کو توڑ ڈالا اور بُت پرستی ترک کر دی بلکہ توحید کو سمجھنے اور اس پر ایمان لانے کی بدولت ان کی زندگیوں میں ایسا انقلاب ہُوا کہ اُنھوں نے دُنیا کا نقشہ بدل ڈالا اور قیصر و کسرےٰ کے جبر و استبداد کی بنیادیں اکھیڑ دیں۔ یہی وہ لوگ تھے۔ غریب۔ بدحال۔ فاقہ کش جو قیصر و کسرےٰ تو ایک طرف بے جان پتھر کی مُورتوں کے آگے سجدے کیا کرتے تھے۔ لیکن جب توحید کے نُور نے ان کے دل و جان کو منور کیا تو جس بے خوفی، شان اور جرأت سے وہ اپنے پھٹے پُرانے کپڑے پہنے، ٹیڑھی اور کُند تلواریں اور تکلوں جیسے نیزے لئے شہنشاہوں کے درباروں میں جاکر سچائی کا پیغام دیتے تھے۔ وہ اسی انقلاب کا اثر تھا جو توحید کے سمجھنے اور اس پر ایمان لانے سے اُن کی زندگی میں ہُوا تھا۔ جب جنرل قتیبہؔ نے اپنے سفیر چینؔ کے دربار میں بھیجے اور وہ شہنشاہ ہیونؔ سنگ کے دربار میں پیش ہوئے اور اُن سے کہا گیا کہ وہ جُھک کر درباری سجدہ بجالائیں۔ تو اُنھوں نے صاف انکار کر دیا۔ "اپنے مُلک میں ہم صرف خُدا کے آگے جُھکتے ہیں۔ کسی بادشاہ کے آگے نہیں! اُنہیں ڈرایا گیا۔ مارنے کی دھمکیاں دی گئیں۔ لیکن جو گردنیں فقط اللہ کے آگے جُھکتی ہیں۔ اللہ کا خوف انہیں غیر اللہ کے خوف سے نجات دلا دیتا ہے۔ سب دھمکیوں کا ایک ہی جواب تھا کہ "ہم خُدا کے سوا کسی سے نہیں ڈرتے"!

قرآن میں، حدیث میں، اور رسولِ اکرمؐ کی زندگی میں توحید کا یہ وسیع مفہوم پوری طرح عیاں ہے کہ یہ عقائد ہی پر نہیں بلکہ کردار پر بھی حاوی ہے۔ لیکن عقائد کی تشریح اور علما کی تفسیروں میں اس پر پردہ پڑتا گیا۔ انسانی تاریخ کے مطالعہ سے ظاہر ہے۔ کہ جب ایک بڑا مفکّر یا پیغمبر زندگی کے کسی اہم رازِ سربستہ سے پردہ اُٹھاتا ہے۔ اور حقیقت کو برہنہ اور زندہ صورت میں پیش کرتا ہے۔ تو اس کے کم فہم مقلدین جو حقیقت کو عریاں دیکھنے کے متحمل نہیں ہوتے۔ فارمولوں اور قواعد اور اصولوں سے اُس زندہ حقیقت کا تجزیہ کرتے ہیں۔ اس طرح اس حقیقت کی رُوح جذب ہو جاتی ہے۔ اور وہ اسے بے جان بناکر اپنے لئے قابلِ فہم بناتے ہیں۔ توحید کا بھی یہی حال ہُوا۔ اسلامی توحید جو اپنے وسیع قرآنی مفہوم میں دُنیا کی اہم ترین اخلاقی طاقت تھی۔ علما اور متصوفین کے ہاتھ میں علم العقائد کا ایک مسئلہ بن گئی۔ کم نظر لوگ جن کا مافی الضمیر قرآن کے خدا میں بھی وہی بُت ڈھونڈنا چاہتا تھا جن کی انسانی فطرت عادی ہو چکی تھی اور جنہیں تباہ کرنا اسلام کا عین مقصد تھا۔ وہ تو اپنی کم نظری سے ان مسائل میں پڑ گئے۔ جن میں غیر ضروری اور غیر مفید تجسّس سے اللہ اور رسول نے مصلحتاً منع کیا تھا[1]۔ اور ذاتِ واحد کی ہیئت، شکل، صُورت اور اس کی کُرسی کی وسعت اور ماہیت یا اِس طرح کی دوسری باتوں میں زورِ دماغ صرف کرنے لگے۔ صوفیہ جنہوں نے سمجھا کہ وہ ذات ہستی جسے قرآن میں شاہ رگ سے بھی قریب بتایا گیا ہے۔ اور جو انسان کے اندر اور باہر ہر جگہ موجود ہے۔ اسے اِس طرح مقیّد اور معیّن کرنا اور انسانی دُنیا سے باہر اور دُور ایک چیز سمجھنا قرآنی تعلیمات کے خلاف ہے۔ وہ اس غلطی میں تو نہ پڑے۔ لیکن توحید قرآنی کے وسیع اور اخلاقی مفہوم کی تاب وہ بھی نہ لا سکے۔ اور وحدت الوجود کے بھنور میں پڑ گئے۔ نتیجہ یہ ہُوا کہ توحید کی

---

[1] قوم کے ہاتھ سے جاتا ہے متاعِ کردار بحث میں آتا ہے جب فلسفۂ ذات وصفات

قسمیں لکھی جانے لگیں توحیدِ وجودی توحیدِ شہودی - توحیدِ عینی - توحیدِ ظنّی - توحیدِ افعالی - توحیدِ صفاتی - توحیدِ ذاتی اور توحیدِ حقیقت! وغیرہ وغیرہ - لیکن ان ذہنی قلابازیوں سے اصلی قرآنی مفہوم پر پردہ پڑ گیا - اور وہ اسلامی اصول جس کی مدد سے رسول اکرمؐ نے "مسِ خام" کو کُندن بنا دیا تھا - کم فہم لوگوں کے ہاتھ میں آکر "علم العقائد" کا ایک دلچسپ مسئلہ بن گیا بقولِ اقبال ؎

زندہ قوت تھی جہاں میں یہی توحید کبھی آج کیا ہے؟ فقط اِک مسئلۂ علمِ کلام!

ایک اسلامی مفکّر کی حیثیت سے اقبال کا سب سے بڑا کام یہ ہے - کہ اُس نے توحید کے رازِ پارینہ سے پھر پردہ اُٹھایا ہے - وہ ذات اور صفات کی نیم خیالی بحثوں میں نہیں کھو گیا - بلکہ اِس نے توحید کو پھر انسانی زندگی کی وہ اہم ترین اخلاقی قوت بنانا چاہا ہے - جس نے رسُول اکرمؐ کی نگاہِ کیمیا ساز کے اثر سے عرب کے جاہل اور پست بدوؤں کو دُنیا کے حکمران بنا دیا تھا - "جاوید نامہ" میں "لا اِلٰہ" کے عنوان سے "نژادِ نو" کے نام پیغام ہے ؎

اے پسر ذوقِ نگہ از من بگیر سوختن در لا اِلٰہ از من بگیر
لا اِلٰہ گوئی بگو از رُوئے جاں تا ز اندامِ تو آید بُوئے جاں!
مہر و مہ گردد ز سوزِ لا اِلٰہ دیدہ ام ایں سوز را در کوہ و کاہ
ایں دو حرفِ لا اِلٰہ گفتار نیست لا اِلٰہ جُز تیغِ بے زنہار نیست
زیستن با سوزِ او قہّاری است
لا اِلٰہ ضرب است و ضربِ کاری است

لیکن توحید کی عظمت اور اہمیت کا سب سے زور دار بیان "رموزِ بے خودی" میں ہے ؎

اہلِ حق را رمزِ توحید از بر است در اٰتِی الرّحمٰن عبداً مضمر است
تا ز اسرارِ تو بنماید تُرا امتحانش از عمل باید تُرا
دیں ازو حکمت ازو آئیں ازو زور ازو قوت ازو تمکیں ازو
عالماں را جلوہ اش حیرت دہد عاشقاں را بر عمل قدرت دہد

پست اندر سایہ اش گردد بلند
خاک چوں اکسیر گردد ارجمند

قدرتِ اُو برگزیند بندہ را
نوعِ دیگر آفریند بندہ را

در رہِ حق تیز تر گردد تگش
گرم تر از برق خُون اندر رگش

بیم و شک میرد عمل گیرد حیات
چشم مے بیند ضمیرِ کائنات

چُون مقامِ عبدہٗ محکم شود
کاسۂ دریوزہ جامِ جم شود

"رموزِ بے خودی" میں آگے چل کر بتایا ہے۔ کہ سب اخلاقی بُرائیوں کی اصل تین چیزیں ہیں۔ نا اُمیدی۔ غم اور خوف۔ زندگی کی تگ و دو میں انسان کو یہ اپاہج بنا دیتی ہیں۔ اور توحید ہی ان اخلاقی بیماریوں کا علاج ہے۔ یعنی جو شخص ذات واحد پر قرآنی معنوں میں ایمان رکھتا ہے۔ اللہ تعالےٰ کے وعدوں کو سچا جانتا ہے۔ اُس کی رحمت سے مایوس نہیں ہوتا۔ اللہ تعالےٰ پر بھروسا رکھتا ہے مشیت ایزدی سے خوش رہتا ہے۔ اور اللہ کے سوا کسی سے نہیں ڈرتا۔ وہ یاس۔ حُزن اور خوف تینوں روحانی بیماریوں سے محفوظ رہتا ہے ٭

یاس اور نا امیدی کے متعلق تو اسلامی نقطۂ نگاہ مشہور ہے۔ کہ "نا اُمیدی کفر ہے"۔ اور ظاہر ہے کہ جو شخص اللہ تعالےٰ کے ان وعدوں پر ایمان رکھتا ہے۔ جو قرآن میں مومنوں سے کئے گئے ہیں۔ اُسے نا اُمیدی کیسے ستا سکتی ہے۔ اقبال کہتا ہے ؎

مُسلم استی سینہ را از آرزو آباد دار
ہر زماں پیشِ نظر "لا یخلف المیعاد" دار

قرآن کا ارشاد ہے "لَا تقنطوُا مِن رحمتِ اللہ"۔ (اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو) چنانچہ "رموزِ بے خودی" میں اسی کی طرف اشارہ ہے ؎

مرگ را ساماں ز قطعِ آرزوست
زندگانی مُحکم از لا تقنطُواست

حزن و غم کے بارے میں قرآن کا ارشاد ہے۔ لَا تحزن ان اللہ معنا۔ (تم کوئی فکر نہ کرو۔ اللہ تمہارے ساتھ ہے) اب جو کوئی کلامِ پاک پر ایمان رکھتا ہے۔ اور جانتا ہے۔ کہ

اللہ اسی کے ساتھ ہے۔ اُسے کسی چیز کا غم نہ ہوگا بقول اقبالؔ ؎

اے کہ در زندانِ غم باشی اسیر — از نبی تعلیمِ "لاتحزن" بگیر

ایں سبق صدّیق را صدیق کرد — سرخوش از پیمانۂ تحقیق کرد

از رضا مُسلم مثالِ کوکب است — در رہِ ہستی تبسّم برلب است

گر خُدا داری ز غم آزاد شو

از خیالِ بیش و کم آزاد شو!

لیکن سب اخلاقی امراض کی جڑ خوف ہے ؎

بیم غیر اللہ عمل را دشمن است — کاروانِ زندگی را رہزن است

ہر شرِ پنہاں کہ اندر قلبِ تُست — اصلِ او بیم است اگر بینی درست

لابہ و مکاری و کین و دروغ — ایں ہمہ از خوف مے گیرد فروغ

پردۂ زور و ریا پیراہن اش — فتنہ را آغوش مادر دامن اش

اِس اُم الخبائث کا علاج توحید ہے۔ جو شخص ایک خدا سے ڈرتا ہے۔ اور کسی سے نہیں ڈرتا وہی موحد ہے ؎

خوفِ حق عنوانِ ایمان است و بس — خوفِ غیر از شرکِ پنہاں است و بس

توحید ایک خُدا کا خوف تو پیدا کرتی ہے۔ لیکن یہ خوف تمام غیر اللہ کے خوف سے نجات دلا دیتا ہے۔ بقول خواجہ اجمیریؒ ؎

سر داد، نہ داد دست در دستِ یزید — حقّا کہ بنائے لا الٰہ ہست حسینؓ

اقبالؔ نماز کے متعلق کہتا رہے ؎

یہ ایک سجدہ جسے تو گراں سمجھتا ہے — ہزار سجدے سے دیتا ہے آدمی کو نجات

خدا کے آگے مومن کی گردن ہر وقت جھکی رہتی ہے۔ لیکن غیر اللہ کے مقابلے میں وہ اسی طرح سر بلند رہتا ہے۔ جس طرح شاہ چین کے دربار میں قتیبہ کے سفیر ؎

بندۂ حق پیشِ مولا لا ستے پیشِ باطل از نعم برجا ستے

قرآن میں بڑی صراحت سے غیر اللہ کا خوف دل سے نکالنے کی تلقین کی ہے اور اقبال اُنھی آیاتِ مبارکہ کی طرف اشارہ کرتا ہے ؎

قوّتِ ایمان حیات افزایدت ورد "لاخوفٌ علیهم" بایدت

چوں کلیمے سُوئے فرعونے رود قلب او از لاتخف محکم شود

ایک شعر میں تو صاف کہدیا ہے ؎

ہر کہ رمزِ مُصطفےٰ فہمیدہ است شرک را در خوف مضمر دیدہ است

اس کے علاوہ توحید نہ صرف مومن کو نا امیدی۔ فکر۔ خوف اور خوف سے پیدا ہونے والے تمام معائب مثلاً خوشامد۔ مکّاری۔ دروغ گوئی۔ ریاکاری۔ ان تمام برائیوں سے بچاتی ہے۔ بلکہ جو شخص خدا کو ہر وقت اور ہر جگہ حاضر ناظر سمجھتا ہے۔ اور اُس کی خوشی کا طالب رہتا ہے ضرور ہے۔ کہ وہ اپنے تمام افعال بلکہ اپنے خیالات کا بھی اسی طرح خیال رکھے۔ کہ اُس کے ہاتھ پاؤں زبان بلکہ دل و دماغ سے بھی کوئی فعل یا خیال اللہ کے احکام کی خلاف ورزی میں صادر نہ ہو۔ یہی اخلاقی معراج ہے۔ جس پر پہنچنے کے لئے صرف توحید ہی ایک ذریعہ ہے۔ اقبال اسی لئے حیران ہے۔ کہ لوگ اپنے آپ کو موحد۔ مومن۔ مسلمان کہتے ہیں۔ حالانکہ ان کے اخلاق۔ اور اُن کے عادات اِن ناموں سے متصف ہونے کے قابل نہیں ہیں ؎

مومن و پیشِ کساں بستن نطاق! مومن و غدّاری و فقر و نفاق!

با پشیزے دین و ملّت را فروخت ہم متاعِ خانہ و ہم خانہ سوخت

لا اِلٰہ اندر نمازش بود و نیست نازہا اندر نیازش بود و نیست

نُور در صوم و صلوٰتِ او نماند جلوۂ در کائناتِ او نماند

آنکہ بود اللہ اُو را ساز و برگ فتنۂ او حُبِّ مال و ترسِ مرگ!

اقبال نے "ضربِ کلیم" میں ایک جگہ لکھا ہے ؎

خودی کا سرِ نہاں لا الٰہ الا اللہ
خودی ہے تیغ، فساں لا الٰہ الا اللہ

لیکن ظاہر ہے۔ کہ یہ ارشاد اُس توحید کے متعلق نہیں جو "اقرار باللسان" یا زیادہ سے زیادہ "تصدیق بالقلب" کی حد تک محدود رہتی ہے۔ توحید اُسی صورت میں انسان کی تمام قوتوں کو قومی اور تیز تر بنا سکتی ہے۔ جب یہ جذبہ اقرار اور افکار کی حد سے گزر کر کردار کو متاثر کرے یعنی ع وحدت افکار کی بے وحدتِ کردار ہے خام

اور ؎

روشن اِس ضو سے اگر ظلمتِ کردار نہ ہو خود مسلماں سے ہے پوشیدہ مسلماں کا مقام

اقبال کہتا ہے۔ کہ مسلمان جو توحید کا دعوےٰ کرتے ہیں۔ صرف زبان ہی سے اللہ تعالےٰ کی وحدت کی شہادت نہ دیں۔ یا فقط دل ہی سے اسے صحیح نہ مانیں۔ بلکہ ان کے کام بھی اُنہی لوگوں کے ہوں۔ جن کو موحد اور مومن کہنا بجا ہے۔ جن کا معبود ایک ہے۔ جو ذاتِ باری کے سوا کسی کے آگے سر نہیں جھکاتے۔ غیر اللہ کا خوف دل میں نہیں آنے دیتے۔ اللہ کی رحمت سے کبھی مایوس نہیں ہوتے۔ ہر وقت اور ہر جگہ خدا کو حاضر ناظر سمجھتے ہیں اور افعال و اقوال بلکہ خیالات میں بھی ان سے کوئی بات اللہ کی مرضی کے خلاف سرزد نہیں ہوتی۔ یہ لوگ دنیا میں رہتے ہیں۔ لیکن اللہ کی محبت انہیں بہن۔ بھائی۔ بیوی۔ بیٹے کی محبت سے بڑھ کر ہوتی ہے۔ اور اگرچہ یہ لوگ دُنیا کی کشمکش میں پوری طرح شریک ہوتے ہیں۔ لیکن ان کا دل ذاتِ واحد ہی میں لگا رہتا ہے۔ اور ان مصائب و آلام سے بچے رہتے ہیں۔ جو دنیا داروں کو علائقِ دنیوی کی وجہ سے ہوتے ہیں۔ وہ دنیوی چیزوں میں سے تھوڑے سے تھوڑا حصہ (اقلل من الدنیا) لیتے ہیں۔ لیکن اپنی ایمانی طاقت اور اخلاقی عظمت سے مُلکوں اور قوموں کی قسمت بدل دیتے ہیں۔ دُنیا کی دو ہی بڑی طاقتیں ہیں

خوف اور محبت، اور توحیدِ الٰہی مومن کو دونوں سے بالاکر دیتی ہے ؎

خوفِ دنیا خوفِ عقبےٰ خوفِ جاں | خوفِ آلامِ زمین و آسماں
تا عصائے لا اِلٰہ داری بدست | ہر طلسمِ خوف را خواہی شکست
ہر کہ حق باشد چو جاں اندر تنش | خم نگردد پیشِ باطل گردنش
خوف را در سینۂ او راہ نیست | خاطرش مرعوب غیر اللہ نیست

اسی طرح ؎

حُبِّ مال و دولت و حُبِّ وطن | حُبِّ خویش و اقربا و حُبِّ زن
ہر کہ در اقلیمِ لا آباد شُد | فارغ از بندِ زن و اولاد شُد
مے کند از ماسوا قطعِ نظر | مے نہد ساطور بر حلقِ پسر
با یکے مثلِ ہجومِ لشکر است | جان بچشمِ او ز باد ارزاں تر است

یہی لوگ مومن ہیں۔ اور اقبال کا کلام انہی کی صفات سے بھرا ہُوا ہے۔ مثلاً ؎

ہر لحظہ ہے مومن کی نئی شان نئی آن | گفتار میں کردار میں اللہ کی بُرہان!
قہاری و غفاری و قدوسی و جبروت | یہ چار عناصر ہوں تو بنتا ہے مسلمان!
ہمسایۂ جبریلِ امیں، بندۂ خاکی | ہے اس کا نشیمن نہ بخارا نہ بدخشاں!
یہ راز کسی کو نہیں معلوم کہ مومن | قاری نظر آتا ہے حقیقت میں ہے قرآن!
قدرت کے مقاصد کا عیار اسکے ارادے | دنیا میں بھی میزان، قیامت میں بھی میزان!
جس سے جگرِ لالہ میں ٹھنڈک ہو وہ شبنم | دریاؤں کے دل جس سے دہل جائیں وہ طوفان!

"زبورِ عجم" میں ایک غزل ہے ؎

قلندراں کہ بہ تسخیرِ آب و گِل کوشند | ز شاہ باج ستانند و خرقہ مے پوشند
بہ جلوت اند و کمندے بہ مہر و مہ پیچند | بخلوت اند و زمان و مکاں در آغوشند!
بروزِ بزم سراپا چو پرنیان و حریر | بروزِ رزم خود آگاہ و تن فراموشند

نظامِ تازہ بچرخِ دو رنگ مے بخشند ستارہ ہائے کہن را جنازہ بردوشند!

اقبال چاہتا ہے کہ مسلمان پھر اسی اخلاقی اور روحانی معراج پر پہنچ جائیں اور ایک دفعہ پھر "خیر الامم" کے ممتاز خطاب کے مستحق ہو جائیں "طلوعِ اسلام" میں مسلمان سے خطاب ہے ؎

خدائے لم یزل کا دستِ قدرت تو زباں تو ہے
یقیں پیدا کر اے غافل کہ مغلوبِ گماں تو ہے

پرے ہے چرخِ نیلی فام سے منزل مسلماں کی
ستارے جسکی گردِ راہ ہوں وہ کارواں تو ہے

مکاں فانی مکیں آنی۔ ازل تیرا۔ ابد تیرا
خدا کا آخری پیغام تو ہے جاوداں تو ہے

تری فطرت امیں ہے ممکناتِ زندگانی کی
جہاں کے جوہرِ مضمر کا گویا امتحاں تو ہے

سبق پھر پڑھ صداقت کا عدالت کا شجاعت کا
لیا جائے گا تجھ سے کام دُنیا کی امامت کا

رسالت

توحید کے بعد کلمۂ طیبہ کا دوسرا جزو رسالت محمدیہ کا اقرار ہے۔ یہ صحیح ہے کہ قرآن میں رسالت نبوی کو وہ اہمیت ہرگز نہیں دی گئی جو توحید الٰہی کو ہے۔ اور رسول اکرمؐ کی بشریت کو بار بار اور مختلف طریقوں سے نمایاں کیا ہے۔ لیکن آں حضرت خاتم النبیین ہیں اور اگرچہ کلام مجید میں ایک نبی اور دوسرے نبی میں فرق کرنے کی ممانعت کی گئی ہے۔ لیکن اُمتِ محمدیہ کے لئے آپ ہی کی ذات سب کچھ ہے۔ اور آپ ہی سے ملّت کا نظام قائم ہے ؎

زندہ ہر کثرت زبندِ وحدت است
وحدتِ مسلم زدینِ فطرت است

دینِ فطرت از نبی آموختیم
در رہِ حق مشعلے افروختیم

ایں گہر از بحرِ بے پایانِ اوست
ما کہ یکجا نیم از احسانِ اوست

تا نہ ایں وحدت زدستِ مارود
ہستیٔ ما با ابد ہمدم شود

پس خدا بر ما شریعت ختم کرد
بر رسولِ ما رسالت ختم کرد

رونق از ما محفلِ ایام را
او رُسل را ختم و ما اقوام را

رسالتِ محمدیہ کا مقصد دُنیا میں حریت، اخوت، اور مساوات قائم کرنا تھا۔ چنانچہ رسول اکرمؐ کی اپنی زندگی میں اور صحابہ کرام کے دور تک جب ابھی رسولِ اکرمؐ کی تعلیمات کو سمجھنے والے لوگ زندہ تھے مسلمان انہیں اصولوں پر چلتے رہے۔ اُنہوں نے قیصر وکسریٰ کے استبداد کا خاتمہ کر دیا۔ قبائل جو آپس میں لڑتے رہتے تھے اخوت اسلامی کے زیرِ اثر بھائی بھائی ہوگئے۔ غلاموں کو اسلام نے اتنا بلند مرتبہ دیا کہ غلام اور آقا میں امتیاز اُٹھ گیا۔ چنانچہ جب عمر فاروقؓ ایک غلام کے ساتھ بیت المقدس کو امان دینے تشریف لے گئے۔ اور اُن کے پاس فقط ایک اونٹ تھا تو وہ اور اُن کا غلام باری باری اُونٹ پر سوار ہوتے اور باری باری پیدل چلتے ؎

بُود انساں در جہاں انساں پرست | ناکس و نابود مند و زیر دست
سطوتِ کسریٰ و قیصر رہزنش | بندہا در دست و پا و گردنش
کاہن و پاپا و سُلطان و امیر | بہرِ یک نخچیر صد نخچیر گیر
از غلامی فطرتِ اُو دُوں شُدہ | نغمہ ہا اندر نئے اُو خوں شُدہ

تا امینے حق بحقداراں سپُرد
بندگاں را مسندِ خاقاں سپُرد

شعلہ ہا از مُردہ خاکستر کُشاد | کوہکن را پایۂ پرویز داد
اعتبارِ کارِ بنداں را فزُود | خواجگی از کار فرمایاں رُبود
تازہ جاں اندر تنِ آدم دمید | بندہ را بازاز خداوندال خرید
زادنِ اُو مرگِ دُنیائے کہن | مرگِ آتش خانہ و دیر و ثمن

لیکن رسولِ اکرمؐ کی اہمیت صرف اسی لئے نہیں کہ وہ خدا کا پیغام لائے اور قوم کا نظام قائم کر گئے۔ آپ کی زندگی ایک معجزہ ہے۔ قوم کے لئے اسوۂ حسنہ اور انسان کیلئے مشعلِ ہدایت۔ دُنیا میں شاید کوئی ہستی ایسی نہیں جس کے متعلق اس قدر غلط فہمیاں پھیلائی گئی ہیں جتنی

رسولِ اکرمؐ کے متعلق۔ نادان دوستوں اور عیّار دُشمنوں دونوں نے آپ کی زندگی کے متعلق قصّے اور افسانے بنائے ہیں اور حقیقت پر پردے ڈالے ہیں۔ لیکن جو کوئی ٹھنڈے دل سے آپ کی زندگی کے واقعات پر غور کرے گا۔ اُسے اُس میں سے ہمت۔ استقلال بُردباری۔ عدیم النظیر انسانی ہمدردی۔ سمجھ۔ جدوجہد۔ تعلیم بامراللہ۔ حزم و احتیاط اور ایثار کا سبق ملے گا۔ اور اسی لئے قرآن مجید نے آپ کی زندگی کو قوم کے لئے ایک نیک نمونہ قرار دیا ہے ÷

وہ ایک یتیم پیدا ہوئے تھے۔ باپ کی صُورت دیکھنی انہیں نصیب نہیں ہوئی۔ ماں کی شفقت سے وہ قلیل عرصے کے بعد محروم ہو گئے۔ لیکن اس آغاز کے باوجود انجام کتنا شاندار ہے انسانی زندگی میں جو انقلاب اُنہوں نے پیدا کیا کوئی ایک شخص تنہا دنیا کی تاریخ میں پیدا نہیں کر سکا۔ اور جب فوت ہوئے تو وہی یتیم جس کا اللہ کے سوا دُنیا میں کوئی نہ تھا۔ اللہ کی عنایت اور اپنی روحانی اور اخلاقی عظمت کی مدد سے سارے عرب کا بادشاہ تھا دینی بھی اور دنیوی بھی!

ابھی آپ تاجِ نبوّت سے سرفراز نہ ہوئے تھے کہ اپنی بے عیب زندگی اور اخلاقِ پسندیدہ کی بدولت آپ نے امین اور صادق کا ممتاز خطاب قوم سے لے لیا تھا۔ جب کعبہ دوبارہ تعمیر ہونے لگا اور حجرِ اسود رکھنے کے لئے قبائل میں جھگڑا شروع ہُوا تو اس وقت جو منصفانہ فیصلہ آپ نے کیا وہ آپ کے حُسنِ تدبیر کی عمدہ مثال ہے۔ لیکن آپ کے لئے امتحان کی گھڑی وہ وقت تھا جب آپ نے قوم کو توحیدِ الٰہی کا پیغام دیا اور ابوجہل۔ ابولہب۔ ابوسفیان اور قریش کے دیگر بڑے بزرگوں بلکہ ساری قوم نے مخالفت شروع کر دی۔ ایمان لانے والوں کو تنگ کرنے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا۔ یہ آپ کے ایمان ہمت۔ حوصلے اور استقلال کے امتحان کا وقت تھا اور اس مرحلے سے آپ جس طرح کامیاب نکلے ہیں اس پر اسلام کی تاریخ گواہ ہے۔ لیکن صرف یہی نہیں کہ مصائب کے

آگے آپ نے سر نہیں جھکایا اور اعلائے حکمۃ الحق میں سینہ سپر رہے۔ بلکہ دشمنوں کی عداوت اور مخالفت کی وجہ سے اپنے دل کو بھی جو رحمت کا سرچشمہ تھا بگڑنے نہیں دیا۔ جب آپ طائف میں خدا کا پیغام لے کر پہنچے اور لوگوں نے مذاق اڑایا اور پتھر مار مار کر شہر سے باہر نکال دیا۔ اور تھکے ماندے جاکر آپ نے ایک چشمے پر دم لیا تو پاؤں سے خون بہہ رہا تھا۔ لیکن اس حالت میں بھی ان لوگوں کے خلاف ایک لفظ منہ سے نہیں نکلا۔ انتہائے مخالفت میں بھی کوئی کہتا کہ ان ظالموں کے لئے بددعا کیجئے تو آپ کہتے مجھے دنیا میں رحمت بنا کے بھیجا ہے بد دعاؤں کے لئے نہیں! اور جب مکّہ فتح ہُوا تو جن لوگوں نے آپ کو گھر سے بے گھر کیا تھا۔ آپ کی جان لینے کی کوششیں کی تھیں۔ اور طرح طرح کی اذیتیں پہنچائی تھیں اُن سب کو فاتح نے کیا سزا دی۔ لَا تعزیرا یعنی تمہارے لئے کوئی سزا نہیں!

مدینہ منورہ میں آپ کی حیثیت ایک مطلق العنان حاکم کی سی تھی۔ اور جہاں قوم کی حفاظت کے لئے یا مُفسدوں کی شر انگیزی روکنے کے لئے آپ کو دل کڑا کر کے کوئی درشت حکم نافذ کرنا پڑتا تھا تو آپ اپنا فرض ادا کرنے سے ہرگز نہ ہچکچاتے۔ لیکن اس بادشاہِ عرب کی اپنی زندگی کیسی تھی۔ کئی کئی وقت فاقہ کرنا پڑتا تھا۔ اپنے کپڑوں کو خود مرمت کرتے۔ اپنے جوتوں کو خود پیوند لگاتے۔ وہ حاکمِ وقت تھے۔ لیکن ان کی ذات میں شانِ جمالی اور شانِ جلالی۔ دلبری اور قاہری عجیب طرح سے ملی ہوئی تھیں۔ اُن کی گفتار و کردار میں ایک شاہانہ وقار تھا۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ ان کے طرزِ عمل میں محبت، لطافت اور شفقت نمایاں تھی۔ وہ حق و باطل کی لڑائی میں ایک بہادر سپاہی کی طرح سینہ سپر رہے۔ سنگِ خارا کی طرح سخت اور فولاد کی طرح تیز۔ لیکن زندگی میں روزمرہ کے واقعات میں آپ کی ذات سے غیر معمولی شفقت اور دلآویزی ٹپکتی تھی۔ لین پول لکھتا ہے "وہ غیر معمولی انسان جس نے تن تنہا سالہا سال بہادروں اور دلیروں کی طرح اپنی قوم کی مخالفت کا مقابلہ کیا وہ کسی کا دل نہ دکھانے کا اتنا خیال رکھتا تھا کہ مصافحہ کے وقت کبھی اپنا ہاتھ پہلے نہ کھینچتا۔ وہ بچوں کا محبوب تھا۔ اور

جب کبھی وہ بچوں کے گروہ سے گزرتا تو اپنے میٹھے لفظوں اور دلاویز تبسّم سے اُن کا دل پرچاتا جاتا۔ رسولِ اکرم عرب کے حاکم تھے ۔ لیکن آج کون حاکم ہے جو گلیوں میں پیدل چلتا ہے اور جب وہ کہیں جارہا ہو تو مٹی میں کھیلتے ہوئے بچے اُس کی ٹانگوں سے لپٹ جاتے ہیں اور وہ اُن سے پیار کرتا ہے؟ وہ دین و دنیا کے بادشاہ تھے لیکن کون بادشاہ ہے ۔ جس کی زندگی میں اتنی شفقت اور سادگی ہے ۔ کہ وہ دو بچوں کو بہلانے کے لئے ان کو کاندھے پر اُٹھائے سواری کی طرح حریم نبوی سے مسجدِ نبوی تک اور مسجدِ نبوی سے حریم نبوی تک چکر کاٹتا ہے؟

اس ہستی کا دیکھنا ۔ اس کے روزمرّہ کے کاموں کا ملاحظہ کرنا انسان کے لئے رُوحانی تعلیم تھی ۔ آج ہم اس سے محروم ہیں ۔ لیکن پھر بھی دینی اور دنیوی ارتقا کے لئے ایسی ہستی کی محبت ایک بیش بہا نعمت ہے ۔ اقبالؔ "اسرارِ خودی" میں لکھتا ہے ؎

نقطۂ نورے کہ نامِ اُو خودی است ۔۔۔ زیرِ خاکِ ما شرارِ زندگی است

از محبت مے شود پایندہ تر ۔۔۔ زندہ تر سوزندہ تر تابندہ تر

لیکن محبت کا یہ کیمیائی اثر اسی صورت میں ظاہر ہو سکتا ہے جب یہ محبت کسی ایسے کامل سے ہو جس کی ذات کا پرتو انسان کو کندن بنا دے ؎

کیمیا پیدا کُن از مُشتِ گلے ۔۔۔ بوسہ زن بر آستانِ کاملے

اور اس مقصد کے لئے رسولِ اکرم سے بڑھ کر کونسی ہستی ہو سکتی ہے جن کی زندگی دینی اور دُنیاوی ارتقا کا بہترین نمونہ ہے ۔ اور جن کی زندگی کو قرآن نے اسوۂ حسنہ قرار دیا ہے ؎

ہست معشوقے نہاں اندر دلت ۔۔۔ چشم اگر داری بیا بنمائمت

عاشقانِ او ز خوباں خُوب تر ۔۔۔ خوش تر و زیبا تر و محبوب تر

دِل ز عشقِ او توانا مے شود ۔۔۔ خاک ہمدوشِ ثریا مے شود

در دلِ مُسلم مقامِ مصطفےٰ است
آبروئے ما ز نامِ مصطفےٰ است

بوریا ممنونِ خوابِ راحتش — تاجِ کسریٰ زیرِ پائے اُمتش

در شبستانِ حرا خلوت گزید — قوم و آئین و حکومت آفرید

وقتِ ہیجا تیغِ او آہن گداز — دیدۂ او اشکبار اندر نماز

در جہاں آئینِ نو آغاز کرد — مسندِ اقوامِ پیشیں در نورد

از کلیدِ دیں درِ دُنیا کُشاد — ہمچو او بطنِ اُمِ گیتی نزاد!

لیکن اقبال کے نزدیک عشق و محبت سے فقط عقیدت و ارادت مراد نہیں۔ تقلید بھی اس کا ضروری جزو ہے۔ اور رسولِ اکرم کی محبت سے پوری طرح فیض یاب ہونے کے لئے ضروری ہے۔ کہ اُن کی زندگی کو چراغِ راہ بنایا جائے اور اُن کی روحانی و اخلاقی خوبیاں اخذ کرنے کی کوشش ہو ؎

کیفیت ہا خیزد از صہبائے عشق — ہست ہم تقلید از اسمائے عشق

عاشقی؟ محکم شو از تقلیدِ یار — تا کمندِ تو شود یزداں شکار

رسولِ اکرمؐ کی تقلید اور سنتِ نبوی کی پیروی کی ضرورت پرانے علما کے نزدیک بھی مُسلّم ہے۔ اور فرقۂ اہلِ سنت والجماعت کی خصوصیت ہی سنتِ نبوی کا اقتدا ہے۔ لیکن جس طرح کہتے ہیں نقل را عقل باید تقلید کے لئے بھی بڑی سمجھ کی ضرورت ہے اور ہماری سب سے بڑی بدقسمتی یہ ہے۔ کہ اقتدائے سنت کے دعوے داروں نے بھی رسول اکرمؐ کی اہم اور ضروری خوبیوں کو چھوڑ کر غیر ضروری اور آسان باتوں کی تقلید کی ہے۔ علما بالعموم نبی کریمؐ کی جن باتوں کی پیروی پر زور دیتے ہیں وہ بیشتر ظاہری ہیں۔ مثلاً مسیں ایک خاص انداز سے کٹی ہوئی ہوں۔ ڈاڑھی کی لمبائی ایک خاص حد کی ہو وغیرہ۔ شعارِ قومی کو قائم رکھنے کے لئے ان چیزوں کی بھی ضرورت ہے۔ لیکن ظاہر ہے کہ رسولِ اکرمؐ کی اہم ترین خصوصیات ظاہری نہیں باطنی تھیں۔ جسمانی نہیں اخلاقی اور روحانی تھیں۔ ان کی زندگی کی کامیابی لباس یا خاص وضع قطع کی وجہ سے نہ تھی بلکہ ایمانِ کامل۔ حوصلہ۔ نادرہ اخلاق۔ اور روحانی عظمت کی وجہ سے تھی اور جو کم فہم لوگ ان اخلاقی اور روحانی خوبیوں

کو چھوڑ کر سُنّت نبوی سے فقط ظاہری وضع قطع اور لباس مراد لیتے ہیں۔ وہ مغز کو چھوڑ کر استخوان کے پیچھے پڑے ہیں۔ آج اسلامی ممالک میں لاکھوں لوگ ایسے موجود ہیں جو لباس وضع قطع اور امور ظاہری میں شعار نبوی کی پیروی کرتے ہیں لیکن جنہیں اخلاق نبوی کی ہوا بھی نہیں لگی۔ جھوٹ اور خوشامد گویا ان کی گھٹی میں پڑے ہیں۔ یتیموں اور غریب رشتہ داروں کا مال کھا کر وہ پلتے ہیں۔ بات بات پر ایک دوسرے کا گلا کاٹنے کو تیار ہو جاتے ہیں۔ اُن کا لالچ۔ کاہلی۔ حسد۔ بغض۔ کینہ اور خود غرضی اغیار میں بھی زبان زد ہے۔ ذاتی مفاد کی خاطر، یا ذاتی کینہ سے متاثر ہو کر وہ قوم اور ملک کو اغیار کے ہاتھ بیچنے کے لئے تیار ہو جاتے ہیں اور لُطف یہ ہے کہ یہ لوگ اپنے آپ کو مسلمان اور اہلِ سنت والجماعت کہتے ہیں۔ ہم بقول مولینا شہیدؒ یہی کہیں گے "سبحان اللہ یہ مُنہ اور یہ دعوے"!

عوام سے تو شکایت نہیں۔ کہ انہیں سمجھ ہی کتنی ہوتی ہے۔ اور علمائے ظاہر کے متعلق بھی کہا جاسکتا ہے۔ کہ وہ لوگوں کے دل ٹٹول کر نہیں دیکھ سکتے تھے۔ اسلامی حکومت نے انہیں محتسب اور فقیہ کا کام سپرد کیا تھا۔ اس لئے اُنہوں نے امور ظاہری ہی کو زیادہ اہمیت دینی شروع کر دی لیکن بدقسمتی یہ ہے کہ خواص اور اربابِ تصوف جن کا دعوےٰ ہے ؎

ما بروں را ننگریم و قال را ما دروں را بنگریم و حال را

انہوں نے علمائے ظاہر کے فتووں کی مخالفت تو کی اور "قلندروں" اور "بے نواؤں" اور کئی بے شرع فرقوں نے اسلامی وضع قطع کو بالکل جواب دے دیا۔ لیکن رسول اکرمؐ کی روحانی اور اخلاقی عظمت کا صحیح تتبع انہیں بھی نصیب نہ ہُوا۔ اُنہوں نے امور ظاہری پر زور نہیں دیا۔ بعضوں نے اپنی زندگیاں رسول اکرمؐ کی زندگی کی تقلید میں سادہ کر دیں۔ صفائے باطن پر بہت زور دیا۔ اور قول و فعل میں بے ریائی اور اخلاص کا خیال رکھا۔ لیکن جن بزرگوں کو یہ درجہ نصیب ہُوا ان میں سے بھی اکثر نے رسُول اکرمؐ کی روحانی اور اخلاقی خوبیوں کا پوری طرح خیال نہیں رکھا۔ اولیاء کا کوئی بھی تذکرہ اُٹھا کر دیکھئے۔ صفحوں کے صفحے ان واقعات سے پُر ہیں جن سے

ولی کی "شانِ جلالی" دکھائی جاتی ہے۔ اُن کے مُنہ سے "بغ" نکلتا ہے اور نصف بغداد ہلاکو کی تلوار کا شکار ہو جاتا ہے۔ اگر کوئی شخص غفلت یا بے سمجھی سے اُن کا پورا احترام نہیں کرتا تو فوراً غضب الٰہی نازل ہو جاتا ہے۔ اسلام نے تو غیر اللہ کا سارا خوف دل سے نکال دیا تھا۔ لیکن اللہ کا اب اتنا بھی خوف نہیں رہا جتنا خشمگیں فقیر کی بد دُعا کا۔ اللہ کے احکام کی تو صریح خلاف ورزی ہو رہی ہے اور وہ ذاتِ باری تعالےٰ خاموش ہے۔ فقیر کی ذرا بھی بے ادبی ہوئی اور بلاؤں کا طوفان نازل ہُوا۔ اسی سے قوموں کی قسمت بدلتی ہے اور سلطنتوں کے تختے پلٹے جاتے ہیں۔ ایک مشہور برگزیدہ بزرگ کے متعلق کہا جاتا ہے کہ اُنہوں نے فقط اتنی بات پر خفا ہو کر کہ نمازیوں کی صفِ اوّل میں انہیں جگہ نہ دی گئی بد دُعا کی۔ فوراً مسجد گر پڑی اور تمام نمازی دب کر مر گئے۔ اور شہر ویران ہو گیا۔ ایک اور بزرگ کے متعلق مشہور ہے۔ کہ جب مُلتان کے ایک نانبائی نے انہیں گوشت کی ایک بوٹی بھون کر دینے سے انکار کیا تو اُنہوں نے اپنا ہاتھ اُٹھایا اور سُورج سوا نیزے پر آ گیا۔ شہر کے سب بوڑھے۔ بچے اور عورتیں گنہگار اور بے گناہ جل کر کباب ہو گئے۔ لیکن اُنہوں نے تو اپنی بوٹی بھون لی۔ بہت سے لوگ کہیں گے۔ کہ یہ باتیں ایشیائی قصہ نویسی کی مثالیں ہیں واقعات نہیں۔ لیکن ہم پوچھتے ہیں کہ اگر یہ باتیں سچ ہیں (اور ہم نے انہیں نہایت مشہور بزرگوں کے حالات سے چُنا ہے) تو اُن بزرگوں کے اخلاق اور رسول اکرمؐ کے اخلاق میں کیا رشتہ ہے؟ رسول اکرمؐ کو دُنیا کی تمام تکلیفیں دی گئیں۔ چُن چُن کر اذیتیں پہنچائی گئیں۔ لیکن اُن کی "شانِ جلالی" کا ظہور نہ ہُوا۔ طائف کے بدبختوں نے انہیں پتھر مار مار کر زخمی کیا۔ اور ٹھٹھے اور تمسخر کے ساتھ شہر بدر کیا۔ لیکن اُن کے مُنہ سے بد دُعا کا کلمہ نہیں نکلا۔ کوئی صحابی دُشمنوں کے ظلم و ستم سے عاجز آ کر بد دعا کے لئے کہتا۔ تو ارشاد ہوتا۔ کہ "مجھے دُنیا میں رحمت بنا کر بھیجا گیا ہے۔ بد دعاؤں اور لعنتوں کے لئے نہیں!"

اقبالؔ کے بعض نیم فہم مداحوں کا خیال ہے۔ کہ اقبالؔ کا فلسفہ محض خودی کی نشوونما اور شانِ جلالی کے اظہار کا فلسفہ ہے۔ اخلاقی پاکیزگی کو اس میں بہت دخل نہیں۔ لیکن یہ لوگ یہ

نہیں سمجھتے ۔ کہ خودی کی صحیح اور مکمل نشو و نما اسی وقت ہو سکتی ہے ۔ جب انسان کے اخلاق بھی اعلےٰ اور پاکیزہ ہوں ۔ جو شخص بات بات میں مغلوب الغضب ہو جاتا ہے ۔ اپنے خیالی یا حقیقی فائدے کی خاطر قوم کا مفاد قربان کرنے کو تیار ہو جاتا ہے ۔ ہر وقت نفس یا طبیعت کا غلام رہتا ہے ۔ اسے خودی کی سربلندی کیسے حاصل ہو سکتی ہے ۔ حقیقتاً اخلاق کی اصلاح اور بلندی تو خودی کی تربیت کی پہلی منزل ہے[1] ۔ جسے نظر انداز کر دینے سے خودی اور خود غرضی بلکہ بہیمیت میں کوئی فرق نہیں رہ جاتا ۔ اقبال اس حقیقت سے خوب واقف تھا ۔ ایک دفعہ جب ایک نقاد نے ان کے فلسفے کے متعلق کہا ۔ کہ اقبال کا فلسفۂ خودی اور نیٹشے کا نظریۂ فوق البشر ایک دوسرے سے بہت مشابہ ہیں ۔ تو انہوں نے اس کی تردید میں کہا تھا ۔ کہ میرے اور نیٹشے کے نقطۂ نظر میں بنیادی فرق تو یہ ہے ۔ کہ نیٹشے کی فوق البشر ہستی اخلاقی پاکیزگی سے بالکل بے نیاز ہے ۔ اور میرے نزدیک اخلاقی سربلندی خودی کی نشو و نما کا پہلا زینہ ہے ۔ وہ فرماتے تھے ۔ کہ دنیا کے مشہور فاتحین مثلاً سکندر ۔ نپولین ۔ چنگیز ۔ ہلاکو اور اسلام کی مایۂ ناز ہستیوں مثلاً صدیقؓ ۔ فاروقؓ ۔ اور صلاح الدینؒ میں ایک واضح فرق یہ ہے ۔ کہ اگرچہ موخر الذکر ہستیوں میں مشہور فاتحین کی جلالی شان نمایاں تھی لیکن اسکے ساتھ ساتھ اُن میں غائت درجے کی روحانی بلندی اور اخلاقی پاکیزگی بھی موجود تھی جس سے دوسرے فاتحین محروم تھے[2] ۔ ان بزرگوں کی تمام کوششیں ایک روحانی اور اخلاقی صداقت کی

---

[1] "جوہرِ اقبال" کے شروع میں ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب نے جامعہ کے طلبا سے کس قدر صحیح ارشاد کیا ہے ۔ "اگر آپ اپنی شخصیت کے نشو و نما کا مطلب غلطی سے یہ سمجھ بیٹھے ہیں ۔ کہ آدمی گستاخ ہو جاتے ۔ اور بے ادب اور بدتمیز، اگر خودی کو آپ نے خود غرضی اور نفس پرستی کے مرادف جان لیا ہے ۔ تو وہ (اقبال) آپ کو ادب اطاعت اور ضبطِ نفس کی منزلوں سے گزر کر تربیتِ خودی کے صحیح راستے پر ڈالے گا"

[2] "طلوعِ اسلام" میں بھی اخلاقی خوبیوں پر بہت زور دیا ہے ؎

مٹایا قیصر و کسریٰ کے استبداد کو جس نے ۔۔۔ وہ کیا تھا؟ عدلِ حیدر ۔ فقرِ بوذر صدقِ سلمانی

اور ؎

سبق پھر پڑھ صداقت کا شجاعت کا عدالت کا ۔۔۔ لیا جائے گا تجھ سے کام دنیا کی امامت کا

اشاعت کے لئے وقف تھیں۔ اور اپنے تمام کاموں میں انہوں نے ایک بلند اخلاقی معیار برقرار رکھا۔ اقبال جانتا تھا کہ اگر ارتقائی جدوجہد اور جارحانہ کوششوں میں اخلاقی اصول مدنظر نہ رکھے جائیں۔ تو ان کوششوں سے بجائے فائدے کے نقصان ہوتا ہے (مثلاً تیمور یا غلام قادر روہیلہ کی کوششوں سے) چنانچہ اُس نے جہاد کے متعلق بھی واضح کر دیا۔ کہ اگر اس کا مقصد جوع الارض یا ذاتی شان و شوکت کا اظہار ہو۔ تو یہ شرعاً حرام ہے۔ اقبال نے "اسرارِ خودی" میں خودی کی تربیت کی جو تین منزلیں قائم کی ہیں۔ پہلی اطاعت دوسری ضبطِ نفس اور تیسری نیابتِ الٰہی۔ ان میں بھی اس نے ٹھیک طرح واضح کر دیا ہے۔ کہ اطاعت اور ضبطِ نفس (بالفاظ دیگر اصلاحِ اخلاق) کے بغیر خودی کی بلندیوں پر نہیں پہنچا جا سکتا۔ اور اس خودی کو کبھی نہیں حاصل کیا جا سکتا۔ جس کے حصول کا مقصد ہی بے خودی یعنی جماعت کی خاطر خودی کی قربانی ہے۔ "رموزِ بے خودی" میں اقبال نے اخلاقِ حسنہ کی اہمیت اور بھی واضح طریقے سے بتائی ہے۔ اور ظاہر کیا ہے۔ کہ اخلاقِ محمدیہ کی پیروی کے بغیر دینی اور دنیوی عظمت کبھی حاصل نہیں ہو سکتی۔ اقبال نے اس سلسلے میں ایک واقعہ نظم کیا ہے۔ اور بتایا ہے۔ کہ آغازِ شباب میں جب ایک دفعہ اُس نے ایک سائل کے ساتھ درشت سلوک کیا۔ تو اس کے والد کو بڑا رنج ہُوا۔ اُنہوں نے اسے بلا کر سمجھایا۔ اور بُلا کر کہا۔ کہ اگر تم اخلاقِ نبوی کے پیرو نہ ہوئے تو مسلمان نہیں؎

غنچۂ از شاخسارِ مصطفےٰ — گُل شو از بادِ بہارِ مصطفےٰ
از بہارش رنگ و بُو باید گرفت — بہرۂ از خُلقِ او باید گرفت
فطرتِ مُسلم سراپا شفقت است — در جہاں دست و زبانش رحمت است
آنکہ مہتاب از سرِ انگشتش دونیم — رحمتِ اُو عام و اخلاقش عظیم

از مقامِ اُو اگر دُور ایستی
از میانِ معشرِ ما نیستی!

اقبالؔ سے پہلے حالیؔ نے بھی رسولِ اکرمؐ کے اخلاقِ حسنہ پر خاص زور دیا تھا۔ اور اپنی مشہور مناجات میں رسولِ اکرمؐ کی ان خصوصیات کا ذکر کیا تھا۔ جن کی پیروی کی ہمیں خاص طور پر ضرورت ہے۔ شاعر رسولِ کریمؐ سے خطاب کرتا ہے ؎

اے چشمۂ رحمت بِاَبِیْ اَنْتَ وَ اُمِّیْ — دنیا پہ ترا لطف سدا عام رہا ہے
جس قوم نے گھر اور وطن تجھ سے چھڑایا — جب تو نے کیا نیک سلوک ان سے کیا ہے
صدمہ دُرِ دنداں کو ترے جن سے کہ پہنچا — کی اُن کے لئے تُو نے بھلائی کی دُعا ہے
کی تُو نے خطا عفو ہے ان کینہ کشوں کی — کھانے ہیں جنہوں نے کہ تجھے زہر دیا ہے
سو بار ترا دیکھ کے عفو اور ترحّم — ہر باغی و سرکش کا سر آخر کو جھکا ہے

"مسدسِ حالی" کے کئی بندوں میں بھی اخلاقِ نبویؐ کی وضاحت کی گئی ہے۔ دو بند تو خاص طور پر مشہور ہیں ؎

وہ نبیوں میں رحمت لقب پانے والا — مُرادیں غریبوں کی بر لانے والا
مصیبت میں غیروں کے کام آنے والا — وہ اپنے پرائے کا غم کھانے والا

فقیروں کا ملجا ضعیفوں کا ماوٰے
یتیموں کا والی غلاموں کا مولٰے

خطا کار سے در گزر کرنے والا — بد اندیش کے دِل میں گھر کرنے والا
مفاسد کا زیر و زبر کرنے والا — قبائل کو شیر و شکر کرنے والا

اُتر کر حرا سے سُوئے قوم آیا
اور اِک نسخۂ کیمیا ساتھ لایا

حالیؔ نے رسولِ کریمؐ کے اخلاق کا مقابلہ ان لوگوں کے عادات سے کیا ہے۔ جو ہر وقت "سنتِ نبوی" کی تقلید پر زور دیتے ہیں لیکن جن کی تقلید ظاہری اُمور سے آگے نہیں بڑھتی۔ اور جو اخلاق و عادات کے معاملے میں نبیٔ کریمؐ کی عین

ضد ہیں سہ

بڑھے جس سے نفرت وہ تقریر کرنی جگر جس سے شق ہوں وہ تحریر کرنی
گنہگار بندوں کی تحقیر کرنی مسلمان بھائی کی تکفیر کرنی

یہ ہے عالموں کا ہمارے طریقہ
یہ ہے ہادیوں کا ہمارے سلیقہ

کوئی مسئلہ پُوچھنے اُن سے جائے تو گردن پہ بارِ گراں لے کے آئے
اگر بدنصیبی سے شک اس میں لائے تو قطعی خطاب اہلِ دوزخ کا پائے

اگر اعتراض اس کی نکلا زباں سے
تو آنا سلامت ہے دشوار واں سے

کبھی وہ گلے کی رگیں ہیں پھُلاتے کبھی جھاگ پر جھاگ ہیں مُنہ پہ لاتے
کبھی خوک اور سگ ہیں اس کو بتاتے کبھی مارنے کو عصا ہیں اُٹھاتے

ستُوں چشم بد دُور ہیں آپ دیں کے
نمونہ ہیں خلقِ رسولِ امیں کے !

اقبالؔ امور ظاہری میں شعارِ نبوی کی تقلید کی اہمیت سمجھتا ہے ۔ یہ رسول کی محبت کا نشان ہے ۔ اور قومی نظام کو قائم رکھنے کے لئے ضروری ہے ۔ اور اربابِ تصوف ظاہری کاموں سے جو بے اعتنائی ظاہر کرتے ہیں ۔ وہ مناسب نہیں ۔ لیکن ظاہر ہے ۔ کہ پوری تقلید نبوی اور سنت نبوی کی پیروی اُسی صورت میں ہوگی ۔ جب ظاہر کے ساتھ ساتھ رسول اکرمؐ کی روحانی اور اخلاقی خوبیوں کی بھی تقلید کی جائے ۔ اربابِ ظاہر کی طرح محض لباس اور وضع قطع ہی کا خیال نہ ہو ۔ اور نہ صوفیوں کی طرح اخلاق نبوی میں سے فقط ایک دو باتیں اخذ کی جائیں ۔ اور امور ظاہر سے بیگانگی برتی جائے ۔ بلکہ رسول اکرم کی زندگی کے تمام پہلوؤں اور ان کی ساری روحانی اور اخلاقی خوبیوں کا تتبّع ہونا چاہئے ۔ قول میں ۔ فعل میں ۔ گفتار و کردار میں

رسولِ اکرمؐ کا ایمانِ کامل ۔ تدبر ۔ حلم ۔ حوصلہ ۔ استقلال ۔ جدوجہد ۔ انصاف پسندی ۔ بے حرصی یہ سب باتیں مسلمانوں کو جزوِ زندگی بنانے کی سعی کرنی چاہیئے ۔ تب ہی وہ "خلافتِ الٰہیہ" کی بلندی پر پہنچ سکتے ہیں ۔ بقول اقبالؔ ؎

آندکے اندر حرائے دِل نشیں ترکِ خود کُن سُوئے حق ہجرت گزیں
مُحکم از حق شو سوئے خود گام زن لات و عزّائے ہوس را در شکن
لشکرے پیدا کُن از سلطانِ عشق جلوہ گر شو بر سرِ فارانِ عشق
تا خدائے کعبہ بنوازد تُرا
شرحِ "اِنّی جاعلٌ" سازد تُرا[1]

قرآن مجید

توحید اور سنتِ نبوی کی پیروی کے علاوہ سب سے زیادہ زور اقبالؔ نے قرآن پر دیا ہے ۔ مسلمانوں کے لئے سرچشمۂ ہدایت یہی کتاب ہے ۔ احادیث ۔ فقہ ، تصوف ، کسی کی بھی اتنی اہمیت نہیں ۔ جتنی قرآن حکیم کی ۔ یہی ایک چیز ہے جس کے متعلق دوست اور دشمن متفق ہیں ۔ کہ وہ بغیر کسی کمی بیشی کے ہمارے ہاتھوں تک پہنچی اور اسی کی پیروی سے مسلمان صراطِ مستقیم پر چل سکتے ہیں ۔ ؎

آں کتابِ زندہ قرآنِ حکیم حکمتِ اُو لایزال است و قدیم
نسخۂ اسرارِ تکوینِ حیات بے ثبات از قوتش گیرد ثبات
مے برد پابند و آزاد آورد صید بنداں را بفریاد آورد
نوعِ انساں را پیامِ آخریں حاملِ او رحمۃً للعالمیں
ارج مے گیرد ازو نا ارجمند
بندہ را از سجدہ سازد سربلند

---

[1] اِنّی جاعلٌ فی الارضِ خلیفہ (آیۂ شریفہ)

"جاوید نامہ" میں سید جمال الدین افغانی کی زبان سے کہا ہے ؎

چیست قرآں؟ خواجہ را پیغامِ مرگ — دستگیرِ بندۂ بے ساز و برگ
نقشِ قرآں تا دریں عالم نشست — نقشہائے کاہن و پاپا شکست
فاش گویم آنچہ در دل مضمر است — ایں کتابے نیست چیزے دیگر است
چوں بجاں در رفت جاں دیگر شود
جاں چو دیگر شد جہاں دیگر شود

لیکن اقبال کو اس امر کا اعتراف ہے کہ قرآن کی ان حیات افزا خصوصیات سے فائدہ نہیں اُٹھایا گیا۔ "جاوید نامہ" میں جہاں اُس نے جمال الدین افغانی کی زبان سے "چار محکمات عالمِ قرآنی" یعنی (۱) خلافتِ آدم (۲) حکومتِ الٰہی (۳) الارض للہ اور (۴) فوائدِ حکمت کی تشریح کی ہے اور قرآنی آیات کی تفسیر کرتے ہوئے ان اجتماعی اصولوں کو واضح کیا ہے جن پر قرآن نے ملتِ اسلامیہ کی بنا رکھی ہے۔ اور جن کی عملی صورت خلافتِ راشدہ کے زمانے میں بھی دیکھی گئی۔ وہاں زندہ رود پوچھتا ہے کہ آج یہ اصول کیوں نظر سے اوجھل ہیں ؎

محکماتش وانمودی از کتاب — ہست آں عالم ہنوز اندر حجاب
پردہ را از چہرہ نکشاید چرا؟ — از ضمیرِ ما بروں ناید چرا؟
پیشِ ما یک عالمِ فرسودہ ایست — ملت اندر خاکِ او آسودہ ایست
رفت سوزِ سینۂ تاتار و کرد — یا مسلماں مُرد یا قرآں بمُرد

اس کا جواب سعید حلیم پاشا دیتا ہے کہ قرآن کی ترجمانی جن لوگوں کے حصے آئی وہ اس کے معانی سمجھنے کے نا اہل تھے۔ انہوں نے اسے قصصِ انبیا کی ایک کتاب بنا دیا۔ اور جو بلیغ حکمت کی باتیں تھیں اُن سے آنکھ بند کر لی ؎

دینِ حق از کافری رسوا تر است — زانکہ مُلا مومنِ کافر گر است
شبنمِ ما در نگاہِ ما یم است — از نگاہِ او یمِ ما شبنم است

از شکر فہمائے آں قرآں فروش | دیدہ ام روح الامیں را در خروش
زاں سوئے گردوں دلش بیگانۂ | نزدِ او اُم الکتاب افسانۂ
بے نصیب از حکمتِ دینِ نبیؐ | آسمانش تیرہ از بے کوکبی
کم نگاہ و کور ذوق و ہرزہ گرد | ملت از قال و اقولش فرد فرد

مکتب و مُلاّ و اسرارِ کتاب
کورِ مادر زاد و نورِ آفتاب

قرآن مسلمانوں کی واحد الہامی کتاب ہے۔ جب رسولِ اکرمؐ وفات پا گئے اور صحابہ اُمت کے مستقبل کے متعلق متفکر ہوئے تو حضرت عمر فاروقؓ نے تسلی دی کہ رسول اللہ قرآن اُمت کی ہدایت کے لئے چھوڑ گئے ہیں۔ اور اُمت کی رہبری کے لئے یہی کافی ہے۔ ان سب باتوں کی وجہ سے یہ خیال ہونا چاہیئے تھا کہ مسلمان بالخصوص علما ہر امر میں قرآن کے پیرو کار ہوتے۔ لیکن واقعات اس کے برعکس ہیں +

قرآن پر عمل کرنے کے لئے سب سے پہلی ضرورت یہ ہے کہ انسان اسے سمجھے اور پھر اس پر عمل کرے۔ ہندوستان کے علما نے تو قریباً نو سو سال تک عام مُسلمانوں کے لئے قرآن سمجھنے کی کوئی ضرورت ہی محسوس نہ کی۔ لاکھوں لوگوں نے کلام مجید پڑھا۔ لیکن ہزار میں سے ایک ہوگا جو عربی سے واقف ہو اور اس کے احکام سمجھ سکتا ہو۔ جب شاہ ولی اللہؒ نے یہ محسوس کیا کہ قرآن "کتابِ ہدایت" ہو کر نازل ہؤا ہے "کتابِ قرأت" ہو کر نہیں۔ تو انہوں نے کلام مجید کا فارسی ترجمہ کیا تاکہ عوام قرآن کو فقط طوطے کی طرح دُہرا نہ دیا کریں۔ بلکہ سمجھ کر پڑھیں۔ اور اسے چراغِ راہ بنائیں۔ لیکن اس سے مذہبی حلقوں میں ایک آگ سی لگ گئی۔ لوگ تلواریں کھینچ کر آ گئے۔ اور شاہ صاحب کو جان بچانی دُشوار ہو گئی!

آج حالات اس سے بہتر ہیں۔ لیکن پھر بھی علما مسلمانوں کی زندگی کو جن احکام کے ماتحت منضبط کرنا چاہتے ہیں۔ وہ ردّ المختار۔ مالابُدمنہ۔ بہشتی زیور اور دوسری فقہی

کتابوں کے احکام ہیں۔ جو شائد دس فی صدی تو قرآن مجید سے ماخوذ ہیں اور باقی سب دوسرے ذرائع سے قرآن نے اسلام کے متعلق "اللّٰہ ین لیسرؑ" کہا تھا اور متعدد احکام کا ذکر کرتے ہوئے توضیح کی تھی کہ خدا اسلام کو مشکل اور تکلیف دہ مذہب نہیں بنانا چاہتا۔ رسولِ اکرمؐ نے ہمیشہ اس اصول پر عمل کیا ہے۔ انہوں نے ایک تو بقول شاہ ولی اللہؒ اکثر جزوی باتوں کو لوگوں کی رائے پر چھوڑا اور انہیں بالتفصیل منضبط نہ کیا۔ دوسرے جب دو جائز اور مناسب باتوں میں ایک آسان ہوتی اور دوسری مشکل۔ تو وہ ہمیشہ اُمّت کے لئے آسان کو چنتے۔ جب انہوں نے ابوموسٰے اشعری اور معاذ بن جبل کو ترویج شرع کے لئے یمنؓ بھیجا تو انہیں ہدایت دی "تم دونوں آسانی کیجو۔ تنگی مت کیجو"۔ لیکن فقہائے اسلام مشکوک اور ضعیف حدیثوں کی بنا پر اور قیاس کو ضرورت سے زیادہ وسعت دے کر زندگی کی ان ذرا ذرا سی باتوں کو جنہیں قرآن نے انسان کے اپنے ایمان اور اس کی سمجھ پر چھوڑا تھا اور جن کے متعلق رسولِ اکرمؐ نے اپنے معاصروں کو ہر طرح کی آزادی دی تھی۔ شرع کے تحت میں لے آئے۔ اور دنیا کا کوئی حقیر سے حقیر کام ایسا نہ رہا۔ جو واجب۔ مستحب۔ مباح۔ مکروہ اور حرام کی پانچ شقوں میں سے کسی ایک کے تحت نہ آتا ہو۔ نتیجہ یہ کہ اسلام جسے قرآن نے "آسان مذہب" کہا تھا۔ یہودی مذہب سے بھی زیادہ مشکل ہو گیا۔ اور دین جس کا مقصد روحانی اور اخلاقی ترقی تھا۔ اب ان باتوں کا بیان ہو گیا کہ آیا ڈاڑھی کا سفید بال چننا جائز ہے یا ناجائز۔ ناک کے بال اکھیڑنا چاہیئے یا کتروانا۔ سونے کی آرسی پہننا جائز ہے تو کیا اس میں منہ دیکھنا بھی جائز ہے وغیرہ وغیرہ۔ ایک تو لوگ مغز کو چھوڑ کر استخوان کے پیچھے پڑ گئے۔ دوسرے روزمرہ زندگی کے معمولی کاموں کے متعلق بھی معیار یہی ہونے لگا کہ کیا ردّ المختار وغیرہ کی رو سے وہ ناجائز ہیں یا نہیں۔ یہ سوال کہ وہ فرد یا ملت کے لئے مفید ہیں یا نہیں۔ پسِ پشت ہوتا گیا۔ اور لوگ بجائے اپنی عقلِ خداداد

لہ "انصاف" مصنفہ شاہ ولی اللہؒ

کا استعمال کرنے کے فقہا کے مقلد محض بن گئے جو آخر مُلہم مِن اللہ بھی نہیں تھے۔

ایک فرانسیسی مصنف جس نے "اسلام اور مسلمانوں کی نفسیات" پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے۔ کہ چونکہ عام مسلمانوں میں دماغی تربیت سے زیادہ حافظے پر اور ذہنی آزادی سے زیادہ فقہا کی غلامانہ تقلید پر زور دیا جاتا ہے۔ اس لئے مسلمان دنیا میں دوسری قوموں کے بالمقابل مُعزز جگہ نہیں حاصل کر سکتے۔ وہ بھی مانتا ہے۔ کہ یہ طرزِ عمل قرآنی نہیں۔ وہ لکھتا ہے۔ "پیغمبر صلعم اور قرآن کی سپرٹ ان لوگوں سے بہت مختلف ہے۔ جنہوں نے شرع اسلامی کو منضبط کیا۔ پیغمبر صلعم نے دوسرے مذاہب کی نیک اور مفید باتیں اخذ کرنے سے کبھی گریز نہیں کیا۔ لیکن اب مسلمانوں کا عمل قرآن پر نہیں رہا۔ بلکہ احکامِ قرآنی کی اس ترجمانی پر ہے۔ جو فقہا نے کی۔ اور چونکہ فقہا نے شرع اسلامی اس زمانے میں منضبط کی۔ جب مسلمان فاتح اور غالب تھے۔ اس لئے انہوں نے اپنے زمانے سے مختلف اور زیادہ مشکل صورت حالات کا خیال نہیں رکھا۔ انہوں نے قرآن کی فراخ روی کی جگہ اسلام کو ایک ظاہر پرستی دے دی اور آیندہ ترقی کا راستہ بند کر دیا۔" اس مصنف نے اپنے بیان کو کئی مثالوں سے واضح کیا ہے۔ مثلاً وہ کہتا ہے۔ کہ "قرآن میں مذہبی رواداری کا بڑا خیال رکھا گیا ہے۔ بالصراحت ارشاد کیا گیا ہے۔ کہ سب نبی پاک تھے۔ اور مختلف نبیوں میں فرق نہ نکالو" سُورۃ المائدہ" میں نیک عیسائیوں اور یہودیوں کو خاتمہ بالخیر کی بشارت دی گئی ہے۔ اور ان کا ذکر شفقت، رواداری اور بے تعصبی سے کیا گیا ہے۔ لیکن کیا اس مذہبی رواداری پر آج مسلمانوں کا عمل ہے؟"

یہی مصنف آگے چل کر کہتا ہے۔ کہ اخلاقی اور معاشرتی اصلاح کے کئی اہم اصُول قرآن نے دُنیا کو سمجھائے۔ اور اخلاقی اور معاشرتی نقطۂ نظر سے مسلمانوں کو دوسری قوموں سے ممتاز اور سربلند کر دیا۔ دوسری قوموں نے کئی ایسے اصول مسلمانوں سے اخذ کئے۔ اور اُن کو اتنی وسعت دی۔ کہ آج دنیوی امور ہی میں نہیں بلکہ اخلاقی اور معاشرتی اُمور میں بھی وہ

مسلمانوں سے آگے ہیں ۔ لیکن مسلمانوں نے نہ صرف ان اصولوں کی مزید پیروی اور توسیع گوارا نہ کی ۔ اور ایک حد سے آگے نہ بڑھے ۔ بلکہ قرآنی ارشادات کی ترجمانی میں بھی اہم قرآنی مصلحتوں کو نظر انداز کر دیا ۔ اور صرف لفظوں پر توجہ کی ۔ اپنے اس نظریے کی تائید میں مصنف نے کئی مثالیں دی ہیں ۔ ایک عورتوں کے درجے کے متعلق ہے ۔ عورتوں کے متعلق وہ کہتا ہے ۔ کہ قرآن کے نازل ہونے سے پہلے عرب میں عورتوں کی جو حالت تھی ۔ تاریخ دان اُس سے خوب واقف ہے ۔ ایک بیٹی کا پیدا ہونا بڑی مصیبت سمجھی جاتی تھی ۔ دختر کشی اور لڑکیوں کو زندہ گاڑ دینے کی رسم عام تھی ۔ ایک آدمی دس بیس جتنی عورتوں سے چاہتا شادی کر لیتا ۔ اور جب وہ مر جاتا ۔ تو دوسری جائداد ۔ گائے بیل کی طرح اُس کی بیویاں بھی اُس کے وارث کی ملکیت ہو جاتیں ۔ قرآن نے عورتوں کا درجہ بلند کیا ۔ دختر کشی کی قطعاً ممانعت کر دی ۔ عورتوں کو جائداد کا حق دیا ۔ اور بیویوں کی تعداد جو اب بھی بعض قوموں میں غیر محدود ہے ۔ محدود کر دی ۔ مزید پابندیاں لگا دیں ۔ اور شرط عائد کر دی ۔ کہ تمام بیویوں کے ساتھ پورا انصاف کیا جائے ۔ رسولِ اکرمؐ نے آخری خطبے میں بھی کمزور صنف کے حقوق پر توجہ دلائی تھی ۔ اور ارشاد کیا تھا ۔ کہ اپنی بیویوں کے ساتھ مہربانی اور محبت کا سلوک کرو ۔ ان سب ہدایات اور ارشادات کے باوجود (مصنف کہتا ہے) آج مسلمان سوسائٹی میں عورت کا جو درجہ ہے ۔ اُس سے زمانہ واقف ہے ۔ اور شائد یہ کہنا غلط نہیں ۔ کہ کئی باتوں میں مسلمان عملاً زمانۂ جاہلیت کے عربوں کی پیروی کر رہے ہیں ۔ قرآن اور رسولِ اکرمؐ کی نہیں !

علامہ اقبالؔ کو اس مصنف کے تمام نظریوں سے اتفاق نہیں ۔ لیکن اُنہوں نے اُس کی کتاب کا بہ نظرِ غور مطالعہ کیا ہے ۔ اور ترکی کے متعلق اس کی رائے اپنے انگریزی خطبات میں نقل کی ہے ۔ انہیں بھی اس امر کی بڑی شکایت ہے ۔ کہ مسلمانوں نے قرآنی سپرٹ کا خیال نہیں رکھا ۔ علمِ فقہ کے متعلق تو اُنہوں نے ایک انگریزی لیکچر میں کہا ہے ۔ کہ اسلام کے دورِ آخر میں علم بالعموم اُن لوگوں کے ہاتھ میں رہا ۔ جو بڑی دماغی قابلیت کے

مالک نہ تھے اور جنہوں نے رُوح کو چھوڑ کر الفاظ کی پرستش شروع کی۔ لیکن ہمارے مفسّرین سے بھی وہ مطمئن نہیں ؎

اسی قرآں میں ہے اب ترکِ جہاں کی تعلیم — جس نے مومن کو بنایا مہ و پرویں کا امیر

قرآن اقبالؔ کے نزدیک انسان کو رازِ حیات سے آگاہ کرتا ہے۔ لیکن ظاہر ہے۔ کہ ایسی کتاب سے ہر انسان اپنی استطاعت کے مطابق مستفید ہوتا ہے۔ بقول رومیؔ ؎

بال بازاں را سُوئے سلطاں برد — بال زاغاں را بگورستاں برد

قرآن کریم جن ہاتھوں میں رہا اُنھوں نے اس میں رازِ حیات تو نہ ڈھونڈا۔ لیکن جہاں کہیں امم سابقہ کی طرف مختصر اشارہ تھا مثلاً ارمؔ۔ ہاروتؔ۔ ماروتؔ وغیرہ۔ اور جن بیانات کو دانستہ پھیلا کر بیان نہیں کیا گیا تھا۔ اُن کی تفصیلات یہودیوں سے لے کر یا ان ضعیف روائتوں کی بنا پر جن کا لباس پہن کر یہودی اور عیسائی عقائد اور افسانے اسلام میں داخل ہوئے۔ اُنھوں نے قرآن کو بھی قصّوں اور کہانیوں کی ایک کتاب بنا دیا ؎

واعظِ دستاں زنِ افسانہ بند — معنیٔ اُو پست و حرفِ اُو بلند

از خطیب و دیلمی گفتارِ اُو — با ضعیف و شاذ و مرسل کارِ او

قرآن نے آخرت کے ثواب و عذاب کا ذکر بیشتر لوگوں کو اِس دنیا میں نیک کام کرنے اور شرک و بدی سے بچنے کے لئے کیا تھا۔ لیکن ہمارے واعظ عذابِ قبر و روزِ محشر کی تفصیلات ہی میں اس قدر کھو گئے کہ اصل مقصد یعنی دینی و دنیاوی اصلاح و ترقی سے غافل ہو گئے جس کے حصول کے لئے قرآن نے آخرت کا ذکر کیا تھا۔ اقبالؔ اُن سے کہتا ہے ؎

سخن ز نامہ و میزاں دراز تر گفتی — بحیرتم کہ نہ بینی قیامتِ موجود!

اقبالؔ مفسّرین کی عام روش کا اس قدر شاکی ہے کہ وہ چاہتا ہے کہ مسلمان تفاسیر کو چھوڑ کر قرآن کا مطالعہ کریں ؎

ترے ضمیر پہ جب تک نہ ہو نزولِ کتاب — گرہ کُشا ہے نہ رازیؔ نہ صاحبِ کشّافؔ

قرآن خود ایک کتاب ہدایت ہے۔ جس کا دعوٰے ہے کہ وہ صاف اور واضح ہے۔ مسلمانوں کو چاہیئے۔ کہ اُسے خود پڑھیں۔ اور اس کی حکمت سے مستفید ہوں ؎

از تلاوت بر تو حق دارد کتاب
تو ازو کامے کہ می خواہی بیاب

اقبالؔ نے امام فخرالدین رازیؔ کا کئی جگہ ذکر کیا ہے۔ لیکن وہ سمجھتا ہے۔ کہ اگر مُفسّر ایک نکتے کو واضح کرتے ہیں۔ تو غیر ضروری اور مشکوک تفصیلات سے بیس بلیغ اور اہم نکتوں پر پردے ڈال دیتے ہیں۔ اس لئے وہ رازیؔ سے مطمئن نہیں ہُوا ؎

غریب اگرچہ ہیں رازیؔ کے نکتہ ہائے دقیق
علاجِ ضعفِ یقیں اِن سے ہو نہیں سکتا

ایک نہایت پُر معنی فارسی شعر ہے ؎

چوں سُرمۂ رازیؔ را از دیدہ فرو شُستم
تقدیرِ اُمم دیدم پنہاں بہ کتاب اندر!

اقبالؔ نے فقط مفسرین اور فقہا کی ترجمانی پر نکتہ چینی نہیں کی۔ بلکہ قرآن کے کئی مسائل پر اظہارِ خیال کیا ہے۔ اور وہ طریقے بتائے ہیں۔ جن سے ہم اِس کتاب سے اسرارِ حیات اخذ کر سکتے ہیں۔ ہم اُس کے "محکماتِ عالمِ قرآن" کا ذکر کر چکے ہیں۔ جنہیں وہ انسانی اجتماعی زندگی کی بنا بنانا چاہتا ہے۔ اُن کے علاوہ اُس نے اپنی نظم و نثر کی تصانیف بالخصوص اپنے انگریزی لیکچروں میں قرآنی تعلیمات کے کئی اہم پہلوؤں پر بصیرت افروز تبصرہ کیا ہے۔ اقبالؔ کی ان تحریرات کی اہم تریں خصوصیت یہ ہے۔ کہ ان میں اُس نے نہ تو جدید متکلمین کی طرح اسلامی دینیات کو مغربی عقائد اور اصولوں پر منطبق کرنے کی کوشش کی ہے اور نہ قدیم فقہا اور مفسرین کی کورانہ تقلید کر کے قرآن کے اہم اور بلیغ معانی پر بلند آہنگ الفاظ۔ اور دلچسپ قصّوں کا پردہ ڈالنا گوارا کیا ہے۔ مثلاً جہاد کے مسئلے پر جدید متکلمین اور احمدیوں نے کلامِ مجید کی جو ترجمانی کی ہے۔ اقبالؔ اُس سے متفق نہیں معلوم ہوتا۔ اور اُس نے ایک اُردو قطعے میں اس کا مذاق اُڑایا ہے ؎

کچھ غم نہیں جو حضرتِ واعظ ہیں تنگ دست
تہذیبِ نو کے سامنے سر اپنا خم کریں

رَدِ جہاد میں تو بہت کچھ لکھا گیا   تردیدِ حج میں کوئی رسالہ رقم کریں

"ضربِ کلیم" میں بھی جہاد کے عنوان سے ایک نظم ہے۔ اُس کے چند اشعار ہیں ؎

باطل کے فال و فر کی حفاظت کیواسطے   یورپ زرہ میں ڈوب گیا دوش تا کمر

ہم پوچھتے ہیں شیخِ کلیسا نواز سے   مشرق میں جنگ شر ہے تو مغرب میں بھی ہے شر

حق سے اگر غرض ہے تو زیبا ہے کیا یہ بات   اِسلام کا محاسبہ یورپ سے درگزر!

"زبورِ عجم" کی ایک غزل کا مطلع ہے ؎

تکیہ بر حجّت و اعجازِ بیاں نیز کنند   کارِ حق گاہ بہ شمشیر و سناں نیز کنند

ہم گذشتہ اوراق میں ذکر کر چکے ہیں۔ کہ ذات و صفات الٰہیہ کا ذکر کرتے ہوئے کِس طرح اربابِ ظاہر اور حضرات صوفیہ نے قرآنی میانہ روی اور بالغ نظری کو ہاتھ سے چھوڑ دیا۔ اور افراط و تفریط کی وجہ سے طرح طرح کی غلطیوں میں پڑ گئے۔ ظاہر ہے کہ قرآن کریم کا خدا ان انتہا پسندوں کے عقائد کے مُطابق ایک معیّن اور محدود ہستی نہیں۔ جو ایک کرسی پر جس کی وسعت بھی ان لوگوں کو معلوم ہے ایک بشری انداز میں انسانی دُنیا سے دُور اور الگ بیٹھی ہوئی ہے۔ لیکن قرآن کا خدا بعض وحدت الوجودیوں کے خیال کے مطابق مادہ کا جوہر بھی نہیں۔ اور قرآن یہ نہیں چاہتا۔ کہ خدا اور انسان بالخصوص گمراہ انسان کا رشتہ اتنا قریب سمجھا جائے۔ کہ آدمی یہ سمجھ کر کہ گمراہ اور غلط کار انسان بھی ذاتِ الٰہیہ کا ایک پرتو ہے۔ بعض صوفیوں کی طرح اُس کی اِصلاح سے باز رہے ؛

قرآن میں مکمل اور جامع حقیقت کا بیان ہے۔ لیکن انتہا پسند اربابِ ظاہر اور اربابِ تصوف نے حقیقت کا فقط ایک ایک پہلو دیکھا۔ اور اختلاف میں پڑ گئے۔ اسی طرح شریعت اور طریقت کے درمیان ظاہر اور باطن کی جنگ ہے۔ شریعت نے بیشتر اپنی توجہ انسان کے ظاہری کاموں کی طرف رکھی۔ اور طریقت نے صفائے باطن کی طرف۔ لیکن انسان کی اصلاح کے لئے اصلاحِ باطن اور ظاہری اعمال کی اصلاح دونوں ضروری ہیں۔ رسول اکرمؐ کی ذات میں

دونوں باتیں بدرجہ کمال جمع تھیں ۔ اور اگر اُن کی پُوری طرح پیروی کی جائے ۔ تو شریعت اور طریقت کا ظاہری اختلاف دُور ہو جاتا ہے +

اسی طرح تقدیر کا مسئلہ ہے ۔ انسان مجبُور ہے یا مختار ۔ اِس بارے میں بھی قرآن کریم کا ارشاد نامکمل یا یک طرفہ نہیں ۔ خداوند کریم ہر ایک چیز پر قادر ہے ۔ اور اُس کی مرضی کے بغیر کچھ نہیں ہو سکتا ۔ لیکن انسان اپنے کاموں کے لئے پوری طرح ذمہ دار بھی ہے ۔ اقبال نے ان تین اہم قرآنی مسائل میں قرآن کی بالغ نظری اور حسنِ تناسب کا پُورا خیال رکھا ہے ۔ جنہیں ترک کرنے سے اہلِ شریعت اور اہلِ طریقت مختلف رستوں پر پڑ گئے ہیں ۔ جہاں تک خدا کی ہستی کا تعلق ہے ۔ اقبال نے رسولِ اکرمؐ کی نہایت مفید اور دانشمندانہ ہدایت پر عمل کیا ہے ۔ اور خدا کی ذات وصفات کے متعلق دقیق مسائل میں نہیں پڑا ۔ بقول اُس کے ؎

بحث میں آتا ہے جب فلسفۂ ذات وصفات
قوم کے ہاتھ سے جاتا ہے متاعِ کردار

جہاں تک انسان کے ظاہری کاموں اور باطنی اصلاح کا تعلق ہے ۔ اقبال نے دونوں پر زور دیا ہے ۔ شرعی احکام کی تعمیل پر بھی اور صفائے باطن کی ضرورت پر بھی ۔ مسئلہ تقدیر میں بھی اُس نے اُس گروہ کی پیروی نہیں کی ۔ جو اِس معاملے میں اتنا غلو کرتے ہیں ۔ کہ ہر ایک کام خدا پر چھوڑ کر ہاتھ پاؤں ہلانا غیر ضروری سمجھتے ہیں ۔ یا ہر ایک کام کو مشیتِ ایزدی کا اظہار سمجھ کر نیکی اور بُرائی میں تمیز نہیں کرتے ۔ لیکن بعض جدید متکلمین کی طرح اُس نے تقدیر کی قرآنی مصلحت نظر انداز کر کے اس سے قطعاً انکار بھی نہیں کیا ۔ اقبال کہتا ہے کہ جبر و تقدیر کا اصول بھی زندگی کے اُن اہم اصولوں کی طرح ہے جنہیں انسان خود اپنی استعداد کے مطابق مفید یا مُضر بنا لیتا ہے ۔ ؎

بال بازاں را سُوئے سُلطاں برد
بال زاغاں را بگورستاں برد

عقیدۂ قدر و جبر ایک عالی ہمت انسان کے لئے زرہ بکتر ہے ۔ لیکن کم فہموں کے لئے یہی مسئلہ زنجیر پا بھی ہو سکتا ہے ۔ یعنی جو کم ہمت اور ناکارے لوگ کوشش اور تردد چھوڑ کر

اس خام خیالی کا شکار ہو جاتے ہیں ۔ کہ جو اُن کی قسمت میں لکھا ہے ۔ وہ انہیں مل جائے گا۔ اُن کے لئے تو تقدیر کا مسئلہ اور اسلامی تسلیم و رضا کا اصُول زہر کی طرح مضر ہے ۔ لیکن اُن عالی ہمت لوگوں کے لئے جو جد و جہد پوری طرح جاری رکھتے ہیں ۔ مگر اپنی کوشش کے نتائج خدا پر چھوڑ دیتے ہیں ۔ اور یہ سمجھ کر کہ اللہ تعالےٰ کی مرضی سے مفر نہیں اور فکر ۔ خوف اور بے چینی کو دل سے نکال کر زندگی کی تگ و دو میں مردانہ وار شریک ہوتے ہیں اُن کے لئے یہ اصول آبِ حیات ہے ؎

جبرِ مردِ خام را آغوشِ قبر پختہ مردے پختہ تر گردد ز جبر

جبرِ ما بیخ و بُنِ ما برکند جبرِ خالد عالمے برہم زند

ان مسائل کے علاوہ اقبالؔ نے جس مسئلے میں خاص امتیاز حاصل کر لیا ہے ۔ وہ رجائیت یعنی زندگی کے متعلق ایک اُمید افزا نقطۂ نظر ہے ۔ رجائیت اقبالؔ کی شاعری کی امتیازی خصوصیت ہے ۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ یہ رجائیت انگریزی شاعر براؤننگ کا اثر ہے ۔ لیکن یہ بالکل غلط ہے ۔ اپنی شاعری کے پہلے اور دوسرے دَور میں جب براؤننگ اور دوسرے مغربی شعرا اور فلسفی اقبالؔ کے زیرِ مطالعہ تھے ۔ اُس نے "تصویرِ درد" اور "نالۂ یتیم" جیسی نظمیں لکھیں ۔ اقبالؔ کی اُمید افزا شاعری کا آغاز اُس زمانے سے ہؤا جب وہ "اسرارِ خودی" اور "رموزِ بے خودی" لکھ رہا تھا ۔ اور اسی لئے قرآن کا نہائت غائر مطالعہ کر رہا تھا ۔ قرآن دُنیا کی سب سے اُمید افزا مذہبی کتاب ہے ۔ بار بار ارشاد ہے ۔ کہ اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو ۔ کوئی فکر نہ کرو ۔ کوئی خوف نہ کرو ۔ اللہ مومنوں کو دین اور دُنیا کی نعمتیں دے گا ۔ اور اللہ تعالےٰ اپنے وعدوں کو پُورا کرتا ہے ۔ اقبالؔ کی رجائیت کی بنا انہی احکام پر ہے ۔ اُس کی رجائیت خالص اسلامی ہے ۔ اور اُس کی قرآن فہمی کا انعام ۔ جن لوگوں نے واعظوں سے فقط عذابِ قبر اور عذابِ حشر کی داستانیں سُنی تھیں ۔ یا اُن عجمی شعرا کا کلام

پڑھاتھا۔ جو دُنیا کو بیت الحزن سمجھتے تھے۔اقبال نے اُن کے سامنے قرآنی نقطۂ نظر پیش کیا ہے۔ اور لاَتقنطوُمن رحمت اللہ۔لا تحزن اِن اللہ معُناً اور اسی طرح کے دوسرے حیات افزا ارشادات کو پھر مسلمانوں میں عام کیا ہے۔ اور بزور کہا ہے ؎

مُسلم استی رسینہ را از آرزو آباد دار ہر زماں پیشِ نظر لایخلف المعیاد دار

حقیقت یہ ہے کہ ایک بڑا شاعر یا مفکر چند حالات سے متاثر ہوتا ہے۔ اور اپنی شاعری میں اُن تاثرات کا اظہار کرتا ہے۔ جو ان حالات کی وجہ سے اُس کے دماغ میں آتے ہیں۔ لیکن اُس کے کم فہم مقلدین جو حالات کو بطور خود نہیں دیکھتے۔ انہیں تاثرات کو دُہراتے رہتے ہیں۔ فارسی کے اکثر بڑے شاعر اُسی زمانے میں پیدا ہوئے۔ جب خلافتِ عباسیہ کے خونیں انجام اور منگولوں اور ترکوں کے مظالم کی وجہ سے دُنیا واقعی بیت الحزن بنی ہوئی تھی۔ حافظؔ نے لکھا ؎

ایں چہ شوریست کہ در دورِ قمر می بینم ہمہ آفاق پُر از فتنہ و شرے بینم

اس کے بعد زندگی کے مصائب اور تکالیف بیان کرنا ایک عام رواج ہوگیا۔ جس سے فارسی شاعری ابھی حال ہی میں آزاد ہوئی ہے۔ اسی طرح حالیؔ نے قوم کی زبوں حالی سے متاثر ہوکر مسدس میں قوم کا دردناک مرثیہ لکھا ؎

اے خاصۂ خاصانِ رُسل وقتِ دُعا ہے
اُمت پہ تری آکے عجب وقت پڑا ہے

اس کے بعد دوسرے اُردو شعرا بھی تقلیداً اسی روش پہ چلتے رہے۔ اقبالؔ نے یہ راستہ ترک کرکے اُمید۔ ہمت اور جرأت کا راستہ اختیار کیا ہے۔ ایک تو اِس کی وجہ یہ ہے کہ حالات اب حالیؔ کے زمانے سے بہتر ہیں۔ اور دوسرے اقبالؔ کا ایمان ہے۔ کہ قرآن نے مومنوں سے جو وعدے کئے تھے۔ وہ پورے ہوکر رہیں گے۔ بعض تاریخی وجوہات کی بنا پر قنوطیت اسلامی بالخصوص عجمی شاعری کا جزو ہوگئی ہے۔ لیکن حقیقتاً یہ

نقطۂ نظر ہرگز اسلامی نہیں ۔قرآن تو ایسی کتاب ہے ۔جس میں ہمت بڑھانے اور اُمید دلانے کو ایک اہم نیکی بتایا گیا ہے ۔ اور صبر و استقلال کو مومن کی خاص علامت قرار دیا ہے ۔اس کے علاوہ متعدد سورتیں ہیں جن کا مقصد مایوسی کی حالت میں اُمید دلانا اور کرب اور بے چینی کی حالت میں تسکین دینا ہے ۔ سورۃ الضحٰے میں ارشاد ہوتا ہے ۔"اور تمہارا انجام تمہاری ابتدا سے بہتر ہوگا۔" اس میں رسولِ اکرمؐ سے ارشاد ہے ۔ "اور تم کو خدا اتنا کچھ دے گا ۔ کہ تم خوش ہو جاؤ گے ۔ کیا تم کو اُس نے یتیم نہیں پایا ۔ اور پھر ٹھکانا دیا اور تم کو (تلاشِ حق میں) بھٹکتے بھٹکتے دیکھا ۔ اور راستہ دکھا دیا اور تم کو مفلس پایا اور غنی کر دیا ۔" اس سے اگلی سورت "الانشرح" ہے ۔ اور اِس میں بھی یہی اُمید اور صبر اور استقلال کا سبق ہے (ترجمہ) "کیا ہم نے تمہارا سینہ صاف نہیں کر دیا۔ اور وہ بوجھ نہیں اتار دیا ۔جس نے تمہاری کمر توڑ رکھی تھی ۔ اور تمہارے ذکر کا آوازہ بلند نہیں کیا بے شک مشکل کے ساتھ آسانی آتی ہے ۔ بے شک مشکل کے ساتھ آسانی آتی ہے ۔"

آج بھی زندگی کی مشکلات میں، حق و باطل کی لڑائی میں ۔قرآن کا یہ حیات افزا پیغام اور رسول اکرمؐ کی اپنی زندگی کا نمونہ انسان کو مایوسی اور فکر سے نجات دلا سکتا ہے ۔ سورۃ الضحٰے' اور سورۃ الانشرح' کے ارشادات فقط رسُول اکرمؐ کے لئے نہ تھے ۔قرآن تمام اُمت کے لئے کتابِ ہدایت ہے اور ایک زمانے کے لئے نہیں بلکہ ہمیشہ کے واسطے اقبالؔ کلام مجید کے ان ارشادات سے پوری طرح متاثر ہوا ہے ۔ اور اُن پر عمل کرتے ہوئے اُس نے اسلام اور مسلمانوں کے متعلق وہ حقائق پیش کئے ہیں ۔جو رسمی نقطۂ نظر سے مختلف ہیں اور قرآن کے عین مطابق بھی ۔ مثلاً مسلمانوں کے حال اور مستقبل کا رونا رونا ایک عام رسم ہے ۔ اب یہ صحیح ہے۔ کہ خیالی قلعے باندھنا اور زیاں کا احساس نہ کرنا قوم اور افراد کے لئے مہلک ہوتا ہے ۔لیکن آخر اندھی اور بے وجہ مایوسی بھی قوم کی کوئی خدمت نہیں ۔ اس سے عمل کی قوت شل ہو جاتی ہے اور جس شخص کو ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا نظر آتا ہو ۔وہ حقیقی حالات کا صحیح اندازہ کیا کرے گا۔ اور مستقبل کے لئے کوئی سلامتی کا رستہ اُسے کہاں نظر آئے گا ۔ اقبالؔ نے اس اندھی اور

مُہلک قنوطیت کے خلاف آواز اُٹھائی ہے۔ وہ موجودہ دور کو قوم کا دورِ "نشاۃِ ثانی" سمجھتا ہے۔ اُس کا ایمان ہے کہ اسلام خدا کا آخری پیغام ہے۔ اِس کی حفاظت کا اللہ تعالےٰ نے وعدہ کیا تھا اور وہ اپنے وعدوں کو پورا کر کے رہے گا ؎

اُمتِ مُسلم ز آیاتِ خدا ست　　اصلش از ہنگامۂ "قالوا بلیٰ" ست
از اجل ایں قوم بے پرواستے　　استوار از نحنُ نزّلنا ستے

قوم پر اس سے بھی زیادہ مصیبت کے دن گذرے ہیں۔ لیکن اللہ تعالےٰ کی رحمت شریکِ حال رہی۔ اسلام پر ہلاکو خاں کے حملے سے زیادہ آفت کونسی آئی ہے۔ جس کی فوجوں نے بغداد یعنی اسلام کا مذہبی، سیاسی اور دماغی مرکز تباہ کر دیا۔ اکثر مسلم ممالک کے باشندوں کو تہ تیغ کیا۔ اور اس قوم کا سارا انتظام پراگندہ کر دیا۔ لیکن ہلاکو ہی کی قوم یعنی ترکوں سے اللہ تعالےٰ نے کئی صدیاں اسلام کی حفاظت کا کام لیا۔ اقبال جب اِن باتوں کا ذکر کرتا ہے تو اُس کے اشعار میں رجز کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے ؎

آسماں با ما سرِ پیکار داشت　　در بغل یک فتنۂ تاتار داشت
بندہا از پا کشود آن فتنہ را　　بر سرِ ما آزمود آں فتنہ را
فتنۂ پامالِ راہش محشرے　　کشتۂ تیغ نگاہش محشرے
سطوتِ مسلم بخاک و خوں تپید　　دید بغداد آنچہ روما ہم ندید
تو مگر از چرخِ کج رفتار پُرس　　زاں نو آئینِ کہن پندار پُرس
آتشِ تاتاریاں گلزارِ کیست؟
شعلہ ہائے اوگُلِ دستارِ کیست؟

اِسی نظم میں آگے چل کر لکھا ہے ؎

رومیاں را گرم بازاری نماند　　آں جہانگیری جہانداری نماند
شیشۂ ساسانیاں در خوں نشست　　رونقِ خمخانۂ یونان شکست

مصر ہم در امتحاں ناکام ماند　　استخوانِ او تہِ اہرام ماند
در جہاں بانگِ اذاں بودست و ہست　　ملتِ اسلامیاں بُودست و ہست
عشق آئینِ حیاتِ عالم است　　امتزاجِ سالماتِ عالم است
عشق از سوزِ دلِ ما زندہ است　　از شرارِ لا الٰہ تابندہ است

گرچہ مثلِ غنچہ دلگیریم ما
گلستاں میرد اگر میریم ما

تقلیدِ مغرب

اسلام کے سب سے قابلِ احترام مورخ علامہ ابنِ خلدوںؒ نے ایک جگہ لکھا ہے کہ جب ایک قوم دوسری قوم پر غالب آتی ہے تو یہ غلبہ صرف سیاسی اور ظاہری نہیں ہوتا۔ بلکہ حاکم قوم کی حکومت دلوں اور دماغوں پر مسلط ہو جاتی ہے اور اخلاق و تہذیب اور مذہب میں بھی حاکم قوم کے خیالات محکوم قوم کے خیالات پر غالب آجاتے ہیں۔ آج اس کلیہ کی نہایت واضح مثال مشرق اور مغرب کے تعلقات ہیں۔ یعنی محکوم مشرقی ممالک نہ صرف اپنے حاکموں کو خراج دیتے ہیں اور اُن کے احکام کی پیروی کرتے ہیں بلکہ ان باتوں میں بھی جن پر حکومت زور نہیں دیتی یا جن سے حکومت کا کوئی تعلق نہیں۔ حکمران قوم کی پیروی کو اپنی نجات اور ترقی کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔ اصولاً یہ ضروری نہیں کہ ایسی پیروی ہمیشہ مضر ہو "دع ما کدر خذ ما صفا" کا اصول اتنا وسیع اور عالمگیر ہے۔ کہ جہاں کوئی اچھی یا فائدہ مند چیز ملے خواہ وہ حکمران قوم کی ہی کیوں نہ ہو اُس کا اخذ کرنا مفید ہے۔ اور مغرب یا مشرق کی جن قوموں نے ترقی کی ہے۔ اُنہوں نے اسی اصول پر عمل کیا ہے۔ لیکن اس اخذ و تقلید میں بڑی احتیاط کی ضرورت ہے۔ ہم نے تقلیدِ نبوی کا ذکر کرتے ہوئے یہ بات واضح کی ہے۔ کہ سُنتِ نبوی کی صحیح پیروی اسی صورت میں ہو سکتی ہے۔ کہ اخلاق نبوی کی پیروی ہو۔ فقط ظاہری امور میں شعارِ نبوی کا خیال رکھنا نہ بہت مشکل ہے اور نہ بہت مفید۔ یورپ

اور مغرب کی اچھی باتیں اخذ کرنے میں بھی یہی اصُول پیشِ نظر رکھنا چاہئیے۔ اور ضروری اور غیر ضروری باتوں میں امتیاز رکھا جائے۔ یہ صحیح ہے کہ قرآن حکیم نے اِنَّ اللّٰہَ لَا یُغَیِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰی یُغَیِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِھِمْ کے سادہ اور بلیغ الفاظ میں واضح کر دیا ہے کہ خُدا ایک قوم کو ذلیل یا ممتاز تب ہی کرتا ہے جب یہ قوم اپنے آپ کو ذلت یا رُتبے کے قابل ثابت کرے۔ اور چونکہ اللہ نے مغربی قوموں کو مشرقی قوموں پر ممتاز کیا ہے اس لئے مغربی قوموں میں کئی خُوبیاں ہوں گی جو اُنہیں مشرقی قوموں سے ممتاز کرتی ہیں اور اگر ان خوبیوں کو اخذ کیا جائے۔ تو اس میں قطعاً کوئی ہرج نہیں۔ لیکن یہ ایک نہایت تلخ حقیقت ہے۔ کہ ماضی میں اسلامی ممالک نے بالعموم مغرب کی انہی باتوں کو اخذ کیا ہے۔ جو ظاہری تھیں۔ جن کا اخذ کرنا آسان تھا اور جنہیں حقیقتاً مغرب کی ترقی سے کوئی اصولی تعلق نہ تھا۔

بندۂ افرنگ از ذوقِ نمود — می برد از غربیاں رقص و سرود
نقدِ جانِ خویش در بازد بہ لہو — علم دشوار است می سازد بہ لہو
از تن آسانی بگیرد سہل را — فطرتِ او در پذیرد سہل را
سہل را جُستن دریں دیرِ کہن
ایں دلیلِ آنکہ جاں رفت از بدن

اُنیسویں صدی میں مصر کے دو حاکموں یعنی سعید پاشا اور اسمٰعیل پاشا نے اصلاح اور ترقی کی بڑی کوشش کی۔ قاہرہ کو رشکِ پیرس بنا دیا۔ اور مصر کو یورپی ممالک کے ہم پایہ کر دیا۔ اسمٰعیل نے ۱۸۷۸ء میں بڑے فخر سے اعلان کیا کہ "میرا مُلک اب افریقہ کا حصّہ نہیں!" لیکن نتیجہ؟ مُلک کا مُلک فرانس اور انگلستان کے ہاتھ گرد ہو گیا۔ اور جب اسمٰعیل مرا۔ تو مُلک کا حاکم اُس کا جانشین توفیق پاشا نہ تھا۔ بلکہ لارڈ کرومر۔ ایران میں بھی یہی ہُوا۔ ناصر الدین شاہ قاچار نے یورپ کے کئی سفر کئے۔ اپنے مُلک میں نئی تہذیب کی روشنی پھیلانے کی کوشش کی۔ لیکن کس طرح؟ سارے مُلک میں تمباکو کی کاشت کا ٹھیکہ ایک

مغربی کمپنی کو دے کر۔ اور اگر مجتہدین اس کی مخالفت نہ کرتے تو ایران بھی قرض خواہوں کے ہاتھ گروہو جاتا۔ یورپ کی تقلید کا ایک طریقہ تو یہ ہے۔ جو گذشتہ صدی میں مصر و ایران نے اختیار کیا۔ اور دوسرا وہ ہے جو جاپانی قوم کا طرۂ امتیاز ہے۔ یعنی جاپانیوں نے حتے الوسع امورِ ظاہری میں اپنا شعارِ قومی برقرار رکھا ہے۔ لیکن اُن اہم باتوں میں مغرب کی پیروی کی ہے۔ جن کی وجہ سے مغرب ممتاز ہے۔ یعنی قومی ہمدردی۔ فرض شناسی۔ علم الاشیا صنعت و حرفت!

تقلیدِ یورپ کا مسئلہ مصطفےٰ کمال پاشا اور امیر امان اللہ خان کی کوششوں سے اب بہت نمایاں صورت میں مسلمانوں کے سامنے ہے۔ اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ظاہر پرستی اور کورانہ تقلید کا جو سبق بعض کم فہم مُلّا دیا کرتے تھے۔ آج شیدائیانِ فرنگ بھی اُسی کو راہِ صلاح سمجھے ہُوئے ہیں اور آنکھیں بند کر کے مغرب کی ظاہری تقلید پر زور دے رہے ہیں۔ اقبال کو شکایت ہے کہ ان رہبروں نے ضروری اور غیر ضروری چیزوں میں تمیز نہیں کی اور "حنظل" کو "عود" سمجھ کر غلط راستے پر جا رہے ہیں۔ مثلاً انسانی اصلاح کے لئے ضروری ہے کہ انسان کو تعلیم دی جائے۔ یہ ضروری نہیں کہ اسے ہیٹ پہنا دیا جائے۔ ہیٹ پہنانے یا ریش کی صفائی سے دماغی اصلاح نہیں ہو جاتی۔ اسی طرح مستورات کی اصلاح کے لئے اُن کی درست تعلیم و تربیت ضروری ہے۔ بالوں کو قطع کرنا یا لباس تبدیل کرنا ضروری بلکہ مفید نہیں۔ لیکن ہمارے نئے رہبروں نے حسنِ تناسب کا خیال نہیں رکھا۔ اُن نظری اور بحث طلب چیزوں کے پیچھے پڑ گئے ہیں جو غیر ضروری ہیں۔ اور اصل چیزوں کی طرف پوری توجہ نہیں کی۔ بقول اقبال ؎

قوتِ مغرب نہ از چنگ و رباب ۔۔۔ نے ز رقصِ دخترانِ بے حجاب
نے ز سحرِ ساحرانِ لالہ روست ۔۔۔ نے ز عریاں ساق و نے از قطعِ مُوست
محکمی اُو را نہ از لادینی است ۔۔۔ نے فروغش از خطِ لاطینی است
قوتِ افرنگ از علم و فن است ۔۔۔ از ہمیں آتش چراغش روشن است

حکمت از قطع و برید جامہ نیست　　مانعِ علم و ہنر عمامہ نیست
علم و فن را اے جوانِ شوخ و شنگ　　مغز می باید نہ ملبوسِ فرنگ
اندریں رہ جز نگہ مطلوب نیست　　ایں کلہ یا آں کلہ مطلوب نیست

فکرِ چالاکے اگر داری بس است
طبعِ درّاکے اگر داری بس است

اقبالؔ نے نظم و نثر۔ فقہ۔ شریعت ہر چیز میں مجتہدانہ انداز قائم رکھا ہے۔ علما یا قدیم طبقے کی کہیں بھی کورانہ پیروی نہیں کی۔ اُس کی کئی پرانی نظموں (مثلاً شکوہ) پر بعض علما نے کفر کے فتوے دئے۔ لیکن جس سلیم طبعی اور بلند دماغی نے اقبالؔ کو مشرقی علما کی کورانہ تقلید سے بچالیا ہے وہی اُس کو مغرب کی کورانہ تقلید سے مانع ہے۔ وہ ایک اُردو نظم میں مصلحین مشرق کے متعلق لکھتا ہے ؎

میں ہوں نومید تیرے ساقیانِ سامری فن سے
کہ بزمِ خاوراں میں لے کے آئے ساتگیں خالی
نئی بجلی کہاں ان بادلوں کے جیب و دامن میں
پرانی بجلیوں سے بھی ہے جن کی آستیں خالی

اقبالؔ نے "پیامِ مشرق" میں ایک بڑی پُر معنی اور محبت بھری نظم میں مصطفےٰ کمال پاشا سے خطاب کیا تھا۔ لیکن اُس کی بلند بانگ تجددانہ کوششوں کی نسبت وہ لکھتا ہے ؎

مصطفےٰ کو از تجدد مے سرود　　گفت نقشِ کہنہ را باید زدود
نو نگردد کعبہ را رختِ حیات　　گر ز افرنگ آیدش لات و منات
تُرک را آہنگِ نو در چنگ نیست　　تازہ اش جز کہنۂ افرنگ نیست

مغربی تہذیب کی سطحی اور رسمی تقلید کے متعلق اقبالؔ کا جو نقطۂ نظر ہے۔ وہ مندرجہ بالا اقتباسات سے ظاہر ہے۔ لیکن اس کے باوجود یہ بتا دینا ضروری ہے۔ کہ اقبالؔ ہمارے چند با اثر

بزرگوں کی طرح رجعت پسند بالکل نہیں۔ وہ مغرب کی کورانہ تقلید کا مخالف ہے۔ لیکن اچھی چیزیں اخذ کرنے میں کوئی نقص نہیں سمجھتا۔ اُس کی اپنی علمی زندگی اس "خذ ما صفا" کی نہایت درخشاں مثال ہے۔ اُس کی ذہنی نشو و نما کے متعلق مختلف نظریے قائم کئے گئے ہیں۔ لیکن اس حقیقت سے انکار کرنا بے انصافی ہے۔ کہ اگر وہ مغربی علوم سے بالکل بے بہرہ ہوتا۔ تو اُس کی اپنی ذہنی ترقی ایک حد سے آگے نہ بڑھتی۔ اس کے علاوہ اقبال یہ بھی جانتا تھا۔ کہ مغربی علوم کی مخالفت اور مذمت جو بعض بااثر حلقوں نے علی گڑھ تحریک کے بعد طرح طرح سے جاری کر رکھی ہے۔ وہ مسلمانوں کے قومی جذبات کی تسکین کا باعث ہو تو ہو۔ لیکن اسلامی تعلیمات کے یقیناً مخالف ہے۔ تحصیل علم کے متعلق رسولِ اکرمؐ کی واضح حدیث ہے۔ کہ اگر علم چین میں بھی ملے۔ تو وہاں جا کر اسے حاصل کرو۔ اب اگر چین میں جو علم حاصل ہو سکتا ہے۔ اُس کے حصول کی بھی تلقین کی گئی ہے۔ تو مغربی علوم کے حصول کی کیوں مخالفت کی جائے۔ اس کے علاوہ دنیاوی نقطۂ نظر سے بھی قوم کے لئے باقی دنیا کی علمی ترقیوں سے مستفید نہ ہونا اور کوئیں کے مینڈک کی طرح "ہمچو ما دیگرے نیست" کی غلط فہمی میں مُبتلا رہنا سخت مُضر اور نقصان دہ ہے ٭

اقبال یورپ کی کورانہ اور سطحی تقلید کا مخالف ہے۔ لیکن ہر جگہ سے اچھی چیزیں اخذ کرنے کے اصول پر پوری طرح عامل ہے

گفت حکمت را خدا خیرِ کثیر
ہر کجا ایں خیر را بینی بگیر!

اقبال

اقبال نے شاعری اُنیسویں صدی کے اخیر میں شروع کی اور جلد ہی اُردو شعرا میں امتیازی درجہ حاصل کر لیا۔ اس کی نیچرل اور قومی نظمیں ساری قوموں میں مقبول تھیں اور خیال کیا جا رہا تھا کہ وہ ہندوستان کے بیدار شدہ سیاسی احساسات کا مظہر ہوگا۔ لیکن اقبال نے خود اس قبولیتِ عامہ کو ٹھکرا کر اپنی شاعری کے لئے ایک علیحدہ رستہ اختیار کیا۔

جس میں دِقتیں اور مخالفتیں تھیں لیکن جس کی ضرورت وہ خود سمجھتا تھا +

روحانی نقطۂ نظر سے مسلمانانِ ہند کے لئے یہ بڑی کشمکش کا زمانہ تھا۔ علی گڑھ سے قوم کی بڑی اُمیدیں وابستہ تھیں۔ اُس کے بانیوں نے قوم سے وعدہ کیا تھا کہ یہاں کے طالب علم مذہب اور علومِ دنیوی دونوں میں قوم کی ساری اُمیدیں پوری کریں گے۔ لیکن شروع شروع میں وہاں کی جو حالت تھی مولٰینا شبلی نے ایک خط میں اس کی تصویر یُوں کھینچی ہے:۔

"معلوم ہوا۔ کہ انگریزی خوان قوم نہایت مہمل فرقہ ہے۔ مذہب کو جانے دو۔ خیالات کی وسعت، سچی آزادی، بلند ہمتی۔ ترقی کا جوش برائے نام نہیں۔ یہاں ان چیزوں کا ذکر نہیں آتا۔ بس خالی کوٹ پتلونوں کی نمائش گاہ ہے۔ ہمارے شہر کے نوخیز لڑکے مجھے بی۔اے کی نسبت یہ خیال دلاتے تھے۔ کہ وہ مذہبی باتوں کو تمام ترضعیف ثابت کر دینگے۔ لاحول ولاقوۃ۔ وہ غریب تو زمین کی حرکت بھی نہیں سمجھ سکتے" +

نئے طبقے سے قوم کو بڑی شکایت یہ تھی۔ کہ اُنہوں نے نیوٹن یا آئن سٹائن کی قابلیت کے لوگ پیدا نہ کئے۔ پُرانے مدرسوں نے کم از کم غالب۔ حالی اور خود سرسید کو پیدا کیا تھا۔ نئی تعلیم سے یہ تو نہ ہُوا۔ لیکن لامذہبی اور الحاد اس نے پیدا کر دیا۔ مولٰینا شبلی اپنے چند رشتہ دار طلبہ کے متعلق لکھتے ہیں۔" ان عزیزوں نے ترقی و لیاقت کا طرۂ فخر صرف لامذہبی کو سمجھا ہے۔ حالانکہ لیاقت بھی دُنیا سے نرالی نہیں![1]"

مذہب سے نئے تعلیم یافتہ طبقے کی بیزاری صرف مسلمانوں ہی کو معلوم نہ تھی بلکہ اغیار بھی اُس سے واقف تھے۔ ڈاکٹر میکڈانلڈ جنہوں نے اسلامی دینیات کی نہایت دلچسپ تاریخ

---

[1] شاید یہ کہنا بے محل نہ ہوگا۔ کہ شبلی کا یہ اظہارِ خیال فقط چند طلبا کے متعلق تھا۔ ورنہ تھوڑی بہت کوشش سے علی گڑھ کے عام طلبا میں جس طرح ایک نئی مذہبی زندگی پیدا ہو سکتی تھی۔ اور گاہے گاہے پیدا ہو جاتی تھی۔ اُس کی دلچسپ مثالیں شبلی کے اپنے مکاتیب میں ملیں گی +

لکھی ہے ۔ ۱۹۱۱ء کے ایک لیکچر میں کہتے ہیں :-

"اگر سبھی علامات ہمیں دھوکا نہیں دے رہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مُسلمان ایک خوفناک مذہبی تباہی کا سامنا کرنے والے ہیں ۔ اسلام بطور ایک مذہب کے اِس لامذہبی کا مقابلہ نہیں کر رہا ۔ جو مغربی تہذیب کی وجہ سے اس میں پھیل رہی ہے ۔ نوجوان روز بروز دہریت کے ان طفلانہ اور بے اصل طریقوں کو اختیار کر رہے ہیں ۔ جیسے خود یورپ کے بہترین دماغوں نے ٹھکرا دیا ہے"۔

اقبالؔ زمانے کی ضروریات سے غافل نہ تھا ۔ وہ دیکھ رہا تھا ۔ کہ ؎

مُسلم از سرِ نبی بیگانہ شُد ۔ باز این بیت الحرم بُت خانہ شُد

شیخِ ما از برہمن کافر تر است ۔ زانکہ اُو را سومنات اندر سر است

رختِ ہستی از عرب برچیدۂ ۔ در خمستانِ عجم خوابیدۂ

اِس کے علاوہ جب وہ مستقبل کی طرف دیکھتا تو اَور بھی مایوس ہو جاتا ؎

نوجواناں تشنہ لب خالی ایاغ ۔ شُستہ رو، تاریک جاں، روشن دماغ

کم نگاہ و بے یقین و نا اُمید ۔ چشمِ شاں اندر جہاں چیزے ندید

ناکساں مُنکر ز خود مومن بغیر ۔ خشت بند از خاکِ شاں معمارِ دیر!

اقبالؔ کو خدا نے چشمِ بصیرت دی تھی ۔ وہ مُلاّ نہ تھا ۔ اور اُس کی آزاد خیالی اور ذہنی جرأت سے مذہب کے کئی ترجمان متنفر تھے ۔ لیکن وہ سمجھتا تھا کہ نئے طبقے کا الحاد اور مذہب سے تغافل قوم کے لئے نیک فال نہیں ۔ وہ اس حقیقت سے باخبر تھا کہ کیرکٹر کی پختگی اور کسی اہم عملی کوشش کی تکمیل کے لئے قوم کو ایمانِ کامل کی بڑی ضرورت ہے ۔ تشکک اور مادیت سے نہ تو کوئی بڑا کام ہاتھ میں لینے کی ہمت پڑتی ہے اور نہ مشکلات میں دل کو وہ تقویت ملتی ہے ۔ جو مشکل کاموں کی تکمیل کے لئے ضروری ہے ۔ اقبالؔ جانتا تھا ۔ کہ اگر نیا طبقہ مادیت اور دہریت کی چمکیلی ریت کا فریفتہ ہوگیا ۔ اور نوجوانوں کے دل و دماغ

اُس روحانی اور اخلاقی قوت سے خالی ہو گئے جو چیونٹی کو سلیمانؑ اور ابراہیمؑ کو آتشِ نمرود کا مقابلہ کرنے کی طاقت دیتی ہے۔ تو قوم کا مستقبل تاریک ہے۔ اقبالؔ نے مشرق و مغرب کی بہترین درسگاہوں میں تعلیم پائی تھی۔ اور اس کے مغربی اساتذہ جن میں نکلسن۔ آرنلڈ اور میک ٹیگرٹ جیسی شہرہ آفاق ہستیاں ہیں' اُس کی قابلیت۔ فلسفیانہ تعمق اور راست بینی کے گرویدہ تھے۔ مغربی تعلیم اُس سے بڑھ کر شاید ہی کسی نے حاصل کی ہو گی۔ لیکن یہ مغربی فلسفے کی گہری واقفیت ہی تھی۔ جس نے اُسے اُس سراب سے بچالیا۔ جس پر تھوڑی مغربی تعلیم والے فریفتہ ہو جاتے ہیں۔ اقبالؔ "نیم حکیم خطرۂ جاں" اور نیم فلسفی خطرۂ عقل نہ تھا۔ اُس نے انگلستان اور جرمنی کی بہترین درسگاہوں یعنی کیمبرج اور میونک میں کئی سال گذارے تھے۔ برسوں مشرق و مغرب کی تاریخ اور اُن اصولوں کا مطالعہ کیا تھا جن سے قومیں بنتی اور بگڑتی ہیں۔ وہ دیکھ رہا تھا۔ کہ نئے طبقے کا الحاد قوم کو ہلاکت کی طرف لے جا رہا ہے۔ اور قوم کے درد نے جو خدا نے اُس کے دل میں ودیعت کیا تھا۔ اس کو اجازت نہ دی کہ وہ اس مہلک رَو کا مقابلہ کرنے سے باز رہے۔ چنانچہ اقبالؔ نے اپنی ساری قابلیت اور شعر گوئی کی خدا داد طاقت اس اہم قومی خدمت کے لئے وقف کر دی۔ وہ جانتا تھا۔ کہ اس رَو کا مقابلہ حجروں اور خانقاہوں میں بیٹھ رہنے سے اور مغربی تعلیم حاصل نہ کرنے سے نہیں ہو سکتا۔ اس کا واحد علاج یہی ہے۔ کہ ترقی اور اصلاح کے اصولوں کو بے نقاب کیا جائے جو اسلامی تعلیمات کی جان ہیں۔ نیا طبقہ گمراہ سہی۔ لیکن گمراہی سے روکنے کا یہ طریقہ ٹھیک نہیں۔ کہ اُن سے کہا جائے کہ اپنے پاؤں میں زنجیریں ڈال کر بیٹھ جائیں۔ بلکہ کج روی سے روکنے کے لئے انہیں راہِ راست دکھانا چاہئے۔ اور وہ اصول بتانے چاہئیں۔ جن کی پیروی سے وہ فلاحِ دارین حاصل کر سکیں۔ یہ اصول اقبالؔ کو قرآن مجید سے ملے۔

اقبالؔ "رموزِ بے خودی" میں لکھتا ہے۔ کہ جب مسلمان کا جسم ضعف اور بیماری سے

تقریباً بے جان ہوگیا تو مَیں نے اُس کا علاج یہ کیا۔ کہ اُسے سرورِ کائنات رسُولِ اکرمؐ کے حضور میں لے آیا ؎

نعشش از پیشِ طبیباں بُردہ ام | در حضورِ مُصطفےٰ آوردہ ام
مُردہ بود از آبِ حیواں گفتمش | سِرّے از اسرارِ قرآں گفتمش
داستانے گفتم از یارانِ نجد | نکہتے آوردم از بُستانِ نجد
محفل از شمعِ نوا افروختم | قوم را رمزِ حیات آموختم!

اسلامی ہندوستان کی روحانی تاریخ کا مطالعہ کرنے والے جانتے ہیں کہ ہندوستان میں جدید علمِ کلام کا آغاز ایک لحاظ سے شاہ ولی اللہؒ کے زمانے سے ہُوا۔ اُنہوں نے ہندوستان کی حاضر ضروریات کے لحاظ سے اسلامی مسائل میں اصولی تبدیلیاں کیں۔ عام علما کی رائے کے خلاف کلام مجید کا ترجمہ نہ صرف جائز قرار دیا۔ بلکہ کر کے دکھا دیا۔ اِسی طرح علمِ تفسیر کے بعض اہم مسائل مثلاً نسخ یا عالمِ الامثال کے متعلق وہ اصول اختیار کئے جو گذشتہ علما کی نسبت نئے تعلیم یافتہ طبقے کے خیالات سے قریب تر ہیں۔ لیکن ظاہر ہے۔ کہ انہیں اس سیلاب کا مقابلہ کرنا نہیں پڑا جو جدید تعلیم۔ مغربی علوم و فنون۔ مشنریوں کے اعتراضات اور نئے سیاسی حالات کی وجہ سے اُنیسوی صدی میں ہندوستانی مسلمانوں کی مذہبی زندگی میں آیا اور جس کا مقابلہ سرسید۔ مولوی چراغ علی اور سید امیر علی کو کرنا پڑا۔ عام طور پر جدید علم الکلام کے تین اہم ترین نمائندے یہی بزرگ سمجھے جاتے ہیں۔ اقبال بھی ایک لحاظ سے اسی گروہ میں سے گِنا جاسکتا ہے۔ لیکن اسلام کی جو ترجمانی اُس نے کی ہے اس میں اور عام معتزلہ طریقے میں کئی ایسے اصولی اور بنیادی اختلاف ہیں۔ جن کا تفصیلی ذکر ہندوستان میں علم الکلام کی ترقی اور مذہبی نشو و نما سمجھنے کے لئے ضروری ہے +

سرسید۔ مولوی چراغ علی اور سید امیر علی کے پیشِ نظر سب سے اہم کام یہ تھا کہ

اسلام پر جو اعتراضات ہوتے ہیں۔ اُن کا جواب دیا جائے اور اسلام کی ترجمانی اس انداز سے کی جائے کہ اُس پر یہ اعتراضات وارد نہ ہو سکیں۔ چنانچہ اس مقصد کے لئے اُنہوں نے اکثر انہی مباحث پر زیادہ زور دیا۔ جن پر زیادہ اعتراضات ہوتے تھے۔ مثلاً مسئلۂ طلاق۔ تعدادِ ازدواج۔ غُلامی۔ مُعجزات۔ جہاد وغیرہ۔ اُنہوں نے اِن مباحث پر مفصل کتابیں لکھیں۔ سر سید نے اپنی تفسیر میں اور سید امیر علی نے "سپرٹ آف اسلام" میں تفصیلی طور پر اُن سے بحث کی۔ اور خیال ظاہر کیا۔ کہ ان مسائل پر اسلام کے اصول بھی وہی ہیں۔ جو مغربی حکما کے ہیں۔ جیسا کہ "اسرارِ خودی" و "رموزِ بے خودی" کے مطالعہ سے ظاہر ہے۔ اقبال نے نہ تو اِن مسائل کو اتنی اہمیت دی ہے۔ اور نہ ان کی توضیح میں عام اسلامی نقطۂ نظر سے انحراف کرنے کی ضرورت سمجھی ہے۔ اِس اختلاف کی وجہ اقبال اور نومعتزلہ علما کے مقاصد کا اختلاف ہے۔ نئے متکلمین کا اصل مقصد مغربی اعتراضات کا جواب دینا تھا۔ اس کے برعکس اقبال کا اصل مقصد اُن اہم اصولوں کو پیشِ نظر لانا ہے۔ جن کی پیروی سے مسلمان اپنی کھوئی ہُوئی دولت یعنی دینی اور دنیوی سربلندی حاصل کر سکتے ہیں۔ غالباً یہ صحیح ہے کہ اقبال کو اس ضروری کام میں توجہ دینے کی فرصت بہت کچھ اس وجہ سے ملی کہ مشنریوں اور مغربی علما کے اعتراضوں کو جدید متکلمین اور عام مناظرین کی مدافعت اور احمدیہ مبلغوں کے جوابی حملوں نے کُند کر دیا تھا۔ اور اب اس بات کا ڈر بہت کم تھا۔ کہ اُن کی وجہ سے مسلمان مُرتد ہو جائیں گے یا دوسری قومیں ہمیں بنظرِ حقارت دیکھیں گی۔ ایک حکومت کا پہلا فرض بیرونی حملوں کو روکنا ہے۔ اور دوسرا مُلک کی داخلی اصلاح اور نشو و نما۔ یہی حال ایک قوم کے مذہبی اور روحانی نظام کا ہے۔ اسلام پر باہر سے جو حملے اور اعتراض ہوتے تھے۔ اُن کی مدافعت کا خاطر خواہ انتظام۔ سر سید۔ سید امیر علی۔ مولٰینا محمد قاسم نانوتوی اور دوسرے بزرگوں نے کر دیا تھا۔ اور اقبال کو اِس امر کی فرصت ملی کہ وہ مذہب کے داخلی استحکام اور اصلاح پر متوجہ ہو۔ اس کے علاوہ شاید یہ بھی صحیح ہے کہ اقبال میں

فلسفیانہ تعمق اور ظاہری اور غیر ضروری باتوں کو چھوڑ کر بات کی تہ کو پہنچ جانے کی قابلیت
ان بزرگوں سے زیادہ تھی۔ اُس نے بہت جلد اس حقیقت کو پالیا کہ جن مسائل پر اتنا
زورِ قلم اور زورِ بیان صرف ہو رہا ہے۔ وہ نہ تو اسلام کے اصولی ارکان میں سے ہیں
اور نہ اُن کے متعلق نومعتزلہ نقطۂ نظر اختیار کرنے سے قوم کی رُوحانی اور اخلاقی حالت میں
کوئی انقلاب پیدا ہو جائے گا۔ آخر ہندوستان میں کتنے مسلمانوں کی ایک سے زیادہ
بیویاں ہیں اور کتنے مسلمانوں نے لونڈیاں اور غلام رکھے ہُوئے ہیں۔ یا قرآن میں کتنے
خرقِ عادت واقعات اور معجزات رسُول اکرمؐ سے منسوب کئے گئے ہیں۔ کہ ان مسائل
کی بحث و توضیح پر موٹی موٹی کتابیں لکھی جائیں۔ اور ان اصولوں کی اشاعت پر توجہ
ہی نہ ہو جو اسلام کی جان ہیں۔ اور جنہیں اچھی طرح اختیار کرنے سے قوم پھر بامِ ترقی پر
پہنچ سکتی ہے!

جدید متکلمین نے کئی لحاظ سے اسلام کی بڑی خدمت کی ہے۔ لیکن یہ صحیح ہے
کہ معترضین کے اعتراضات سے متاثر ہو کر اُنھوں نے زیادہ توجہ نسبتاً فروعی اور
غیر ضروری مسائل پر صرف کی ہے۔ زندگی کے اہم اصولوں کا خیال نہیں کیا۔ اقبالؔ
اس معاملے میں اُن سے بالکل الگ ہے۔ اُس نے فروعی مسائل پر بہت کم توجہ دی
ہے۔ اور اپنی ساری قابلیت اسلام کے اہم بنیادی اصولوں کے بے نقاب کرنے پر
صرف کی ہے۔ جن سے نہ پُرانے علما کو اختلاف ہے۔ نہ نومعتزلہ طبقے کو۔ لیکن جو
مذہب کے ظاہر پرست ترجمانوں کے ہاتھ میں مہمل اور بے جان ہو رہے تھے۔ یعنی توحید۔
رسالت اور تعلیماتِ قرآنی! اقبالؔ نے نومعتزلہ خیالات کو بالکل نظر انداز نہیں کیا۔ لیکن
اُس کا خیال ہے۔ کہ ایک تو اُنھوں نے نشو و نما کے اصولوں سے زیادہ قطع و بُرید پر
زور دیا ہے۔ دوسرے شوقِ اصلاح میں کئی جگہ اُنھوں نے جلد بازی سے کام لیا ہے۔
اور کئی باتیں جو مفید تھیں ترک کر دی ہیں۔ اور کئی ایسی باتیں جنہیں جدید متکلمین ترک

کر چکے ہیں ۔زیادہ غور و تعمق اور تجربے کے بعد اسلام کو پھر سے اخذ کرنی پڑیں گی ۔معجزات کے متعلق ہم نے علامہ اقبالؔ کو یہ کہتے سُنا ہے کہ قرآن نے انبیائے سلف کے معجزات کی تردید نہیں کی بلکہ تصدیق کی ہے ۔لیکن کئی آیات قرآنی ہیں جن سے معجزہ کو دلیلِ نبوت سمجھنے کے خیال کی تردید ہوتی ہے ۔ اور رسولِ اکرمؐ کے بہت کم معجزات کا صراحتاً ذکر ہے ۔علامہ اقبالؔ کا خیال ہے کہ معجزات کے متعلق قرآنی نقطۂ نظر دوسرے تمام مذاہب کے مقابلے میں عقل سے قریب ترین ہے اور کم از کم اسلام کے لئے معجزات کا مسئلہ بنیادی مسئلہ نہیں ۔ کہ اس پر اتنی بحثیں ہوں۔ یہ بحثیں تو یہودیوں اور عیسائیوں میں ہونی چاہئیں جن کے مذاہب ہی خلافِ عادات واقعات پر مبنی ہیں اور جن کے بانیوں کی زندگیاں اُن واقعات سے بھری ہیں ۔ اس کے علاوہ اگر نیوٹن مارکونی اور آئن سٹائن مغربی سائنس کی اہم ترین شخصیتیں ہونے کے باوجود اپنے مذاہب پر قائم ہیں تو اسلام میں کیوں اس مسئلے کی تشریح پر اتنا زورِ دماغ صرف کیا جائے ۔تعدادِ ازدواج اور طلاق کے متعلق حال ہی میں مسٹر فلبیؔ نے جو ایک مشہور سیاح ہیں اور برسوں ممتاز عہدوں پر مامور رہے ہیں کہا ہے کہ "یورپین اخلاقی نظام سے جو مسیحیت پر مبنی ہے مَیں عربوں کے اخلاقی معیار کو زیادہ بلند سمجھتا ہوں ۔ اس کی وجہ ایک تو اسلامی مساوات ہے اور دوسرے روزمرہ کی زندگی مثلاً بیاہ شادی اور طلاق وغیرہ کا قانون" (مُسلم ورلڈ)

حقیقت یہ ہے کہ ان مسائل پر جو قرآنی ارشادات ہیں اگر انہیں دیانتداری اور ایمانداری سے سمجھا جائے (یعنی نہ بعض بوالہوس لوگوں کی طرح نفس رانی کے حیلے ڈھونڈنے کے لئے اور نہ جدید متکلمین کی طرح اُن مسائل کے متعلق مسیحی قانون اخذ کرنے کے لئے) تو ان میں کسی اصلاح اور ترمیم کی ضرورت نہیں معلوم ہوتی ۔ شادی کے متعلق بالآخر یُورپ کو وہی طریقہ اختیار کرنا پڑے گا ۔ جو اسلام کا ہے ۔ یعنی شادی ایک ذاتی معاہدہ ہے ۔ مذہبی فرض نہیں ۔ یہ مسیحی عقیدہ کہ طلاق فقط زنا کی صورت میں جائز ہے ۔ اکثر یورپین ممالک نے ترک کر دیا ہے ۔ جہاں تک تعدادِ ازدواج کا تعلق ہے ۔ ہندو شاستروں میں قرآن کے مقابلے

ہیں بہت آزادی ہے۔ بیویوں کی تعداد پر کوئی روک ٹوک نہیں۔ قرآن نے تو اس پر طرح طرح کی پابندیاں لگائی ہیں۔ اور اگر فقہا شرع کی صحیح ترجمانی کرتے ہوئے نفس پرستوں کو حیلے ڈھونڈنے کا موقعہ نہ دیں اور قرآنی احکام کی ٹھیک ٹھیک پابندی کریں۔ تو ہماری خانگی اور اجتماعی زندگی میں کوئی الجھن نہ ہو۔ اور نہ کسی کو اس پر اعتراض کرنے کا موقع ملے۔ لیکن ظاہر ہے کہ یہ باتیں تو شرع کی مناسب ترویج کے متعلق ہیں۔ جہاں تک ان مسائل پر اسلامی اور قرآنی احکام کا تعلق ہے وہ دوسرے مذاہب سے کہیں بہتر ہیں۔ جہاد کے متعلق اقبالؔ کے کئی اشعار سے خیال ہوتا ہے کہ وہ جدید متکلمین کی رائے کا مخالف ہے۔ "اسرارِ خودی" میں اس نے یہ بات واضح کی ہے کہ توسیع مملکت اور ہوسِ ملک گیری کے لئے جہاد حرام ہے۔ لیکن اس کے سوا بالعموم اس کا نقطۂ نظر پرانے فقہا سے ملتا ہے اور کئی اشعار میں اس نے جدید متکلمین کے خیالات پر اعتراض کیا ہے ۞

فروعی مسائل پر جیسا کہ ہم لکھ چکے ہیں۔ اقبالؔ نے بہت کم توجہ کی ہے۔ یہ مسائل ایسے ہیں کہ ان پر جمہور سے اختلاف کرنے سے نہ تو آدمی کافر ہو جاتا ہے۔ اور نہ جدید متکلمین کے خیالات اختیار کرنے سے بامِ ترقی پر پہنچ جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ان مسائل کے متعلق ہر شخص اپنے اپنے خیال کے مطابق رائے رکھ سکتا ہے۔ ان مسائل پر اقبالؔ کے اپنے عقائد متکلمین کی نسبت جمہور علما سے قریب تر ہیں۔ لیکن وہ ان پر اتنا زور نہیں دیتا۔ وہ صرف ان باتوں پر زور دیتا ہے۔ جو مذہب اسلام کی جان ہیں۔ اور جنہیں پوری طرح اختیار کرنے سے مسلمان اپنی کھوئی ہوئی دینی اور دنیوی عظمت پھر حاصل کر لیں گے! ان باتوں پر صفحاتِ گذشتہ میں ہم نے بالتفصیل تبصرہ کیا ہے۔ اور توحید۔ رسالت اور احکامِ قرآنی کے متعلق اقبالؔ کا نقطۂ نظر "اسرار و رموز" اور دوسری کتابوں سے واضح کیا ہے۔ مختصراً یہ کہ اقبالؔ کے فلسفے اور اسلام کی ترجمانی کا سب سے بڑا رکن خودی کی نشو و نما ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ایک مسلمان اپنے آپ کو جس قدر زیادہ مکمل انسان بنائے گا اُسی قدر

وہ دنیا میں اسلام کی رونق کا موجب ہوگا ۔ اور دنیائے اسلام کی ترقی اسی وقت ہوگی جب اس کے سب اجزا یعنی سارے مسلمان ہر لحاظ سے اپنے آپ کو بہتر اور مکمل انسان بنا دیں گے ؎

ہو صداقت کے لئے جس دل میں مرنے کی تڑپ

پہلے اپنے پیکرِ خاکی میں جاں پیدا کرے

خودی کی یہ نشو و نما کیسے ہو سکتی ہے؟ اس کے لئے مسلمانوں کو اسلام کے بنیادی اُصولوں کو محکم پکڑنا چاہئے ۔ (۱) سب سے زیادہ زور اقبالؔ نے توحید پر دیا ہے ۔ لیکن محض "اقرار باللسّان و تصدیق بالقلب" پر نہیں بلکہ اُس توحید پر جو قول اور خیالات سے گذر کر کردار کو متاثر کرتی ہے ۔ جو مومن کو بیم و رجا سے 'علائقِ دُنیا کی کشش سے اور خوف و مایوسی سے آزاد کر کے اخلاقی اور رُوحانی عظمت پر پہنچا دیتی ہے ۔ (۲) دوسری اہم ضرورت رسولِ اکرمؐ کی صحیح اور مکمل تقلید ہے (۳) تیسرا اہم کام قرآن کا مطالعہ اور تعلیماتِ قرآن کی پیروی ہے ۔ مومن کے لئے ضروری ہے کہ وہ ان تمام احکام کی پُوری پُوری پیروی کرے جو قرآن نے مسلمانوں پر فرض قرار دئے ہیں ۔ مثلاً نماز، حج، زکواۃ، روزہ ۔ اور جن سے حفظِ خودی اور روحانی اور اخلاقی ڈسپلن میں مدد ملتی ہے ۔ اس کے ساتھ ساتھ مومن کے لئے ضروری ہے کہ وہ سرگرمِ عمل رہے ۔ قرآن نے عمل کو خیال پر بہت واضح اہمیت دی ہے ۔ اور درست اعتقادات اور عبادت کے ساتھ ساتھ نیک اعمال کی ضرورت بھی پوری طرح واضح کر دی ہے ۔ جب مسلمان قرآن کو سمجھ کر پڑھیں گے اور اس کے ارشادات پر عمل کریں گے ۔ اس وقت وہ پھر دینی اور دنیاوی خوبیوں سے بہرہ ور ہونگے ۔ اور خلیفۂ الٰہی کے ممتاز لقب سے سرفراز ہونے کے مستحق ہو جائیں گے ۔

یہ ہے اقبالؔ کی تعلیمات کا خلاصہ ! ان کے متعلق دو امور قابلِ ذکر ہیں ۔ ایک تو یہ کہ ان میں روحانی اور اخلاقی ترقی اور دینی و دُنیاوی فلاح کی وہ باتیں ہیں جن پر زمانۂ حال میں ان کی اہمیت کے مطابق کسی نے زور نہ دیا تھا ۔ دوسری خصوصیت ان تعلیمات کی یہ ہے کہ ان میں کوئی بات ایسی نہیں جس سے جمہور علما اختلاف کر سکیں ! حقیقت یہ ہے کہ اگرچہ اقبالؔ کو مغربی علوم اور فلسفہ

سے سرسید، مولوی چراغ علی اور شاید سید امیر علی سے بھی زیادہ واقفیت ہے۔ لیکن اسلام کے روحانی امراض کے لئے اُس نے جو نسخہ تجویز کیا ہے۔ وہ بھی جمہور علما کے خیالات کے عین مطابق ہے۔ "اسرار و رموز" کا کوئی شعر ایسا نہیں جسے شاہ ولی اللہؒ یا شاہ اسمٰعیل شہیدؒ نہ لکھ سکتے ہوں۔ اور غالباً یہ کہنا صحیح ہے کہ اگرچہ اقبالؔ کی تعلیم مغربی ہے۔ لیکن روحانی طور پر وہ حضرت مجدد الفِ ثانیؒ اور شاہ ولی اللہ کا جانشین ہے ؎

جوہر میں ہو لاالٰہ تو کیا خوف
تعلیم ہو گو فرنگیانہ!

"رموزِ بے خودی" کی تعریف میں تو علما اور مشائخ متفق ہیں۔ لیکن "اسرارِ بے خودی" کے چند مضامین پر بعض صوفیہ نے اعتراض کیا تھا کہ اقبالؔ نفیٔ خودی اور ترکِ دُنیا کی مذمت کرتا ہے اور اس کے خیالات مغربی فلسفہ کا اثر ہیں۔ اقبالؔ نے اس کا فیصلہ خدا اور خدا کے رسول پر چھوڑا ہے۔ اس نے ایک نظم میں جس میں نعت کے نہایت پاکیزہ شعر ہیں۔ رسولِ اکرمؐ سے خطاب کیا ہے ؎

اے ظہورِ تو شبابِ زندگی	جلوہ ات تعبیرِ خوابِ زندگی
از تو بالا پایۂ ایں کائنات	فقرِ تو سرمایۂ ایں کائنات
در جہاں شمعِ حیات افروختی	بندگاں را خواجگی آموختی

اور عرض کیا ہے کہ اے سرورِ کائنات اگر مَیں نے قرآن کے سوا کسی اور چیز کی تعلیم دی ہے تو مجھے دنیا سے اُٹھا لے اور دونوں جہانوں کی رسوائیاں میرے نصیب کر ؎

گر دلم آئینۂ بے جوہر است	ور بحرفم غیرِ قرآں مضمر است
پردۂ ناموسِ فکرم چاک کُن	ایں خیاباں را ز خارم پاک کُن
تنگ کُن رختِ حیات اندر برم	اہلِ ملّت را نگہدار از شرم
روزِ محشر خوار و رسوا کن مرا	بے نصیب از بوسۂ پا کن مرا

اقبال نے تو صوفیہ کے اعتراض کا فیصلہ خدا اور خدا کے رسول پر چھوڑا ہے اور آخری فیصلہ انہیں کا ہوگا۔ لیکن قرآن اور حدیث میں ان مسائل کے متعلق کافی ارشادات موجود ہیں۔ جن سے ہم معترضین کی غلطی دیکھ سکتے ہیں۔ ہندوستان میں کچھ تو تاریخی اثرات سے اور کچھ فارسی شاعری کے رواج سے تصوّف ہمارے مذہب اور ہماری ذہنی زندگی کا جزو بن گیا ہے۔ لیکن آج خوش قسمتی سے ہماری رسائی علامہ ابن تیمیہؒ اور شیخ محمد بن عبدالوہابؒ کی کتابوں تک ہوگئی ہے اور ہم دیکھ سکتے ہیں کہ کئی باتوں میں صوفیانہ نقطۂ نظر اسلامی نقطۂ نظر سے بہت بعید ہے۔ ان بزرگوں کی نظر بیشتر صوفیانہ بدعتوں اور خلافِ شرع اور خلافِ عقل رسموں پر گئی ہے۔ اقبال ایک فلسفی ہے۔ اُس نے صوفیانہ نظامِ اخلاق پر حملہ کیا ہے جو اتفاقی حوادث سے ہمارے مروجہ نظامِ اخلاق کا جزو بن گیا ہے۔ اور بتایا ہے کہ یہ نظامِ اخلاق اصل اسلامی نظامِ اخلاق کی ضد ہے۔ تصوّف کی مخالفت میں اقبال علامہ ابن تیمیہؒ اور شیخ محمد بن عبدالوہاب جیسے بزرگوں کے ہمرکاب ہے۔ اس کے علاوہ قرآن سُنّت اور حدیث سے اقبال کے نقطۂ نظر کی تائید ہوتی ہے۔ ہم بتا چکے ہیں کہ رسولِ اکرمؐ نے "نفیٔ خودی" اور "ترکِ دُنیا" کی تلقین کبھی نہیں کی۔ اور نہ کبھی راہبانہ زندگی اختیار کی۔ صرف یہی نہیں بلکہ رہبانیت اور مذمتِ دُنیا کی صراحتاً ممانعت کردی "لاتسبوا الدھر" اور "لا رہبانیۃ فی الاسلام" دو نہایت واضح ارشاد ہیں۔ اس کے علاوہ رسولِ اکرمؐ نے عیسائی اور بُدھ مذہب کی طرح کمزوری اور عاجزی کو بڑی خوبی نہیں کہا۔ بلکہ قوت اور دنیاوی طاقت کی بالوضاحت تعریف کی ہے۔ صحیح مسلم کی ایک حدیث ہے۔ "خدا کے نزدیک طاقت ور مسلمان کمزور مسلمان سے زیادہ بہتر اور محبوب ہے۔ جو چیز تمہارے لئے نفع بخش ہو اس کی حرص کرو۔ خدا سے مدد مانگو۔ اور عاجز نہ بنو" (ترجمہ[1]) تصوّف کا نظامِ اخلاق جو رہبانیت، ترکِ دنیا، کمزوری اور عجز کی تعلیم دیتا ہے۔

---

[1] صحیح مُسلم (کتاب القدر۔ باب فی الدّہر بالقوت و ترک العجز)

اسلام سے جس قدر بعید ہے اس کا اندازہ رسولِ اکرمؐ اور صحابہؓ کرام کی اپنی زندگی اور مندرجہ بالا حدیثوں سے ہو سکتا ہے۔ لیکن صرف اقبال ہی نے ان راہبانہ تعلیمات کی مضرت محسوس نہیں کی بلکہ دوسرے صاحبِ فکر بزرگوں نے بھی اس کے مضر اثرات کی طرف توجہ دلائی ہے۔ شاہ ولی اللہؒ کے خیالات تو مغربی فلسفہ کے نتیجہ نہیں کہے جا سکتے۔ اُنہوں نے بھی اپنے وصیت نامہ میں نفیٔ خودی و استہلاک کی مذمت کی اور اسے اُمتِ مُصطفوی کے لئے ایک بیماری کہا۔ آپ کا یہ ارشاد کتاب کے پہلے حصّے میں نقل کیا جا چکا ہے کہ "بالجملہ افراط در مقدماتِ انسلاج و استہلاک و مشغول شدن ہر کس و ناکس باں داءِ عضال (مرضِ شدید) است در ملتِ مُصطفویہ۔ خدا رحمت کند کسے را کہ سعی در اخمالِ آنہا کند"۔

شریعت اور تصوّف کے اختلافات بہت پُرانے ہیں۔ اور اگر صوفیہ نے علومِ اسلامی کی صحیح ترجمانی کی وجہ سے اقبال پر کوئی اعتراض کیا ہے تو ہمیں اس پر حیرانی نہیں ہونی چاہیئے۔ اقبال کی فارسی مثنویوں کے متعلق علما نے جو رائے قائم کی ہے اس کا اندازہ اس امر سے بھی ہو سکتا ہے کہ مولینا ابوالکلام آزاد کے ایک بڑے مداح مولینا کی مشہور کتاب "تذکرہ" کے دیباچے میں لکھتے ہیں۔ "اسرارِ خُودی" و "رموزِ بیخُودی" فی الحقیقت الہلال ہی کی صدائے بازگشت ہیں"۔ یہ خیال کہ اقبال کی مذہبی زندگی میں الہلال نے ایک انقلاب پیدا کیا صحیح ہو یا غلط۔ لیکن ظاہر ہے کہ جن کتابوں کو اس مذہبی عالم کی تحریروں کا اثر بتایا جا سکتا ہے جس نے اسی کتاب "تذکرہ" میں جدید علمِ کلام اور مغربی خیالات پر ایک زوردار حملہ کیا ہے وہ یقیناً جدید علمِ کلام کا نتیجہ نہیں ہو سکتیں۔ بلکہ اس کے مخالف علما کے خیالات کا آئینہ ہونگیں۔ ہاتھ کنگن کو آرسی کیا۔ اقبال کی مذہبی تعلیمات کا ماحصل ہم گذشتہ صفحات میں کسی قدر تفصیل سے دے چکے ہیں۔ اُن سے دیکھا جا سکتا ہے کہ اقبال کے خیالات جمہور علما کے خیالات سے کس قدر قریب ہیں۔ حقیقتاً یہی وجہ ہے کہ اقبال کو مولینا انور شاہ محدّثؒ اور دوسرے دیدہ ور قدیم علما کا احترام اور اعتماد حاصل تھا۔

ترکی میں مغربی لباس اور وضع قطع اختیار کرنے کے متعلق اقبالؔ علما کا ہم خیال ہے۔ اور اس مسئلے میں اس نے نہایت قابلیت سے علماء کی ترجمانی کی ہے۔ گذشتہ سالوں میں قادیانیوں کے متعلق جو ہلچل ہُوئی تھی اس میں بھی اس نے دیوبند اور ڈابھیل کا ساتھ دیا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ اہم اسلامی اصولوں میں اقبالؔ جمہور علما کا اِس طرح ہم خیال ہے کہ غالباً وہ وقت دُور نہیں جب "رموزِ بےخودی" یا اس کے اقتباسات دیوبند۔ جامعہ ملیہ اور ڈابھیل میں پڑھائے جائیں۔ اور شائد یہ کہنا بھی بےجا نہیں کہ جس طرح غزالیؒ نے اپنی چشمِ بصیرت سے اسلام کے اصولوں کی ترجمانی اس طرح کی تھی کہ معتزلہ اور اشعریہ کی کشمکش مٹ گئی۔ اسی طرح اقبالؔ نے بھی بنیادی اُصولوں پر زور دے کر اور جزوی اور غیرضروری مسائل میں سلامت روی کا راستہ دکھا کر ایک ایسا طریقہ بتا دیا ہے جس پر قدیم اور جدید طبقوں کے بہترین دماغ متفق ہیں۔ اور اس پر ہمیں حیرانی نہیں ہونی چاہیئے ؎

زمانہ ایک، حیات ایک، کائنات بھی ایک
دلیلِ کم نظری قصۂ جدید و قدیم!

تمام شُد